پیغمبرِ صحرا صلی اللہ علیہ وسلم

کے ایل گابا

ترجمہ: پروفیسر احمد الدّین مارہروی

کے ایل گابا

ترجمہ

پروفیسر احمد الدین مارہروی

الفیصل ناشران و تاجران کتب
اردو بازار لاہور

جولائی 2002ء
محمد فیصل نے
تعریف پرنٹرز سے چھپوا کر شائع کی،
قیمت =/120 روپے

فہرست

تمہید

تمنا مختصر ہے اور تمہید طولانی!

قصہ صرف اتنا ہے کہ جب سے ہمارے اوّلین والدین (آدم وحوا) کو اللہ تعالیٰ نے باغ عدن سے نکال کر زمین کی خاک چھاننے کو بھیجا ہے، اُس وقت سے اب تک ابنائے آدم کو نیکی اور بھلائی کے راستے پر چلنے کے لیے قدم قدم پر ہدایت و رہنمائی کی ضرورت رہی ہے۔ یہ ہدایت و رہنمائی ملتی ہے انبیائے کرام سے، جو وقتاً فوقتاً اللہ تعالیٰ کی جانب سے تشریف لاتے رہے ہیں۔ انبیائے کرام کے درمیان مقصد یا حصول مقصد کے ضمن میں تھوڑا بہت فرق و اختلاف رہا ہے، لیکن اُن سب کے درمیان ایک قدر مشترک رہی ہے، اور وہ یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اپنی "قربت خاص" کا دعویٰ کرتے رہے ہیں۔ کسی نے کہا کہ میں "اللہ کا واحد بیٹا" ہوں اور آخرت میں گناہ گاروں کی شفاعت ہو گی تو صرف میری سفارش پر ہو گی۔ کسی نے کہا، میں اللہ کا مقرب خاص ہوں اور جو میرے مشن سے اتفاق رکھتے ہیں، اُن کے لیے سفارش کر سکتا ہوں۔ کسی نے اللہ کا ہم جلیس ہونے کا اور بندوں کی آخرت سنوارنے کا وعدہ کیا۔ چند اوتار ایسے بھی گزرے ہیں جو بندوں کی تقدیر کا فیصلہ یہیں اسی دنیا میں، موقع واردات پر کر دیتے ہیں۔

اللہ کے اِن برگزیدہ انبیائے کرام اور محترم و مکرم ہستیوں میں ایک ایسا عجیب و غریب شخص بھی ہو گزرا ہے، جس کے دعوے بھی عجیب، اور وعدے بھی عجیب۔ اُس نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا مقرب خاص، ہم جلیس و ہمدم ہے۔ اُس نے کبھی یہ وعدہ نہیں کیا کہ آخرت میں اپنی سفارش سے تمہاری شفاعت کرا دوں گا اور تمہارے گناہوں اور بد اعمالیوں کا کفارہ میں ادا کروں گا۔ یہ عجیب و غریب شخص "پیغمبر صحرا" تھا، عرب کا محمدؐ۔

حضرت محمد ﷺ سے پہلے جتنے بھی انبیائے کرام اور رسول گزرے ہیں، اُن میں

سے کسی کی بھی سوانح لکھنا ممکن نہیں۔ میں پھر کہتا ہوں کہ "ممکن ہی نہیں"۔ پہلا مسئلہ جس سے سوانح نگار کو دوچار ہونا پڑے گا' یہ ہے کہ یہی پتا نہیں چلتا کہ بحیثیت انسان وہ کیسا تھا۔ انسانی رویوں میں اُس کا کیا درجہ تھا۔ اس سے بھی زیادہ سنگین مسئلہ یہ ہے کہ اُن کی ولادت و وفات ہی کا ٹھیک ٹھیک علم نہیں کہ وہ کس زمانے میں ہوئے تھے۔ مؤرخین کے نزدیک بعض پیغمبروں کے زمانے میں ایک ایک ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار سال کا فرق ہے۔ صحیح تاریخی ریکارڈ نہ ہونے کی وجہ سے حقیقت من گھڑت روایات' تخیلات اور افسانہ طرازیوں میں دب کر روپوش ہو گئی ہے۔ اور تو اور' خود حضرت عیسیٰؑ' جو پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد ﷺ سے ذرا پہلے کے پیغمبر ہیں' اُن کی زندگی کے بھی صرف چار برسوں کے حالات دستیاب ہیں۔ اُن کی باقی زندگی پر گمنامی یا روحانیت کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔

حضرت محمد ﷺ کے سوانح نگار کو اور بھی زیادہ مشکل سے گزرنا پڑتا ہے۔ دوسرے نبیوں کے سوانح نگار کے پاس مواد کی کمی ہے اور جتنا بھی مواد دستیاب ہے' وہ معتبر و مستند نہیں۔ حضرت محمد ﷺ کی حیات طیبہ کا پورا پورا ریکارڈ محفوظ۔ تاریخی مواد بکثرت فراہم' جس کے معتبر و مستند ہونے میں شک و شبے کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ بلکہ صورتحال یہ ہے کہ دستیاب مواد سے ذرا بھی انحراف کیا جائے تو شک و شبے اور منطقی مباحث کے دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں قیاس آرائی اور تخیل آفرینی کی گنجائش نہیں۔ قیاسات کے گھوڑے پہلی منزل ہی پر ہانپنے لگتے ہیں۔ اگر کہانی میں کہیں کوئی چھوٹا موٹا خلا نظر بھی آتا ہے' تو اُسے قیاس و تخیل سے نہیں' بلکہ تحقیق و تجسس سے پُر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

حضرت محمد ﷺ کے سوانح نگار کی اِن مشکلات کو قاری آسان کر دیتا ہے۔ حضرت محمد ﷺ کا قاری بے حد و حساب عقیدت مند ہونے کے باوجود لچھے دار انشا پردازی سے زیادہ معلومات کی صحت پر توجہ دیتا ہے۔ وہ عبارت آرائی اور مضمون آفرینی سے زیادہ حیات طیبہؐ کے گوشوں اور پہلوؤں پر اپنی توجہ مرکوز رکھتا ہے۔ حضورؐ کس زمانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اُس زمانے کے حالات اور تقاضے کیا تھے۔ انسانی زندگی کے معیار و اقدار کیا

تھے۔ حضورؐ کا مشن کیا تھا۔ اس مشن کی راہ میں کیا دشواریاں پیش آئیں۔ کیا آسانیاں فراہم ہوئیں۔ آپؐ نے اپنے مشن کی تکمیل کیونکر کی۔

رسول کریمؐ کی مطبوعہ حیات طیبہ پر ایک ستم ایسا ہوا ہے کہ اُس کا کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ ہر مصنف کی لکھی ہوئی سوانح عمریاں ایسی خوبصورت مُطلا و مُحلا میں شائع کی جاتی ہیں کہ انہیں پڑھنے کی بجائے سجا کر رکھنے کو جی چاہتا ہے۔ پہلی نظر کا یہ مشاہدہ آخری نظر کا تجربہ بن جاتا ہے' یعنی ان کو لائبریریوں کی الماریوں اور گھروں کے طاقچوں میں سجایا جاتا ہے' پڑھا نہیں جاتا۔ ان کے ظاہری حسن و جمال نے تحریر کے اندرونی حسن و جمال کو چھپا لیا۔ جب تحریر ہی کا حسن و جمال نظروں سے پوشیدہ رہے گا' تو حضورؐ کے حسن و جمال تک ہماری بصیرت کو کیونکر راہ ملے گی۔ اس کتاب میں عام کتب بین قارئین کے لیے انتہائی اختصار کے ساتھ پیغمبر صحراؐ کے حیات طیبہ کے تمام اہم حالات و خصائص بیان کیے گئے ہیں۔ ہمیں کسی قسم کی تبلیغ' دعوت و ارشاد کا دعویٰ یا حصولِ ثواب کی آرزو نہیں ہے۔ ہم نے غیر مسلم مستشرقین کے الزامات کا جواب دینے کی بھی کوشش نہیں کی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سادہ لوگوں کے لیے' سادہ آدمی کی طرف سے' سادہ سی کتاب ہے۔ میں نے اپنی طرف سے یہ کوشش کی ہے کہ قاری ہزاروں سال پہلے کے عربستان میں' اُس لق و دق صحرا اور اُس کی بدویانہ زندگی میں محمدؐ کو چلتا پھرتا' جیتا جاگتا' اسلامی انقلاب کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے' خود محسوس کرے۔ جب کتاب ختم کرے تو اُسے خود اندازہ ہو جائے کہ وہ پہلے بہت کم جانتا تھا' اب بہت کچھ جان گیا ہے۔

گزشتہ صدیوں میں اسلام اور پیغمبر اسلام کو غلط تعبیر' غلط تفسیر بلکہ بے اندازہ بہتان اور تہمت کی حشر سامانیوں سے گزرنا پڑا ہے۔ جن کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ تاریخی حقائق کو مسخ کیا جاتا ہے' مثلاً صلاح الدین ایوبی کی فتوحات کو لوٹ مار کی مہم جوئی قرار دیا جاتا ہے۔ صلیبی جنگوں کی شکست کی خفت کو مٹانے کے لیے اُن کو فتح میں بدلنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جنرل گورڈن کی موت' مغلیہ سلطنت اور مصطفےٰ کمال پاشا وغیرہ کے بارے میں بے سروپا باتیں بیان کی جاتی ہیں۔ جب تک اسلام اِس مادی دنیا میں

ایک زندہ قوت کی حیثیت سے موجود ہے' غیر مسلموں کی جانب سے یہ توقع کرنا عبث ہے کہ وہ بنی نوع انسان کے معاشرتی' معاشی اور سیاسی مسائل حل کرنے کے سلسلے میں اسلام اور پیغمبر اسلام کے کارناموں کے بارے میں کوئی کلمہ خیر بھی زبان اعتراف سے ادا کریں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عیسائیت' صیہونیت اور بدھ مت اس مادی دنیا سے اپنا اپنا مقام کھو رہے ہیں' جبکہ اسلام اب تک نہ صرف یہ کہ ایک زبردست زندہ قوت کی حیثیت سے موجود ہے' بلکہ روز بروز ترقی کی جانب گامزن ہے' جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے باقانیوں کا حسد' یہودیوں کی نفرت' ہندوؤں کا تعصب اور رُوس کی مخاصمت بھی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔

آج کی دنیا کو جن مسائل کا سامنا ہے' اُن میں سے چند بڑے اور زیادہ اہم اور سنگین مسئلے یہ ہیں: قومیت اور بین الاقوامیت' مرد و زن کا باہمی اختلاط' طلاق کی شرح میں روز افزوں اضافہ' آمریت اور جمہوریت کی کشمکش' سرمایہ اور محنت کی آویزش' بڑھتا ہوا الحاد' خالی گرجا اور بھوکے مبلغ۔ تاریخ میں یہ پہلی مرتبہ نہیں ہے کہ انسان خدا سے خفا اور بے زار ہو گیا ہے یا پوری انسانیت کو انتہائی خطرناک اور مہیب مسائل کا سامنا ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے' بلکہ قدرتی بات ہے کہ یورپ اور امریکہ میں کثیر الازدواجی' آسان طلاق' میراث کے منصفانہ اصول کی بنیاد پر تقسیم دولت کا بندوبست' مختلف قوموں اور فرقوں میں اخوت اور رواداری پیدا کرنے کی ضرورت' رنگ و نسل و طبقہ و زبان کے تعصبات و امتیازات کا خاتمہ' سود پر مبنی معاشی نظام کا زوال ...... اور دیگر ملتے جلتے مسائل پر مباحثے اور مذاکرات ہونے لگے ہیں۔ یاد رہے کہ چھٹی صدی کے اختتام اور ساتویں صدی کے آغاز میں بھی ایسے ہی مسائل ابھرے تھے اور اُن پر مباحثوں اور مذاکروں کا دور گزرا تھا۔ اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہو جائے گا کہ اُس وقت ایک سادہ مزاج' درویش منش ''شتربان'' نے کیونکر اِن مسائل و مشکلات کو حل کیا تھا۔

پس اس کتاب کے مخاطب مسلمان بھی ہیں اور غیر مسلم بھی' مومن بھی ہیں اور دہریے بھی' پادری بھی ہیں اور گناہ گار بھی' سرمایہ دار بھی ہیں اور سوشلسٹ بھی' شاہ پرست

بھی ہیں اور جمہوریت پسند بھی' پانچ وقت کا نمازی بھی اور وہ بھی جس نے آج تک کبھی نماز نہیں پڑھی۔ سجدہ گزار بھی ہیں اور وہ بھی جو سجدہ گزاری کو خواہ مخواہ کی ورزش خیال کرتے ہیں۔ اس کتاب کے پڑھنے والے کا حیات و ممات کے بارے میں نقطہ نظر کچھ بھی ہو' مرنے کے بعد وہ حور و غلماں کے ساتھ جنت کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں میں رہنے کا متمنی ہو یا دوزخ کی آگ میں جلنے کے لیے تیار ہو یا آخری خوشی حاصل کرنے کی خاطر اپنی نعش جانورون اور کیڑے مکوڑوں کے کھانے کے لیے دینا چاہتا ہو' یا شمشان میں لکڑیوں کی آگ میں بھننا چاہتا ہو یا قبرستان کی کسی اچھی سی گور میں دفن ہونے کا آرزومند ہو یا اپنے مردے کو گدھوں اور چیلوں سے نچوانا چاہتا ہو' غرض موت اور حیات بعد الموت کے بارے میں اُس کا کوئی بھی عقیدہ یا تصور ہو۔ اُن کے لیے اس کتاب کے اوراق میں ایک سادہ' عام سے آدمی کے ایسے حیرت انگیز حالات و کوائف ہیں' جس نے دُکھ میں سکھ' غم میں خوشی کے اسباب ڈھونڈ لیے اور آئندہ آنے والی نسلوں کو بھی ایسے اسباب ڈھونڈنے کی راہ دکھا دی۔

کے ایل گابا

پہلا باب

"شتربان"

قرمزی آفتاب' ریت کے میدانوں سے درے سمندر میں غوطہ لگاتا نظر آرہا ہے۔ اس کی ہلکی شعاعوں نے آسمان کو ایک سنہری چادر سے ڈھانپ رکھا ہے اور پہاڑیاں گنگا جمنی رنگوں سے مزین نظر آرہی ہیں۔

ایک پرشکوہ قافلہ اس پہاڑی سڑک کے بالائی حصہ سے آتا ہوا نظر آرہا ہے جو یثرب سے وادی مکہ کی طرف آتی ہے۔ ایک ہی نظر میں اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ کوئی تجارتی قافلہ نہیں ہے۔ گھوڑوں کے سازو سامان' اعلیٰ عربی راہواروں کی چال ڈھال لدھے پھندے اونٹوں کی قطاروں کو دیکھ کر جن پر زرق برق پالکیاں سجی ہوئی ہیں یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ کوئی عرب سردار قبیلہ کسی تقریب میں شرکت کے لیے مکہ جا رہا ہے۔

شہر کے چوک میں آگ کے شعلے میناروں کی شکل میں بلند ہو کر آسمانی شفق کو انگلیاں دکھا رہے ہیں۔ سازوں اور قہقہوں کی آوازوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی پرتکلف دعوت کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ مہمان فرداً فرداً' گروہوں یا کاروانوں کی شکل میں آ آ کر جمع ہو رہے ہیں۔ کیونکہ ان آتش مزاج ابنائے بادیہ کی زندگانیوں میں اس قسم کے مواقع کم ہی آتے ہیں۔

مہمان آگ کے گرد جمع ہوتے اور میزبان کے وسیع دسترخوان سے حتی الوسع سیر ہو کر ہی اٹھتے ہیں۔ کھانے میں چاول اور دنبے کا گوشت تھالوں میں اور مختلف قسم کے سالن، جن کی خوشبو سے بھوک چمک اٹھے، بے شمار رکابیوں میں، مصالحہ دار قہوہ پیالیوں اور تیز و تند ہری چائے گلاسوں میں پیش کی جاتی ہے، اس وقت ہر طبقہ اور عمر کے دو سو سے زائد مہمان جمع ہیں۔ جن میں قبیلہ کے شیخوں سے لیکر ادنیٰ حیثیت کے خانہ بدوش بدّو اور اعلیٰ حکام، شہر کے معمولی تاجر تک، اکابرین قریش میں فوجوں کے سپہ سالاروں سے صنم خانہ ہبل کے شیرین نقال پر وہت تک سب ہی تو شامل ہیں۔ ان کی نیلی نیلی، سرخ و سفید قباؤں نے میدان میں عجب رنگ آمیزی پیدا کر رکھی ہے۔ رنگ برنگے ازاروں کو انہوں نے اپنے زانوؤں سے لپیٹ کر آگے کی طرف یا پہلوؤں میں نرالے ڈھنگ کی گرہیں لگا رکھی ہیں۔ سر پر بھاری بھرکم صافے ہیں جن سے جنگجو افراد اور شہریوں کے مابین تمیز ہوتی ہے۔

مکہ میں اس سے بہتر اجتماع ناممکن ہے۔ کیونکہ میزبانی کے فرائض عبدالمطلب ادا کر رہے ہیں۔ جو خانہ کعبہ کے متولی ہیں۔ اور اس عہدہ کو عرب میں سب سے زیادہ فضیلت حاصل ہے۔ آج وہ بے انتہا خوش و خرم نظر آ رہے ہیں۔ ہر ایک سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے ہیں۔ کبھی اِدھر جاتے ہیں کبھی اُدھر، مہمانوں کی تواضع بھی کرتے جاتے ہیں۔ اور ان سے تفریح و مذاق بھی ہوتا جاتا ہے جس سے خوشی اور محبت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ان کے قدوقامت اور انتہائی متناسب خدوخال کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ صحرائے عرب کے فرمانرواؤں کے درمیان خود اُن کی حیثیت بھی ایک فرمانروا کی سی ہے۔ ایک ہی نظر میں ان کی شرافت وعظمت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ان کی دوربین آنکھیں، چوڑی چکلی پیشانی، لمبی ستواں ناک، مضبوط لب دہانہ ان کے اعلیٰ نسب عرب ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

ایک تنومند حبشی غلام گود میں چھوٹے سے نوزائیدہ بچہ کو لئے ہوئے باری باری مجمع میں سے ہر ایک کو دکھاتا پھرتا ہے اور عبدالمطلب ایک مہمان کے دریافت کرنے پر

فرماتے ہیں کہ میں نے اس کا نام محمدؐ رکھا ہے۔

سب لوگ پوچھتے ہیں:

''محمد کیوں رکھا! آپ کے خاندان میں تو بڑے عمدہ نام ہوا کرتے ہیں۔ ان میں سے کوئی رکھ لیتے۔ آپ کا سلسلہ نسب تو ہاشم، عبدمناف، قصی، کلاب، لوے، غالب، مدرکہ، نضر، عدنان، عدد، ثابت، حمل اور قیدار کے توسط سے حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت ابراہیمؑ تک پہنچتا ہے۔''

حضرت عبدالمطلب ہاتھ سے بچے کے دبیز رخساروں کو پیار سے تھپتھپاتے ہوئے جواب دیتے ہیں:

''مجھے امید ہے کہ اس نام کی بدولت جو میں نے اس کے لیے تجویز کیا ہے۔ یہ بچہ ایک بہت بڑا آدمی بنے گا۔''

عبدالمطلب کے احباب نے انہیں آج سے زیادہ کبھی ہشاش بشاش نہ دیکھا تھا۔ ان کے بہت سے لڑکے لڑکیاں تھیں۔ جن کی تعداد بعض مؤرخین اٹھارہ تک بتاتے ہیں۔ لیکن ان سب میں انہیں حضرت عبداللہ سے خاص اُنسیت تھی، دراصل انہیں اپنے اس بیٹے سے اس قسم کی محبت تھی جیسے حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسمٰعیلؑ سے تھی۔ اور انہیں کی طرح انہوں نے بھی اپنے بیٹے کو بتانِ کعبہ کی بھینٹ چڑھا دینے کی منت مان رکھی تھی۔ لیکن سرداران قریش کا اصرار مانع آیا۔ جس کے باعث وہ اپنے اس عہد کو پورا کرنے سے باز رہے اور نقض عہد کی پاداش میں سو اونٹ یا دنبے قربان کر کے قسم کا کفارہ ادا کر دیا۔ اس وقت سے قریش میں عہد شکنی کے بدلے سو اونٹ قربان کرنے کی رسم جاری ہوئی۔ اس چھوٹے معصوم بچے محمدؐ میں انہیں اس کے باپ کے خدوخال اور دلآویز شرگیں آنکھوں کی جھلک نظر آتی ہے۔ انہوں نے اس کا نام محمدؐ اس عقیدہ اور اُمید پر رکھا ہے کہ عبداللہ کا یہ شیرخوار بچہ قبائل کے درمیان بڑی ناموری حاصل کرے گا اور ممکن ہے کہ ان کی جگہ کعبہ کی تولیت کا بلند مرتبہ بھی حاصل کر لے۔

خوشی کے تاشے باجے رات گئے تک بجتے رہے' آمنہ ڈھول کی آوازیں اور اس کے ساتھ موسیقی اور قہقہوں کی گونج سنتی رہی۔ تاروں بھرے صاف شفاف آسمان کے نیچے لیٹی ہوئی وہ اس وقت کو یاد کر رہی ہیں جب اسی طرح کی ایک رات میں دلہن بن کر وہ بنو نجار کے خاندان سے قریش کے معزز قبیلہ میں آئی تھیں۔ اس واقعہ کو ابھی چند ہی ماہ گزرے ہیں۔ لیکن آج وہ بیوگی کا لباس پہنے ہیں۔ ایک چھوٹا سا بچہ ان کی چھاتی سے چمٹا ہوا دودھ پی رہا ہے اور وہ اسے فرط محبت سے گلے لگا رہی ہیں۔ سب ہی ماؤں کو اپنے بچے عزیز ہوتے ہیں۔ لیکن محبت کا پہلا ثمر بہت ہی شیریں ہوا کرتا ہے۔

............﴿2﴾............

لیکن آمنہ کا دل غم واندوہ سے لبریز ہے۔ خلق مجسم اور شکیل وجمیل عبداللہ کی دائمی مفارقت نے ان کے قلب میں جو خلا پیدا کر دیا ہے اسے دنیا کی کوئی خوشی پر نہیں کر سکتی۔ اگر آمنہ کی نظریں اتنی دوربین ہوتیں کہ جس سے وہ مستقبل کے آئینہ میں جھانک کر اپنے عزیز بچہ محمدؐ کی آئندہ رفعت وعظمت کی ایک جھلک بھی دیکھ لیتیں تو شاید انہیں رنج والم کا اس قدر احساس نہ ہوتا۔ یہ صحیح ہے کہ حضورؐ کی پیدائش سے کچھ ہی عرصہ قبل اصحاب فیل کا وہ یادگار واقعہ پیش آیا تھا جس میں ابرہ اور اس کی فوج کا بھرکس نکل گیا تھا۔ مکہ میں ان محیر العقول مافوق الفطرت باتوں کا بھی جگہ جگہ تذکرہ ہو رہا ہے جو آپ کی ولادت کے موقع پر پیش آئی تھیں۔ مثلاً ایران کا وہ قیامت خیز زلزلہ جس میں کسریٰ کے ایوان کی چار برجیاں منہدم ہو گئیں یا اس انوکھے سیارے کی نمود جو اس وقت بھی صحرائے عرب کو منور کر رہا ہے یا اس سے بھی بڑھ کر ایران کے آتشکدہ میں اس مقدس آگ کا خود بخود ٹھنڈا ہو جانا جو ہزارہا سال سے روشن تھی۔ اس طرح جھیل سیوا کے پانی کا یکا یک خشک ہو جانا بھی اہل مکہ کے لیے باعث حیرت بنا ہوا ہے۔

ممکن ہے کہ ان واقعات کا مستقبل سے براہ راست کوئی تعلق نہ ہو اور یہ سب محض اتفاقیہ ہی اس وقت رونما ہوئے ہوں۔ ثقہ مورخین ہماری اس توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی پر خندہ زنی بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے۔ ان علامات میں خدا تعالیٰ

کی طرف سے اس مقتدر ہستی کی جانب کوئی اشارہ نہیں ہو رہا۔ جس کے ذمہ یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ وہ عرب کے منتشر قبائل کو یکجا کر کے ایک مملکت کے ماتحت لے آئے اور دنیا کو ایک ایسا پیغام دے جو صدیوں تک روحوں کو گرماتا اور قلبوں کو تڑپاتا رہے۔

اہل مکہ کو محمد ﷺ کی آئندہ عظمت و ناموری کا تو کوئی علم نہیں۔ لیکن عبدالمطلب کے پوتے کی حیثیت سے قریش ان پر فخر کرتے اور قبیلہ کے نبرد آزما تک آپ کو عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ دادا کی ساری شفقت اور محبت آپ کے لیے وقف ہے اور لوگ اکثر آپ کو ان کی گود میں کھیلتا اور اگر کوئی اجنبی نہ آ جائے تو اس سے منہ چھپاتا ہوا دیکھتے ہیں۔ آپ چچا تائے خصوصاً ابوطالب اور حضرت حمزہؓ کو بھی اتنے ہی عزیز ہیں۔ صغیر سن محمدؐ کو باپ کی محبت کا تو علم ہی نہ ہو سکا تھا لیکن رسم و رواج نے جلد ہی آپ کو ماں کی ممتا اور آغوش شفقت سے بھی جدا کر دیا۔ چند ماہ تو آپ نے ماں کا دودھ پیا۔ پھر کچھ دن عبدالمطلب کی لونڈی ثوبیہ نے رضاعت کی۔ لیکن بالآخر عرب کے قدیم دستور کے مطابق آپ کو اس مقصد کے لئے حلیمہ کے سپرد کر دیا گیا جو بنو سعد کی ایک بدوی خاتون تھیں۔ اور اب محمدؐ اس کے دودھ پر پلنے لگے جو صحرائے عرب کے بہادر بچوں کی نشوونما کا ایک جزولاینفک تھا۔

عبدالمطلب کا اقتدار نقطہ عروج پر ہے۔ پچاس برس ہوئے جب انہیں مکہ مکرمہ کی تولیت سپرد ہوئی تھی اور اس وقت سے وہ گویا عرب کی دولت مشترکہ کے سربراہ ہیں۔ شہر کا نظم و نسق قصی کے خاندان میں سے دس اکابر کی ایک جماعت کے ہاتھ میں ہے جو آبادی کے تمام مذہبی اور سیاسی اُمور کی ذمہ دار ہے۔ شعبے جدا جدا ہیں جن میں سے خانہ کعبہ کی کلید برداری عبدالدار کے قبیلہ میں' چاہ زمزم کی نگرانی بنو ہاشم کے خاندان میں اور دیوانی و فوجداری عدالت تیم بن مرہ کی نسل میں چلی آ رہی ہیں۔ حکومت کے دوسرے شعبے افواج کی سربراہی اور پڑوسی قبائل سے تعلقات ہیں تو ان کے قلمدان بھی قریش ہی کے سربرآوردہ اشخاص کے ہاتھوں میں ہیں۔ عہدوں اور اعزازات کی اس تقسیم کے باوجود عبدالمطلب کے سن و سال' ذاتی کردار اور اثر و رسوخ کے باعث ان کو دوسرے

سرداروں ہی میں نہیں بلکہ تمام عرب میں ایک ممتاز حیثیت حاصل ہو گئی ہے کیونکہ مکہ کو اُم القریٰ یا عرب کی ''تمام بستیوں کی ماں'' کہا جاتا ہے۔

یہ شہر گو خود ایک بے برگ و گیاہ وادی میں آباد ہے۔ جہاں نہ زراعت ہوتی ہے۔ نہ نخلستان ہیں۔ لیکن چشمے' پھلوں کے باغات' گلزار اور سرسبز و شاداب وادیاں زیادہ دور بھی نہیں۔ قدیم الایام ہی سے مکہ تجارتی قافلوں کا مرکز رہا ہے۔ یمن سے مصالحہ جات' عطریات' کھالیں' پھل' پارچہ جات' خوشنما قالین اور چمڑے کا سامان حبش سے ہاتھی دانت' دمشق سے حسین لونڈیاں اور مصر سے غلام یہاں کے بازاروں میں آ کر فروخت ہوتے ہیں۔ لیکن اس شہر کو ایک دوسری خصوصیت بھی حاصل رہی ہے۔ یہ محض تجارتی منڈی ہی نہیں ہے بلکہ اس کو بیت الحرام کی وجہ سے بھی ایک نمایاں فضیلت حاصل ہے۔ اس کے گرد و پیش کے علاقہ میں قتل و غارت گری ناجائز ہے اور اس کی سرزمین ہر ایک کے واسطے دارالامان ہے۔ شہر کا مرکزی مقام کعبہ ہے اور عمائدین و اکابرین شہر کے مکانات اس کی دیواروں سے ملحق واقع ہیں۔ فن تعمیر کے اعتبار سے کعبہ کوئی جاذب توجہ عمارت نہیں۔ اس کی دیواریں سادہ اور ناتراشیدہ پتھروں کی بنی ہوئی ہیں۔ کھڑکی ایک بھی نہیں ہے اور روشنی صرف دروازہ سے ہی ہو کر اندر جا سکتی ہے۔ روایات سے ثابت ہے کہ اس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کی معیت میں خدائے واحد کی عبادت کے واسطے تیار کیا تھا۔ وقائع نگار اس کی بنیاد کو بیت المقدس کی عبادت گاہ سے ایک ہزار اور یسوع مسیح سے دو ہزار قبل کی تاریخ میں جگہ دیتے ہیں۔ اس عمارت کا نام ہی اس کی ہیت ترکیبی کا آئینہ دار ہے۔ کیونکہ لفظ کعبہ ''مربع'' کا مترادف ہے اس معبد کی تعمیر میں اس کے بانیوں کو فن تعمیر کے کسی اہم مسئلہ سے دوچار نہیں ہونا پڑا۔ انہوں نے محض چار سیدھی سادھی دیواریں اٹھا کر ان پر چھت ڈال دی اور بس۔

کعبہ میں سب سے زیادہ قابل احترام شے ایک سیاہ پتھر ہے جو کسی شہاب ثاقب کا ٹکڑا ہے اور کئی ہزار سال قبل ریگستان میں آ گرا تھا۔ اس پتھر کے گرد سینکڑوں

بت رکھے ہوئے ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ اہمیت ہبل کو حاصل ہے۔ یہ ایک بھاری بھرکم تونمد والا دیوتا ہے جس کی مشفقانہ نظریں ان پجاریوں پر جمی رہتی ہیں جو رات دن کے ہر حصہ میں اس کے گرد جمع رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان مختلف تجار کے جداگانہ بت ہیں جو حج کے موقع پر دُور و نزدیک سے بازار عکاظ میں خرید و فروخت کے واسطے آتے ہیں۔ کعبہ کی ان مورتیوں میں کنواری مریم کی بھی ایک شبیہ ہے جو مسیح کو اپنی گود میں لیے بیٹھی ہیں۔ اسی طرح عیسائی' یہودیوں اور آتش پرستوں کو کعبہ کے اندر اپنے دین کی کوئی نہ کوئی نشانی ضرور مل سکتی ہے۔

کعبہ کے تقدس پر تمام جزیرہ نمائے عرب متفق ہے۔ اس لیے اس پر قبضہ ہونے کی وجہ سے قریش کو تمام قبائل پر بالادستی حاصل ہو گئی ہے' اس کے علاوہ ان کو اس سونے چاندی' ہیرے جواہرات اور بیش قیمت نذرانوں پر بھی دسترس ہے جو عقیدت مند مشرک بتوں پر لا کر چڑھاتے ہیں۔ اس بت کدے کی چابیاں ابتداءً یمن کے مقرر کردہ افسروں کے قبضہ میں رہا کرتی تھیں۔ لیکن ایک دفعہ جب وہ کسی طرح قریش کے ہاتھ آ گئیں تو پھر انہوں نے اس طرح ان پر اپنی گرفت مضبوط کی کہ مشرکوں کی تمام کوششیں اور یمن کے عیسائی فرمانروا ابرہہ کا حملہ بھی اس سلسلہ میں کامیاب نہ ہو سکا۔ قریش کا یہ عقیدہ کہ اب اس معبد کی تولیت ان کے ہاتھ سے کبھی نہ جائے گی اتنا پختہ تھا کہ جب عیسائی بالکل شہر کے نزدیک پہنچ گئے اور حضرت عبدالمطلب کے اونٹ ہنکا لے گئے تو اس سردار مکہ کو کعبہ سے زیادہ اپنے جانوروں کی فکر لاحق تھی اور جب وہ اس سلسلہ میں عیسائی حملہ آور ابرہہ کے سامنے پیش ہوئے تو اس نے بڑے تعجب سے کہا کہ:

"تمہیں اونٹوں کی تو اتنی فکر ہے اور کعبہ کی مطلق پرواہ نہیں؟"

عبدالمطلب نے نہایت اطمینان سے جواب دیا:

"مجھے اپنے جانوروں کی تو اس وجہ سے فکر ہے کہ وہ میری ملکیت ہیں۔ رہ گیا کعبہ تو وہ جس کی املاک ہے وہی اس کی

حفاظت کرے گا۔"

خانہ کعبہ' جسے ابرہہ مسمار کرنے کی غرض سے حملہ آور ہوا۔ مدت الایام سے قدیم روایات کے بموجب قابل احترام سمجھا جاتا رہا ہے اور عام خیال یہ ہے کہ خدائے قدوس نے اہل عرب کی تخصیص کر کے انہیں اپنا یہ تحفہ عطا فرمایا ہے۔ یہ بیک وقت حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیلؑ کی دعاؤں کا مظہر' بیت اللہ' تین سو ساٹھ بتوں کا استھان' قوم کے دیوتاؤں کی مسند اور ان رسوم و روایات کا مرکز ہے جو سب خاص و عام کو دل و جان سے عزیز ہیں۔ حج کے فرائض یہیں ادا ہوتے تھے۔ اہل عرب اگر کسی ایک بات پر متفق تھے تو وہ صرف یہی تھی کہ حتی الوسع اس کی تزئین و آرائش کی جائے اور اسے اتنا حسین و خوبصورت بنا دیا جائے کہ دنیا کی کوئی عمارت اس کا مقابلہ نہ کر سکے۔ صابی اور آتش پرست تک اس پر چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ یہودیوں کے نزدیک بھی وہ قابل منزلت سمجھا جاتا ہے۔ چین و ہندوستان کے تاجر بھی یہاں پہنچ کر اپنا سر جھکا دیتے ہیں۔ البتہ عیسائیوں کو اس سے خدا واسطہ کا بیر و حسد ہے۔

.... 3 ....

وقت کی پرواز تیزی سے جاری ہے۔

مکہ کی آب و ہوا باوجود اس تقدس کے فرحت بخش نہیں ہے۔ ننھے حضور محمدؐ جلد ہی بنو سعد کے اس ماحول سے جہاں حلیمہ کی رہائش ہے' مانوس ہو گئے ہیں۔ قبیلہ کے دوسرے بچوں کی طرح پہلے تو وہ اپنی رضائی ماں کی چھاتیوں سے دودھ پیتے رہے اور اگر اس میں کمی واقع ہوتی تو صبر کرتے۔ پھر ٹڈیوں کا سالن اور نرم روٹی آپ کی غذا بنی۔ زیادہ بڑے ہوئے تو ہمعصر لڑکوں کی طرح مٹی سے کھیلنا' اس کے گھروندے اور ٹکیاں بنانی شروع کر دیں۔ معمولی کپڑے کا دھاری دار قمیض پہنے' برہنہ پا' برہنہ سر' بغیر ہاتھ منہ دھوئے' بکھرے بالوں آپ بھی دیہات کے عام بچوں کی طرح پھرتے کہ ان میں اور آپ میں کوئی تمیز نہیں ہو سکتی۔ لیکن حلیمہ کو آپ سے خاص اُنسیت ہے اور وہ حضورؐ کو اپنے بچوں کی طرح اسی عمر کا ایک بچہ سمجھتی ہیں۔ چھ برس کا زمانہ پختہ محبت کی نشوونما کے

لیے بہت کافی ہوتا ہے۔ اس دوران میں محمدؐ (ﷺ) نے حلیمہ کے دل پر بڑے گہرے نقوش ثبت کر دیئے ہیں۔ اور اب کہ دادا عبدالمطلب نے آپ کو واپس بلانے کا پیغام بھیجا ہے۔ ان کی آنکھوں سے سیل اشک جاری ہیں۔

آمنہ محمدؐ (ﷺ) کو اس چھوٹے گلگوتھنے بچے سے بالکل مختلف پاتی ہیں جس کو انہوں نے چھ برس قبل حلیمہ کے سپرد کیا تھا۔ اب آپؐ کی ایک چھوٹی سی شخصیت ہے۔ بالکل آزاد' ایک چیز کو دوسرے پر ترجیح دینے کی صلاحیت پیدا ہو چکی ہے۔ اور اپنی مرضی کے مطابق کام کرتے ہیں۔ آپؐ کی باتیں بڑی دلچسپ ہوتی ہیں اور ماں کو بڑی محبت سے چومتے ہیں اور آمنہ بھی آپ کو اپنی سب سے بڑی دولت سمجھتی ہیں۔ لوگ اکثر آپ کو دادا کی گود میں بیٹھے اور تلوار سے کھیلتے یا ان کی ڈھیلی ڈھالی پوستین میں سر گھساتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ لیکن قسمت کہہ رہی ہے' میں زیادہ عرصہ آپ کو ماں کی الفت یا دادا کی شفقت سے مستفید نہیں ہونے دوں گی۔

عبدالمطلب کو قریش کی جانب سے صنعا کے نئے حکمران سیف کو تخت پر جلوہ افروز ہونے کی مبارکباد دینے کے لیے جانا پڑتا ہے۔ ان کی عمر کے لحاظ سے یہ سفر بہت تکلیف دہ اور ضرر رساں ثابت ہوتا ہے اور بیاسی برس کی عمر میں وہ تمام قبیلہ قریش کو نالاں و گریاں کناں چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔

عبدالمطلب کے پس ماندگان کی تعداد بہت وسیع ہے جن میں لڑکے' لڑکیاں' پوتے پوتیاں سب ہی شامل ہیں۔ بڑے صاحبزادے عبدالعزیٰ ہیں جو نہایت رکیک' کمینہ' خود غرض اور سازشی طبیعت کے مالک ہیں۔ ان کی عصبیت بھی اتنی ہی نمایاں ہے جتنی خود پرستی' بڑا بیٹا ہونے کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو باپ کا جانشین اور ان کی جگہ کعبہ کا متولی سمجھتے ہیں۔ دوسرے فرزند ابوطالب ان سے بالکل ہی مختلف انتہائی شریف النفس' رحمدل' سخی اور کریم واقع ہوئے ہیں۔ ان کی صاف دلی اور خوش خلقی کی علامت وہ مسکراہٹ ہے جو ہمیشہ ان کے لبوں پر کھیلتی رہتی ہے۔ چہرہ کی سنجیدگی اور چشم و آبرو کی ساخت سے ان کے تدبر اور تنظیمی قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور گو وہ بہت کم بولتے

ہیں۔ لیکن ان کے خیالات کی رو بہت گہری ہوتی ہے۔ حمزہؓ نوجوان' حسین اور بہادر ہیں۔ ان کی آنکھوں سے روشن ضمیری کا اظہار ہوتا ہے۔ اور آواز میں عقیدت کی وہ کیفیت ہے جو انسان کو سرفروشی اور شہادت کی طرف لے جاتی ہے اور پھر عباس ہیں جن میں بہ یک وقت فلسفی بننے کی صلاحیتیں بھی موجود ہیں اور ولی بننے کی بھی۔

محمدؐ (ﷺ) کو عبدالمطلب کی میراث سے برائے نام ہی حصہ مل سکا اور چونکہ والدہ کا انتقال پہلے ہی ہو چکا تھا اس لیے اب آپؐ ابوطالب کی سرپرستی میں آ گئے ہیں۔ جو حضورؐ کے بڑے محبوب چچا ہیں۔ قبیلہ کے اکثر لوگوں کی طرح ابوطالب کا ذریعہ معاش بھی تجارت اور بیوپار ہی ہے۔ انہیں محمدؐ (ﷺ) کی شخصیت میں ایک نہایت خوش اخلاق اور پُرخلوص ساتھی مل گیا ہے جو ریگستان کے تجارتی کاروانوں کے ساتھ ان کا ہمسفر رہے گا۔ محمدؐ اب بچے نہیں ہیں۔ اور اپنی عمر کے لحاظ سے بڑے بھی زیادہ ہیں اور عقلمند بھی۔

﴿4﴾

سال گزرنے کے ساتھ ساتھ لڑکپن جوانی میں تبدیل ہوتا رہا۔ اور پھر شباب کے پھول کھلنے لگے۔

محمدؐ (ﷺ) میں اپنی قوم کی خوبیاں راسخ اور نمایاں ہونے لگی ہیں۔ ریگستانوں میں گشت' طوفانی راتوں اور چلچلاتی دھوپوں میں دُور دراز سفر کے مراحل طے کرنے کی وجہ سے ان میں ایسی جان پیدا ہو گئی ہے کہ وہ ہر سختی کا نہایت پامردی سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ایسی سرزمین میں جہاں نہ راستے ہیں نہ پگڈنڈیاں' جہاں جنگل کے درندوں اور وحشی قبائل پر کسی قسم کی روک تھام یا پابندی عائد نہیں کی جا سکتی۔ جہاں صرف جسمانی قوت ہی قانون کا کام دیتی ہے۔ جہاں ذاتی حفاظت کے واسطے ہر شخص کو مستعد اور چوکنا رہنا پڑتا ہے۔ اور اس کی زندگی شجاعت' عزم صمیم' شہسواری کی مہارت اور تیغ زنی کے کمال کی تابع ہے۔ محمدؐ کا جسم تو چھریرا ہے لیکن رگ پٹھوں کی لچک کے باعث ان کی قوت مدافعت بہت بلند ہو گئی ہے۔ مضبوط جسم کے اندر ایسی روح پنہاں ہے جو عزائم کے سامنے جھکنا نہیں جانتی۔ کٹھن حالات اور جفاکشی کی زندگی نے محمد ﷺ کو ان تمام

آلائشوں' تحریصوں اور تعیشوں سے محفوظ رکھا ہے جن میں ان کے ہمعصر دریائے دجلہ و فرات کے دوسری جانب مستغرق ہیں۔

جسمانی حیثیت سے آپ درمیانے قد و قامت کے انسان ہیں۔ چہرہ گولائی لیے ہوئے ہے۔ اور رخساروں کی رنگت صحت و تندرستی کی غمازی کر رہی ہے۔ سیدھے سروقد چلتے ہیں۔ نظروں سے ذہانت ٹپکتی ہے اور دنیا کو نہایت جرأت مندانہ انداز سے دیکھتے ہیں۔ خوبصورت سیاہ بال' گورے چہرہ پر خوب کھلتے ہیں۔ اور آنکھوں میں جھانک کر دیکھیے تو ایک نامعلوم ہستی کی جھلک بین طور پر ان میں نظر آتی ہے۔

ابوطالب پیشہ کے لحاظ سے ایک معزز تاجر ہونے کے علاوہ باپ کی جگہ کعبہ کے متولی بھی ہیں۔ اس لیے انہیں قریش اور اہل مکہ میں بڑا اثر و رسوخ حاصل ہے اور محمدؐ (ﷺ) چونکہ ان کے گھرانے سے تعلق رکھتے اور انہی کی سرپرستی میں ہیں۔ اس لیے اکابر و شرفائے قریش ان سے بخوبی واقف ہیں۔ جوانی کی عمر پختہ ہونے کے ساتھ ساتھ لوگ آپ کی حسن صورت' شہامت اور خوش اخلاقی کے معترف ہوتے جاتے ہیں۔ حاضر جوابی میں طاق' صاف گوئی اور سچائی کے اصولوں میں پختہ اور زندگی کے معمولی سے معمولی معاملات میں بھی انتہائی دیانتداری اور راستبازی پر عملدرآمد ہونے کی وجہ سے قوم نے آپ کو ''امین'' یعنی دیانتدار کا خطاب دے رکھا ہے۔

محمدؐ (ﷺ) کا یہ کردار ایک دن کی پیداوار نہیں ہے۔ اس کی نشوونما خود فطرت نے کی ہے اور دنیا کے تجربات نے آپؐ کو اس سانچہ میں ڈھالا ہے۔ آپؐ نے دور دراز کی مسافتیں طے فرمائیں اور صعوبتیں جھیلی ہیں۔ چودہ برس کی عمر سے ہی قریش کے ساتھ جنگ میں تلوار اٹھائی۔ اور جنگ کا نقشہ دیکھا ہے۔ اس لیے آپؐ زندگی کے مختلف پہلوؤں سے جن میں تجارت کا نفع نقصان اور جنگ کی فتح و شکست بھی شامل ہیں بخوبی واقف ہیں۔

مختلف جنگی مہمات اور کاروبار کے دوران محمدؐ (ﷺ) نے اپنے ملک اور قوم کے متعلق بہت کچھ معلومات حاصل کر لی ہیں۔ آپؐ نے صحرا کے حسن اور دہشت انگیزی

کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ آپ نے بہت سی قدیم حکایات بھی سنی ہیں اور خانہ بدوش قبائل کے مراسم سے بھی واقفیت حاصل کر لی ہے، بیرونی دنیا کے متعلق بھی بہت کچھ اطلاعات کا ذخیرہ بہم پہنچا لیا ہے۔ اور اب آپ کا دماغ ان پیچیدہ مسائل میں الجھا ہوا ہے کہ انسان انسان کے درمیان یہ افتراق کیوں پیدا ہو گیا کہ کوئی یہودی ہے تو کوئی عیسائی، کوئی سنی ہے کوئی زردشتی، محمد کو اپنا ملک دنیا کا مرکزی علاقہ نظر آتا ہے۔ جس میں اس کی مثال جسم کے اندر دل کی سی ہے۔ لیکن یہ دل کتنا کمزور اور ناقابل اطمینان ہے؟ عرب میں کوئی مرکزی طاقت نہیں ہے۔ تمام ملک متصادم قبائل میں بٹا ہوا ہے اور سرحد پار سے دشمنوں کے طبل جنگ کی آوازیں بھی سنائی دے جاتی ہیں۔ صرف مکہ کی مقدس سرزمین پر جنگ ممنوع ہے۔ لیکن حرم کے باہر قبائل گاہے بگاہے ایک دوسرے کی اکھاڑ پچھاڑ میں مصروف رہتے ہیں۔ بازنطینی فرمانرواؤں اور ایرانی خسروں کے نزدیک عرب بالکل جنگلی اور وحشی قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ رومن مورخین انہیں ناقابل اعتبار قوم گردانتے ہیں۔ اور محمد کو علم ہے کہ تمام متمدن علاقوں میں ان کی قوم کے متعلق مشہور ہے کہ انہیں نہ سچا دوست گردانا جا سکتا ہے نہ مستقل مزاج دشمن۔ روما اور ایران کی عظیم سلطنتوں نے اس ملک کی سرحد پر جنگ کرنے سے صرف اس وجہ سے ہاتھ روک رکھا ہے۔ اس سے نہ کسی قسم کی منفعت حاصل ہو سکتی ہے نہ شہرت و ناموری۔

عربوں کی تاریخ میں وقتاً فوقتاً کچھ سلطنتیں ابھریں۔ لیکن جلد ہی پانی کے بلبلوں کی طرح صفحہ ہستی سے نیست و نابود ہو گئیں۔ کسی ایک کو بھی تو قیام و دوام حاصل نہ ہو سکا۔ بدوؤں کی جبلت میں آزادی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے حتیٰ کہ ضبط و تنظیم کے ماتحت اگر خود ان کی منفعت کے واسطے کوئی اقدام کیا جائے تو وہ اسے بھی ٹھکرا دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں کسی انتظامی کارکردگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بزرگان خاندان کے فیصلے قابل احترام ضرور ہوتے ہیں لیکن ان کی عدول حکمی کی صورت میں تعذیب کوئی نہیں۔ امن و سکون کے اس ماحول میں کوئی گنجائش نہیں۔ نہ اسے پسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ نثر و نظم میں طنز و مزاح ان کی طبع نازک پر بہت گراں گزرتا ہے۔ لیکن

کسی کی مدح و ثنا میں زمین آسمان کے قلابے ملا دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ معمولی سے معمولی بات بھی ان کے ہاں بڑے دور رس نتائج پیدا کر دیتی ہے۔ بالعموم مویشیوں کی چوری یا کنوؤں اور چراگاہوں کے استعمال پر تکرار جنگ و فساد کا باعث بن جاتی ہے۔ خون کے بدلے خون کے نعرے لگتے ہیں۔ اور بعض اوقات یہ سلسلہ کئی نسلوں تک جاری رہتا ہے۔

اس علاقہ میں قدیم ترین سلطنت یمن کی ہے۔ اس کا پایہ تخت کسی زمانہ میں مارب تھا۔ جو جزیرہ نما کے بالکل جنوب میں واقع ہے۔ لیکن جب ایک زبردست سیلاب نے اس کو بالکل ملیا میٹ کر دیا۔ تو دارالحکومت صنعا میں منتقل ہو گیا۔ جہاں ابراہیم (ابرہہ) نے محمدؐ (ﷺ) کی سنہ پیدائش سے لگ بھگ ایک عالیشان گرجا تعمیر کرنا شروع کیا۔ اور اسی کو آباد کرنے کی خاطر اس نے ایک لشکر جرار لے کر مکہ پر دھاوا کیا تھا۔ صدیوں سے یمن کے بادشاہوں کا لقب "تبع" چلا آ رہا ہے جو افریقی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی جرار اور طاقتور کے ہوتے ہیں۔ یمن کے بعد دوسرے نمبر پر شمال مشرق کی ایک باجگزار ریاست حرہ ہے جس کے فرمانرواء صنعا کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور انہیں کی ایک شاخ سمجھے جاتے ہیں۔ یہ لوگ تقریباً چار سو سال سے حکمرانی کر رہے ہیں۔ اور کبھی کبھار اوپری دل سے ایران کے مطلق العنان فرمانرواؤں کی سیادت کو برائے نام تسلیم کر لیا کرتے ہیں۔ تیسری سلطنت غسان کی ہے جو شمال مغرب میں واقع ہے۔ اس کی تاریخ پانچ چھ صدیوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ اور یہاں کے فرمانرواء بھی موقع و مصلحت کے لحاظ سے کبھی ایک پڑوسی ملک سے تعلقات پیدا کر لیتے تھے اور کبھی دوسرے سے۔

عرب کے ایک علاقہ سے دوسرے تک یمن کے جھنڈے کسی نہ کسی نوعیت سے لہراتے رہتے ہیں۔ لیکن اس کے مرکزی حصہ کی نوعیت جداگانہ ہے۔ یہاں مختلف نسلوں کے قبائل آباد ہیں۔ جو اپنی خصوصیات کے لحاظ سے بالکل یکساں ہیں اور یہ علاقہ ان کا گڑھ سمجھا جاتا ہے۔ جنوب کے باشندوں کی طرح ان لوگوں کو فن عمارت' فنون لطیفہ

حتیٰ کہ زراعت سے بھی کوئی دلچسپی نہیں۔ اپنی فطرت میں ریگستانوں کی طرح وحشی اور بے لگام ہیں۔ خانہ بدوشی اور چراوا ہا گیری ان کی طرز حیات ہے۔ ان کے قبائل مختلف خاندانوں اور لاتعداد شاخوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ لیکن پانچ قبیلے بہت نمایاں ہیں۔ جزیرہ نما کے وسط میں ربیعہ' جو یمن کی سلطنت کے دعویدار ہیں۔ مغرب میں قریش' جن کی مکہ میں سیاست قائم ہے اور شمال میں قیس' شیم اور ہوازن آباد ہیں۔

گردوپیش پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے محمدؐ (ﷺ) کو سب سے پہلے تو اس بات کا اندازہ ہوا کہ ان کا اپنا قبیلہ قریش اور اس کے وہ حلیف جو مغربی ساحل کے شمالی علاقہ میں آباد ہیں۔ تمام ملک میں سب سے زیادہ ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ اور مکہ ان کا صدر مقام ہے اس کے بعد ان بے شمار خاندانوں کا نمبر ہے جو وسطی حصہ میں آباد ہیں۔ وہ نہ کسی کے ماتحت ہیں نہ باجگذار۔ تیسرے جنوب' مشرق اور شمال میں۔ یمن' حیرہ اور غسان کی قدیم سلطنتوں کے وہ باقیات الصالحات ہیں جو اب بازنطانی اور ایرانی سلطنتوں کے برائے نام ماتحت ہیں لیکن حالت ان کی یہ ہے کہ خود اپنی مملکت کے اندر بھی ان کا اقتدار واجبی ہی رہ گیا ہے۔ شہروں کے اندر زندگی محدود اور مقامی حیثیت رکھتی ہے۔ ہر شخص اپنے قبیلہ کے مفادات سے وابستہ ہے اور اسے صرف اپنے ہی شہر کی ترقی اور بہبود سے دلچسپی ہے۔ ان بستیوں کے بالکل نزدیک بدو آباد ہیں جو مٹی پتھر کے بنے ہوئے مکانات میں رہتے بھیڑ بکریاں چرا کر یا گزرتے ہوئے قافلوں کی نگہداشت کے فرائض انجام دے کر گزر بسر کر لیتے ہیں۔ ان کی پشت پر جلتے تپتے گرم و خشک ریگستان ہیں جن کے درمیان سفر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جن کی حدت بیان کرنے کے لیے لغات میں الفاظ نہیں ملتے۔ جہاں تمازت آفتاب سے آسمان تیل کی گرم تھالی اور زمین گرم لوہا بن جاتی ہے۔ حدت کے باعث نہ دن کو نیند آتی ہے نہ رات ہی کو پلک جھپکتی ہے۔ پیاس کی شدت سے گلے خشک ہو جاتے ہیں۔ اور زبانیں باہر نکل پڑتی ہیں۔ جہاں دور دراز سراب نظروں کو دھوکا دے کر منہ چڑھاتے اور کوسوں کوس تک ریت کا لامتناہی سمندر ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے۔

(5)

مکہ میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ نے جس کعبہ کو خدا کا گھر بنایا تھا۔ وہاں سے اللہ کو دیس نکالا مل چکا ہے اور اب وہاں اس وحدہٗ لاشریک کے منصب کو تین سو ساٹھ بتوں نے غصب کر رکھا ہے۔ اس کے علاوہ لوگوں کے گھروں میں بھی کچھ معبود ہیں۔ چند لوگ فرشتوں کو پوجتے ہیں جنہیں بنات اللہ یا خدا کی بیٹیاں کہا جاتا ہے اور جن کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ وہ اپنے والد کے حتمی فیصلوں کو بھی بدل سکتی ہیں۔ بعض چاند اور سورج کی پرستش کرتے ہیں اور ستاروں کی الوہیت کے تو تقریباً سب ہی قائل ہیں۔ رات کو صحرا میں سفر کرنے والے قبائل اگر تاروں بھرے آسمان کے ایسے گرویدہ ہوں تو اس میں تعجب کی مطلق گنجائش نہیں۔ شبنم سے بھیگی ہوئی راتوں میں صرف زہرہ کی آب و تاب' ثریا کی نور افشانی یا شرمیلے چاند کی ضیا پاشی ہی جاذب توجہ نہیں بلکہ آدھی رات کے وقت آسمان کا پورا نقشہ ہی آنکھوں میں نور اور دل میں سرور پیدا کرتا رہتا ہے۔ ستارے خود بھی اپنی روشن گزرگاہوں پر تیزی سے سفر کرتے ہوئے سنسان ریگستانوں میں خیموں کے اندر اہل قافلہ اور باہر مویشیوں کو سوتا دیکھتے ہوئے یا آدھی رات کے بعد کسی رواں دواں کارواں پر نظر ڈالتے اور راہزنوں کی ایک جماعت کو کمین گاہ میں ان کا انتظار کرتے ہوئے دیکھ کر گزر جاتے ہیں۔ لوگوں کو ان کے ذریعے سے مختلف قسم کی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ لق و دق صحرا میں انہیں سے راستوں اور سمتوں کا پتہ چلتا ہے وہی موسم کی تبدیلی اور بارشوں کی پیش گوئی کرتے ہیں اور نجومیوں کی مُعلومات کے مطابق وہی رنج و راحت' شادی و غم یا سعد و نحس کے معاملات میں دخلیکار ہیں۔

عربوں کی مذہبی زندگی سے متعلق چند مقدس مقامات بھی ہیں اور لاتعداد مراسم بھی۔ لیکن حقیقی غور و فکر سے انہیں دور کا بھی واسطہ نہیں۔ قبائل آباؤ اجداد کی قائم کردہ رسوم و روایات پر سختی سے کاربند ہیں اور اس طرح کے پیچیدہ اور فلسفیانہ سوالات سے کہ یہ سب کچھ کیسے اور کیوں ہو رہا ہے۔ اپنے دماغوں کو خواہ مخواہ پریشان نہیں کرتے۔ چند گروہ اب بھی دیوتاؤں اور دیویوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ان پر انسانوں کی

بھینٹ چڑھاتے ہیں۔ اور اس معاملہ میں عیسائیوں کو دوسروں پر ترجیح دی جاتی ہے۔

جن عربوں نے روما سے دوستانہ تعلقات قائم کر رکھے ہیں۔ وہ سطحی طور پر عیسائی بن گئے ہیں۔ یہودیوں کے قبائل ملک میں جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ نسل و نژاد' زبان اور طور طریق میں عربوں سے زیادہ قریب ہیں۔ لیکن عیسائی بھی ان معاملات میں کچھ زیادہ مغائرت نہیں رکھتے۔ پڑوس کے دو بڑے ممالک یعنی شمال میں سلطنت روما اور مغرب کی طرف سمندر پار حبشہ عیسائیوں کے ملک ہیں۔ کسی باقاعدہ قانون اور واضح نظام عمل کے فقدان نے عیسائیت کو عربوں کے لیے خاصا جاذب توجہ بنا دیا ہے۔ یہ درست ہے کہ ان کے ہاں دس احکام موجود ہیں۔ لیکن گیارہویں قانون نے خوش قسمتی سے سب پر غلبہ حاصل کر لیا ہے۔ کہ "اگر تم سے گناہ سرزد ہو تو تمہارے کسی فعل سے اس کا اظہار ہرگز نہ ہونا چاہیے۔ تا کہ جب تک تم زندہ ہو اپنے گناہ کی لذتوں سے بہرہ اندوز ہوتے رہو۔"

لیکن باوجود ان رجحانات اور میلان خاطر کے یہودیت یا عیسائیت کو سرزمین عرب میں جڑ پکڑنے کا موقع نہیں مل سکا۔ اہل عرب آزاد منشی کی زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں اس لیے یہودیت ان کے واسطے کچھ زیادہ ہی قنوطیت آمیز مذہب ہے اس میں بجائے رہنمائی یا کسی امید افزا پیام کے رنج و الم کی داستانیں شامل ہیں۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ وہ خدا کو صرف اپنی مخصوص ملکیت سمجھتے ہیں اور چونکہ انکی نظروں میں وہی سب سے زیادہ برگزیدہ لوگ ہیں اس لیے اس عقیدہ کے بموجب مسیح کو انہیں کی قوم میں مبعوث ہونا ہے۔ لیکن یہ کسی جگہ نہیں بتایا گیا کہ خدا تعالیٰ نے آخر یہودیوں ہی کو یہ شرف کیوں بخشا ہے اور اگر ایسا ہے ہی تو اب کیوں صدیوں سے انہیں امید و بیم کی کشمکش میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اور کیوں ان کی طرف سے نظریں پھیر لی ہیں۔ اس بارے میں ان کی طرف سے کوئی معقول دلیل پیش کی گئی ہے کہ جب عالیجاہ بپتسمہ دینے والے یوحنا کی شکل میں ظاہر ہو گئے تو کیوں ان کے مرتبہ اور حشمت کے مطابق ان کی قدر و منزلت نہ کی گئی۔ اور پھر جب انہوں نے تعیش کی دلدادہ سلوی کی پیش کردہ ترغیبوں کو

ٹھکرا کر ثابت کر دیا کہ وہ معمولی انسانوں سے بڑھکر ایک مافوق الفطرت ہستی ہیں۔ تب کیوں ان کو پیغمبر تسلیم کرنے سے گریز کرتے رہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ جب خدائے قدوس نے بنی نوع کے گناہ بخشوانے کے لیے اپنے اکلوتے بیٹے کو اس دنیا میں بھیجنے کی زحمت گوارا کی اور اس سلسلہ میں تخلیق انسانی کے تمام اصول بالائے طاق رکھ دیئے تو یہودیوں نے کیوں ان پر طعنہ زنی کی اور انہیں چوروں کے زمرے میں شامل کر کے مصلوب کرا دیا۔ آخر میں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ باوجود ان تمام نافرمانیوں کے خدا تعالیٰ کو وہ کون سی مجبوری لاحق تھی کہ وہ ان کی بجائے کسی دوسری اور زیادہ شکر گزار قوم کو اپنی تقریب بارگاہ نہ بنالے۔

اس دور کی عیسائیت بھی کوئی اچھی مثال پیش نہیں کرتی۔ یسوع مسیح کا کلیسا مختلف دھڑوں میں بٹ چکا ہے۔ آسمانی بادشاہت میں افراتفری مچی ہوئی ہے اور شیطان نہایت اطمینان سے اس سرزمین پر اکڑتا پھرتا ہے۔ تثلیث میں وحدت اور وحدت میں تثلیث کے متضاد عقائد کی بحثوں نے حضرت مسیحؑ کے مواعظ کو پس پشت ڈال رکھا ہے۔ یسوع مسیح کو تو صرف ''بیٹا'' بننے پر ہی اکتفا کرنا پڑا ہے۔ لیکن ان کے پیرو ''فادر'' یعنی باپ اور ''مدر'' یعنی ماں کہلاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ''سسٹر'' بہنوں کی بھی اچھی خاصی فوج ہے۔ اور اس صدی میں عیسائیت کا معجزہ صرف یہ نظر آتا ہے کہ دنیا میں مقدس کنواریوں (نن) کی آبادی میں حیرت انگیز اضافہ ہو گیا ہے۔

6

محمدؐ (ﷺ) کی عمر اب بیس سال سے متجاوز ہو گئی ہے اور اب آپ موزوں شخصیت کا ایک اعلیٰ نمونہ ہیں۔ جسمانی حیثیت سے چھریری لیکن طاقتور' غور و فکر کے عادی' سنجیدہ ذہین مستعد اور ایماندار' روشن ضمیر اور خوش اخلاق۔ اب تک بہت سے سفر کر چکے ہیں۔ اور مختلف اقوام کے تاجروں سے آپ کو لین دین کا بھی سابقہ پڑ چکا ہے۔ ذہانت چہرہ سے ہویدا ہے اور دوسروں کے مقابلے میں آپ کو انسانی فطرت اور دنیاوی معاملات پر زیادہ عبور حاصل ہے۔ لیکن بجز ابوطالب اور چند دوسرے رفیقوں کے آپ

کے دوست بہت کم ہیں۔ زمانہ کے لحاظ سے آپ کی چند خصوصیات ایسی ہیں جو لوگوں کو بڑی عجیب نظر آتی ہیں۔ مثلاً اگر آپ سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو آپ اس کی غلط تاویلیں نہیں کرتے' نہ جھوٹے بہانے بناتے ہیں۔ نہ فحش مذاقی اور یاوہ گوئی میں حصہ لیتے ہیں اور نہ اپنی عمر کے لوگوں سے ہنسی' دل لگی یا مذاق کرتے ہیں۔ اور صنف نازک سے تو ان کو اب تک کوئی دلچسپی ہی پیدا نہیں ہوئی۔ قصہ مختصر وہ بے نظیر خوبیوں کے مالک ہیں۔ ایماندار بھی ہیں اور قابل عزت و رفعت بھی۔ لیکن نہ اس حد تک کہ کسی شہاب ثاقب کی طرح دنیا کو جگمگا دیں۔ انہوں نے کبھی کسی عہدہ یا منصب کی خواہش نہیں کی اور مکہ کی معاشرتی یا ثقافتی زندگی میں اگر ان کا کچھ حصہ ہے بھی تو بہت مختصر اور نامعلوم۔

یہ صحیح ہے کہ آپ نے حلف الفضول کی تجدید میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ جو زیردستوں کی امداد کے واسطے جو کسی ملی تنظیم کے اصول پر ازسرنو قائم کی گئی ہے۔ اس انجمن کے اراکین کو اس بات کی قسم کھانی پڑتی ہے کہ حدود مکہ میں اگر کوئی کسی پر ظلم کرے گا۔ خواہ وہ مقامی باشندہ ہو یا باہر سے آنے والا۔ تو وہ مظلوم کی حمایت کریں گے ۔ اور اسے تاوان بھی دلوائیں گے۔ یہ انجمن زیادہ تر بیواؤں' یتیموں' ناداروں اور ضرورتمندوں کے حقوق کا تحفظ کرتی تھی۔ اس طرح کے ادارے دنیا کے ہر حصہ میں وقتاً فوقتاً تشکیل ہوتے رہے ہیں۔ لیکن اہل مکہ حلف الفضول کے بانی کو اس طرح سرگرم عمل دیکھ کر متحیر ہوتے رہتے ہیں۔

پھر یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ دولت دنیا میں محمدؐ (ﷺ) کا کوئی نمایاں حصہ ہے۔ عربوں کی پوری قوم ہی مفلس ہے اور ان میں محمدؐ (ﷺ) تو غالباً سب سے زیادہ غریب ہیں۔ گردوپیش کی دنیا میں دولت کی جو ریل پیل ہے اسے دیکھتے ہوئے ابوطالب کے بھتیجے محمدؐ (ﷺ) کو ایک معمولی حیثیت کا شتربان بھی کہا جا سکتا ہے۔

اس زمانہ میں مکہ کے اندر خدیجہؓ نامی ایک بیوہ رہتی ہیں۔ ان کے شوہر کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ اور وہ نہ صرف بے شمار دولت چھوڑ کر مرے ہیں بلکہ ان کا کاروبار بھی دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ اس سلسلہ میں چونکہ دور دراز سفر بھی کرنے ہوتے

ہیں اس لیے کسی قابل اور دیانتدار کارکن کی سخت تلاش ہے۔ خدیجہؓ کو ابوطالب کے بھتیجے محمدؐ (ﷺ) کا پتہ چلتا ہے جن کو قوم امین کے لقب سے یاد کرتی ہے۔ اس لیے وہ انہیں اپنے پاس بلا بھیجتی ہیں۔

محمدؐ انہیں تیس برس سے تجاوز لیکن اچھی خاصی جوان خاتون پاتے ہیں۔ ان کا قد چھوٹا' چہرہ گول' شگفتہ اور پیشانی چوڑی چکلی ہے۔ نرم و گداز ہاتھ بتاتے ہیں کہ وہ اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ خود بھی قریشی النسل ہیں اور یہ معلوم کر کے خوش ہوتی ہیں کہ دور کے رشتے سے ہی سہی لیکن بہرحال آپ ان کے ہم قبیلہ ہیں۔ خدیجہؓ کو آپ کے طور وطریق پسند آتے ہیں۔ کیونکہ جو باتیں آپؐ نے کیں وہ بہت جچی تلی اور یقین آمیز تھیں۔ خدیجہ کو ایک ایسا منتظم مل جانے کی بڑی خوشی ہے جو وجیہہ بھی ہے اور ذہین بھی۔ اور ذہانت کے ساتھ دیانتداری اور راست بازی کی خوبیاں اس پر مستزاد ہیں۔ ادھر محمدؐ ایسی خاتون کی ملازمت اختیار کرنے پر مسرور ہیں جو ان کے ساتھ اس خوش اخلاقی سے پیش آئیں اور جن کے لیے کام کر کے انہیں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے مواقع بھی حاصل ہوسکیں گے اور معقول معاوضہ بھی ملے گا۔

اس لیے محمدؐ بڑی امیدوں کے ساتھ خدیجہؓ کے کام پر روانہ ہوتے ہیں۔ آپؐ کی تو اُمیدیں کچھ غیر متوقع بھی نہیں کیونکہ تجارتی منڈیوں میں ابوطالب کے کارندہ ہونے کی حیثیت سے آپ پہلے ہی متعارف ہو چکے ہیں۔ پہلے جب کبھی بھی آپ نیا سامان لے کر ان تجارتی مرکزوں پر پہنچتے تھے تو تاجر لوگ آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا کرتے تھے۔

بی بی خدیجہؓ کا مال تجارت کے لیے دمشق لے جاتا ہے۔ مکہ سے نکل کر آپ شام جانے والے ایک قافلہ میں شامل ہو جاتے ہیں اور اثنائے راہ میں یثرب سے گزرتے ہیں۔ جو مکہ کے بعد عرب کا دوسرا اہم شہر ہے۔ آپؐ دیکھتے ہیں کہ یہ ایک بڑی کاروباری منڈی ہے۔ جس کی آبادی تقریباً پچیس ہزار ہے اور اس کے گرد کھجوروں کے ہرے بھرے باغات اور کھیت ہیں۔ لوگ یمن کے زرخیز علاقہ سے آ کر یہاں آباد ہو

گئے ہیں۔ یثرب سے بصریٰ تک کا راستہ بہت پرکشش ہے۔ کہیں تو ریت کے ٹیلے ہیں' کہیں بجری' کسی مقام پر چونے کا پتھر ملتا ہے تو کسی جگہ کھاری پانی کی دلدلیں یا تالاب ہیں۔ جن سے صرف اونٹ ہی سیراب ہو سکتے ہیں۔ بعض مقامات ایسے بھی ملتے ہیں جہاں میٹھے پانی کا کوئی کنواں یا چشمہ واقع ہے اور اس کے گرد کچھ ہرے بھرے کھیت ہیں جن پر وہاں کی مختصر سی آبادی کا گذارہ ہے۔ یہ لوگ خانہ بدوش بدوؤں کے خوف سے اپنی بستیوں کے گرد دیواریں بنا لیتے ہیں کیونکہ ڈاکو غیر محفوظ دیہات پر یکا یک حملہ کرتے اور ان کے مویشی' گھوڑے اور بھیڑیں ہنکا لے جاتے ہیں۔

بصریٰ میں داخلہ سے قبل محمدؐ نجد کی غربی سطح مرتفع سے گزرتے ہیں۔ اس ناہموار علاقہ میں پہاڑ چاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں۔ اور ان میں سے بعض تو کافی بلند ہیں۔ لیکن راستہ کہیں نہیں روکتے۔ کیونکہ مختلف چٹانوں کے درمیان ایسی کھائیاں موجود ہیں۔ جن میں سے ہو کر قافلے بہ آسانی گزر جاتے ہیں۔

بصریٰ نعوذ کی شمالی سرے پر واقع ہے۔ یہ علاقہ سرخ پتھر کی آبی چٹانوں سے بنا ہے۔ جو اس جزیرہ نما کے جغرافیائی حالات کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ ان لق و دق میدانوں کے دوسری جانب حیفہ' یروشلم (بیت المقدس) اور دمشق کے علاقے دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس راستہ کے تمام شہروں بالخصوص یثرب' بصریٰ کھاری پانی کے دیہات کف اور اذرئی سے لے کر دمشق تک آپ ہر جگہ اس سامان کو فروخت کرتے جاتے ہیں۔ جو آپ کی سپردگی میں دیا گیا ہے۔ گاہکوں سے اچھی قیمت وصول کرتے ہیں اور دور دراز کے اس سفر سے مالکہ کے لیے بیش قرار منافع لے کر مکہ واپس تشریف لاتے ہیں۔

اس دوران میں خاتون خدیجہؓ آپ کا بے چینی سے انتظار کرتی رہتی ہیں۔ ان کا غلام میسرہ جو سفر میں آپ کے ہمراہ تھے انہیں برابر تاجرانہ کامیابیوں سے مطلع کرتا رہتا ہے۔ واپسی پر جب آپ سفر کی کل کیفیت بیان کرتے ہیں تو اس کا خدیجہؓ کے دل پر بہت اچھا اثر ہوتا ہے اور اب تو یہ حال ہو گیا ہے کہ دن میں آپ کی شبیہ نظروں کے

سامنے رہنے لگی ہے اور رات کو آپ کا خیال ستانے لگا ہے۔ بالآخر انہیں اس کا یقین ہو جاتا ہے کہ مجھے محمدؐ سے محبت ہو گئی ہے۔

ادھر محمدؐ کو عورتوں کی طرف کچھ توجہ نہیں ہے۔ آپؐ کے خیالات تو انسانی زندگی اور اپنے زمانہ کے حالات پر مرکوز ہیں۔ حیات النساء کی تجارت پر غیر معمولی توجہ ہے۔ یہ کہنا تو غلط ہو گا کہ جنس لطیف کی فطری کشش آپ کو اپنی طرف نہیں کھینچتی۔ بات دراصل یہ ہے کہ آپ نے جنس اناث کی طرف اب تک اس نظر سے دیکھا ہی نہیں جس سے اس عمر کے نوجوان اسے تاکا کرتے ہیں۔ اس وقت آپ کی عمر پچیس سال ہو گئی ہے۔ دنیا کے متعلق آپ کی تمام معلومات اکتسابی اور تجرباتی ہیں۔ آپ نے اپنی ذہانت طبع کو اقتصادی اور تجارتی اُمور میں بڑی خوبی سے استعمال کیا ہے۔ یہ بات بھی نہیں ہے کہ آپ ضرورت سے زیادہ شرمیلے ہیں۔ یا عورتوں کو حقیر اور ناقابل توجہ سمجھتے ہیں۔ آپ نرم خو واقع ہوئے ہیں اور غریبوں یا بے کسوں کے لیے آپ کے دل میں بے انتہا محبت اور رحم کے جذبات موجزن ہیں۔ اس لیے یہ امر بالکل غیر فطری اور توقع سے بعید ہے کہ اس قسم کی فطرت کا کوئی انسان زیادہ عرصہ تک متاہل زندگی کی صعوبتوں سے کنارہ کش رہ سکے۔

خدیجہؓ بہت دولتمند خاتون ہیں لیکن دولت مندی آپؐ کے نزدیک کوئی امتیازی شان نہیں رکھتی۔ عبدالمطلب کے پوتے' ایک کامیاب تاجر صاحب حسن و جمال اور انتہائی دیانتدار ہونے کے سبب سے آپ قوم کی سب سے زیادہ متمول اور جاذب نظر دوشیزہ سے شادی کر سکتے ہیں۔ برخلاف اس کے خدیجہ خاتون بیوہ ہیں۔ جوانی ڈھل چکی ہے اور مروجہ قومی معیار کے لحاظ سے عمر میں بھی آپ سے کافی بڑی ہیں۔

لیکن شامی سفر کے دوران میں آپ کے دل میں بھی خدیجہؓ کے متعلق طرح طرح کے خیالات آتے رہے ہیں۔ ان کے رکھ رکھاؤ' خوش اخلاقی' طرزِ گفتگو' آواز کے لوچ اور ان سب سے بڑھ کر اس اعتماد نے جو انہوں نے آپ پر کیا تھا کافی اثر کیا ہے۔ شادی شدہ زندگی کی چوکھٹ پر قدم رکھتے وقت ہمدردی اور اعتماد کی صفات' حسن

ظاہر کے مقابلے میں زیادہ نمایاں ہوتی ہیں۔ ایک نوجوان اور کمسن بیوی کو شوہر کی زیادہ توجہ درکار ہوتی ہے اس کی جسمانی خواہشات زیادہ وسیع ہوتی ہیں۔ اور لباس و زیورات کی چاہت بھی بے پناہ ہوا کرتی ہے۔ لیکن جس عورت کی جوانی کے ایام گزر چکے ہوں۔ اسے زندگی کا اتنا تجربہ ہو جاتا ہے کہ وہ جنسی خواہشات یا جسمانی آرائش کی اتنی شوقین نہیں رہتی۔ وہ بالعموم اپنے نوجوان شوہر کی وفادار خادمہ بن کر رہتی ہے اور اسے زندگی کی کشاکش سے عہدہ برا ہونے میں حوصلہ اور سہارا دیتی رہتی ہے۔ چنانچہ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ کسی ممتاز نوجوان کو قابو میں لانے کے لیے جب کئی عورتیں جدوجہد کرتی ہیں تو زیادہ عمر والی خاتون کم عمر والی کو شکست دے دیتی ہے۔

اس امر کی تحقیق کہ شادی کا پیام کس کی طرف سے آیا بالکل ایک نجی معاملہ ہے جس کی بحث میں پڑنا لاحاصل ہے۔ اگر روایات پر اعتبار کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ”خدیجہؓ کا دل آپؐ کی طرف مائل ہو گیا تھا“ اور وہ ایک معقول رجحان سے گزر کر اس حد تک آپؐ کی گرویدہ ہو گئی تھیں کہ انہوں نے ایک باہمی صلاح کار کے ذریعہ اپنی محبوب ہستی کو نکاح کا پیام بھجوا دیا اور محمدؐ نے اسے بطیب خاطر قبول کر لیا۔

شادی کی رسوم بڑے دھوم دھام سے منائی جاتی ہیں۔ قریش کے تمام سرکردہ لوگ شریک محفل ہیں۔ بہ حیثیت متولی کعبہ ابو طالب خطبہ نکاح پڑھتے ہیں۔

”اس معبود کی حمد و ثنا کے بعد جس نے ہم کو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل سے پیدا کیا۔ اس خدا کی حمد و ثنا کے بعد جس نے ہم کو یہ مقدس سرزمین رہنے کے واسطے عطا فرمائی اور ہمیں خانہ کعبہ کا متولی بنایا اور انسانوں کے درمیان عدل و انصاف قائم رکھنے کی خدمت سپرد فرمائی‘ یہ میرا بھتیجا اور میرے مرحوم بھائی عبد اللہ کا صاحبزادہ محمدؐ ہے۔ اگرچہ بدقسمتی سے اس کے پاس دنیاوی دولت نہیں ہے لیکن تمام قبیلہ میں حسن صورت اور حسن سیرت‘ ذہانت اور اولوالعزمی کے لحاظ سے سب پر سبقت لے گیا

ہے۔ میرے اس بھتیجے محمدؐ کو خدیجہؓ سے محبت ہے اور وہ بھی اسے دل و جان سے چاہتی ہے اس لیے میں ان دونوں کو زن و شوہر کے رشتہ میں منسلک کرتا ہوں۔ ساتھ ہی یہ بھی اعلان کرتا ہوں کہ اس سلسلہ میں مہر کی جو رقم متعین ہو گی۔ میں اس کی ادائیگی کا ذمہ دار ہوں گا۔"

خدیجہؓ کے اعزاء بیس اونٹ بتاتے ہیں کہ خدیجہ بیس اونٹ طلب کرتی ہیں اور ابوطالب فی الوقت اتنے جانور پیش کر دیتے ہیں۔ جس کے بعد یہ تقریب ڈھول کی سریلی تھاپوں اور گیتوں کی گونج میں ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد ایک شاندار دعوت کا اہتمام ہوتا ہے اور خاطر و مدارات رات گئے تک جاری رہتی ہے۔ جس میں مہمانوں کی دلچسپی کے واسطے چند خوبصورت کنیزوں کو بھی بلا لیا جاتا ہے کہ دف پر شادی کے ترانے گا کر حاضرین کو محظوظ کریں۔ محمدؐ شرم و حیاء کے باعث ایک کونے میں جا بیٹھے ہیں۔ اور ظاہر کرتے ہیں کہ اپنے کسی دوست سے سرگرم گفتگو ہیں۔ مہمان دعوت سے تو مسرور ہیں اور ان کی نظریں اپنے گانے والیوں کے گدرائے ہوئے جسموں اور سرخ ہونٹوں پر جمی ہوئی ہیں۔

دوسرا باب

"پیغمبر"

محمدؐ اور خدیجہؓ کی شادی پر پندرہ برس گزر چکے ہیں۔ اس میں گرمیوں کے وہ موسم بھی شامل ہیں جب کہ سرزمین عرب اس کرۂ ارضی پر جہنم کا نقشہ پیش کرنے لگتی ہے اور بادسموم کے تیز اور آتشیں جھونکے ہر ذی روح شے کو جھلسا کر رکھ دیتے ہیں اور موسم سرما بھی ہیں جب کہ شمال سے آنے والی سرد ہوائیں جسم میں کپکپی پیدا کیا کرتی ہیں۔ نخلستان بھی پندرہ مرتبہ ہی پھولوں سے سج چکے ہیں اور اتنی ہی بار جنوبی ہواؤں نے ریگستان کے حلقوم کو تر کیا ہے۔

خدیجہؓ اب پینتالیس برس کی ہو چکی ہیں اور زندگی کی شام ڈھلتی جا رہی ہے۔ محمدؐ بھی اب پچیس تیس برس کے خوش و خرم نوجوان نہیں رہے۔ اب تک وہ کئی بچوں کے باپ بن چکے ہیں۔ خدیجہ کے بطن سے چار لڑکیاں اور دو لڑکے پیدا ہوئے ہیں۔ پہلے کا نام قاسم ہے۔ اسی کی کنیت سے خدیجہؓ نے آپ کو ابوالقاسم کے نام سے یاد کرنا شروع کر دیا ہے۔ اسکے بعد یکے بعد دیگرے زینبؓ، رقیہؓ، ام کلثومؓ اور فاطمہ زہراؓ پیدا ہوئیں اور آخر میں ایک لڑکا تولد ہوا جس کی عمر نے وفا نہ کی اور جلد ہی فوت ہو گیا۔

شادی نے محمد کو دولت ضرور عطا کی لیکن اس سے ان کی طبیعت میں کسی قسم کا تفاخر پیدا نہیں ہوا۔ اتنا البتہ ہوا ہے کہ اب انہیں فکرِ معاش کی حاجت نہیں رہی۔ دوسرے لوگ جب اس قسم کی شادی کرتے ہیں تو بیوی کے مال و دولت میں تصرف کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن آپ نے اپنے ہاتھ اس سے بالکل پاک و صاف رکھے ہیں۔

باطنی طور پر آپ اب بھی ایک دولتمند بیوی کے نادار شوہر ہیں۔ اس کے مال میں آپ کا صرف اتنا حصہ ہے کہ معمولی کھانا کھالیں اور سادہ کپڑے پہن لیں۔ لیکن آپ کے وہ دوست جو ضرورتمند ہیں اور امداد طلب کرنے آتے ہیں۔ اس دولت سے زیادہ مستفید ہوتے ہیں۔ آپ بذاتِ خود تو ان کی استعانت سے قاصر ہیں۔ لیکن بیوی سے ان کی سفارش کر دیتے ہیں۔ خاتون خدیجہ خود بھی بہت درد مند اور فراخدل واقع ہوئی ہیں۔ اور مستحق لوگوں کی مدد کرنے سے خوش ہوتی ہیں۔ اس طرح محمدؐ اور خدیجہ بلا نام ونمود کے بہت سے گھرانوں کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اس پندرہ برس کے عرصہ میں آپ نے اپنے زمانہ کی معاشرتی اصلاح میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا ہے اور جوانی کے زمانہ میں اگر اس قسم کی کوئی توقعات آپ سے وابستہ تھیں تو وہ ابھی تک پوری نہیں ہوئی ہیں۔

اب ایسا نظر نے لگا ہے کہ محمدؐ بہت تنہائی پسند ہو گئے ہیں۔ اوّل تو ویسے ہی آپ کے دوست اتنے کم تھے کہ انگلیوں پر گن لیجئے۔ مگر اب تو آپ شرفاء کی مجلس طرب میں بھی دکھائی نہیں دیتے۔ معاشرتی اجتماعات سے بھی پہلو تہی کرتے ہیں۔ اور غیر معمولی طور پر خاموش اور غور وفکر میں منہمک نظر آتے ہیں۔ کیا آپ اس زندگی سے تنگ آگئے ہیں؟ کیا آپ کو اپنے مقدر سے کوئی شکایت ہے؟ کیا آپ ان بدقسمت لوگوں میں سے ہیں جن کا تقدیر اس طرح منہ چڑاتی ہے کہ پہلے دولت، ناموری اور عیش وعشرت کے سبز باغ دکھائے اور جب وہ اس طرف لپکے تو کسی چٹیل ریگستان میں چھوڑ جائے جہاں دُور دُور تک سراب ہی سراب ہو اور انہیں یہ دیکھ کر سخت مایوسی ہو کہ ہم تو جہاں سے روانہ ہوئے تھے اسی جگہ کھڑے ہیں۔

کیا وجہ ہے کہ آپ بلا مقصد پہاڑیوں کے درمیان گھومتے پھرتے ہیں؟ اتنے عرصہ تک گھر سے باہر رہ کر کیا کرتے ہیں؟ کیا آپ کے دماغ میں کوئی وہم سما گیا ہے یا کوئی ایسا کیمیاوی نسخہ تیار کرنے کی فکر میں ہیں جو دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دے؟

﴾2﴿

اس پندرہ برس کے عرصہ میں دنیا کی تاریخ کے صفحات بعض اہم واقعات سے پُر ہو گئے ہیں۔ سلطنت روما کے مشرقی اور مغربی دونوں علاقوں میں انحطاط کے آثار نمایاں ہو چکے ہیں۔ اس کی عظمت گہن میں آ چکی ہے۔ لیکن ٹسکنی اور یونٹس میں بازنطینی اسلحہ سازوں کی تلواریں اب بھی دشمن کا خون چاٹنے میں مشہور ہیں۔ اسلحہ خانے ہتھیاروں سے بدستور پُر ہیں۔ جہازوں' منجیقوں اور مستحکم قلعوں کی بھی کمی نہیں۔ فوجی تربیت گاہوں میں فنون جنگ کی تعلیم' افواج کی تنظیم اور نقل و حرب کی ترکیبیں آج بھی سکھائی جاتی ہیں۔ لیکن اب اس مملکت میں وہ جوان پیدا نہیں ہو رہے جو ان ہتھیاروں کو صحیح طور پر استعمال کر سکیں۔ قلعوں کے دفاع کا کام اپنے ہاتھ میں لینے کے قابل ہوں۔ جہازوں کو ٹھیک چلا سکیں یا جو علوم بھی انہوں نے نظریاتی طور پر سیکھے ہیں۔ ان کو جرأت مندانہ طور پر عمل میں لا کر کامیابی حاصل کر سکیں۔ جب سے جسٹنین نے ایک فاحشہ ملکہ کے ساتھ ملکر حکمرانی شروع کی ہے۔ اس وقت سے یورپی اور ایشیائی علاقوں میں زبردست بغاوتوں نے قیصر کے تخت کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ کسی شہنشاہ کی مطلق العنانی کا دارومدار اس کی مستحکم چھاؤنیوں پر ہوا کرتا ہے۔ لیکن اب یہ چھاؤنیاں ہی ہیں جہاں اس کے احکامات کو سب سے زیادہ ٹھکرایا جاتا اور ان سے تعرض کیا جاتا ہے۔ سپاہی اپنے افسروں کو گالیاں دیتے اور ان کا پیچھا کرتے ہیں۔ اور وہ اپنے ماتحتوں سے لرزہ بہ اندام رہتے ہیں۔ انہوں نے شہنشاہ کے قوانین کو درہم برہم کر رکھا ہے۔ مسیح مصلوب کی مورتیوں پر سنگباری تک کر چکے ہیں۔ اور نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ بالآخر انہوں نے خود شہنشاہ مارس اور اس کے بیٹوں کو قتل کر کے ان کی لاشوں کو سمندر میں پھینک دیا۔ اور ان کے سروں کو گزرگاہ عام پر نمائش کے واسطے لٹکا دیا۔ اس کے بعد فوکاس جو ایک پستہ قامت'' ڈاڑھی منڈا' سرخ بالوں اور گھنے ابروؤں والا بردار تھا۔ کچھ عرصہ مشرقی ممالک پر حکمرانی کرتا رہا۔ اسے نہ قانون سے واقفیت تھی' نہ کسی علم و فن سے۔ حتیٰ کہ اسلحہ کے استعمال سے بھی نابہر تھا۔ بہت جلد مشتعل ہو جاتا۔ تکلیف پہنچنے کی صورت میں

سخت گیری کرنے لگتا۔ اور مخالفت یا تنقید پر آپے سے باہر ہو جاتا۔ اس نے اپنے ایام سلطنت کام سے گریز' عیش کوشی اور شراب نوشی میں گزار دیئے۔ حتیٰ کہ اسے اپنی ان بدعنوانیوں کی سزا یوں دی گئی کہ اس کے ارغوانی شاہی لباس کی دھجیاں اڑائی گئیں۔ تاج چھین لیا گیا۔ پھٹے پرانے لباس میں ہتھکڑیاں پہنا کر نیم برہنہ پھرایا گیا۔ مردوں اور عورتوں نے اس کا منہ چڑایا اور اس کے پیچھے تالیاں بجائیں۔ پھر اس کا سر قلم کر کے جسم کو بھڑکتی ہوئی آگ کی نذر کر دیا گیا۔ پھر تخت پر ہرقل گدی نشین ہوا۔ ایسا ہی کچھ حال مغربی سلطنت کا ہوا۔ جہاں اس کا سورج غروب ہوتا نظر آ رہا ہے۔ گو شفق کی روشنی ابھی تک برقرار ہے۔ جس عظیم سلطنت کو جسٹینین نے اپنے قوت بازو سے نہ صرف مضبوط و مستحکم کیا بلکہ اس کو کافی وسعت بھی دی تھی۔ وہ یکا یک تاپاشہ کی طرح بیٹھ گئی ہے۔ لومبرڈیوں نے اطالین مقبوضات کے بڑے حصہ پر دوبارہ قبضہ کر لیا ہے۔ اور اوارا در سلاد نے دریائے ڈینیوب کے طاس سے بحر ایڈریاٹک کے درمیانی علاقہ کو تاراج کر کے اس پر اپنے جھنڈے گاڑ دیئے ہیں۔ ایران میں خسرو ثانی اپنے دادا خسر وادلی کی شان و شوکت کو برقرار رکھے کامیابی سے حکومت کر رہا ہے۔ اس کی سرحدیں حلب تک پہنچ چکی ہیں۔ اب وہ دمشق اور یروشلم پر دانت لگائے بیٹھا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ کسی وقت یثرب' مکہ اور صنعا کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لے گا۔

جہاں تک وطن کا تعلق ہے۔ محمدؐ دیکھ رہے ہیں کہ ان کا ملک خانہ جنگیوں' باہمی عداوتوں اور قبائلی بغض و حسد کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ جس قوم سے ان کو اتنی محبت ہے وہ ابتذال' توہمات' اور جہالت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ جرأت' شہامت اور اولوالعزمی کے زیورات سے آراستہ ہونے کے باوجود ان میں جور و تشدد' لاقانونیت اور سنگدلی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ نہ کوئی مرکزی طاقت ہے' نہ قومیت' نہ قانون نہ انصاف' یہ صحیح ہے کہ ہر فرد اپنے قبیلہ کا وفادار ہے۔ لیکن یہ خوبی عصبیت کے باعث غلط راستوں میں بھٹک گئی ہے۔ خلاصہ یہ کہ چھوٹے چھوٹے مناقشات نے بڑے گہرے زخم پہنچائے ہیں اور ملک کی سرزمین ان کا شکار ہو کر لالہ زار بن گئی ہے۔ کعبہ خدائے واحد کی عظمت قائم رکھنے

کے واسطے تعمیر کیا گیا ہے۔ لیکن خالق ارض و سما کا تصور ہی ذہنوں میں دھندلا اور گڈمڈ ہو گیا ہے۔ عالم بسط کو اب بے شمار دیوتاؤں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ لوگوں کی معاشی زندگی بڑی دقیانوسی اور بعض امور میں تو سخت نفرت انگیز ہے۔ دختر کشی عام ہے۔ عورتوں کی حالت مویشیوں سے بہتر نہیں۔ ان کا مصرف محض نفسانی خواہشات کی تسکین سمجھا جاتا ہے۔ جوا اور شراب دن رات کے مشاغل ہیں اور شخصی آزادی یا اجتماعی وفاداریوں کے تصورات بہت مبہم ہیں۔

جرأت اور فیاضی عملی طور پر سفاکی، قتل اور مختلف قسم کی رکیک اور شرمناک حرکات میں تبدیل ہو چکی ہے۔ تھیوڈورا کے مذہبی جوش و خروش کے باعث ان سڑکوں پر جہاں کچھ روز قبل اس کا شہوانی کاروبار بڑے زور سے چلتا تھا۔ آج خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔ اسکندریہ میں عیسائیت کے سرگرم مبلغوں نے شریف النفس ہپاتیا کی پہلے عصمت دری کی اور پھر اسے قتل کر دیا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ جس شیطان نے لوگوں کو ان سفاکیوں کی شہہ دی اسے مذہبی پیشواؤں نے ولیوں کی فہرست میں شامل کر دیا ہے۔

3

اس تقریب کو جس میں سرداران قریش عبد المطلب کے پوتے محمدؐ اور متمول خاتون خدیجہؓ کی شادی میں شریک ہوئے تھے۔ پندرہ برس کا عرصہ ہو چکا ہے۔ اب آپؐ کی عمر چالیس سے تجاوز کر چکی ہے۔ لیکن بجز اس کے کہ آپ ایک خاتون کے شوہر اور چند بچوں کے باپ ہیں۔ آپ کی زندگی کے بہت کم حالات معلوم ہوتے ہیں۔ کوئی قصہ، کوئی معمولی واقعہ، کوئی روایت اس دور حیات پر روشنی ڈالنے والی ہو تو ہو لیکن معاشی زندگی کا ایک واقعہ بہرنوع مستند اور دقیع سمجھا جاتا ہے۔

جب قریش کو ایک طویل خانہ جنگی سے فرصت ہوئی تو انہوں نے اپنی فتح کی یادگار قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے بارے میں اس سے بہتر کوئی صورت نظر نہ آئی کہ کعبہ کو زیادہ وسیع اور شاندار عمارت میں تبدیل کر دیا جائے۔ اس لیے اسے منہدم کر کے دوبارہ بنایا گیا۔ جب دیواریں اس حد تک پہنچ گئیں کہ سنگ اسود کو نصب کیا جائے تو

مختلف قبائل میں اس امر پر تنازعہ شروع ہو گیا کہ اکابرین میں سے کون اس فرض کی انجام دہی کرے۔ آخر بڑی ردّ و قدح کے بعد اس فیصلہ پر اتفاق ہوا کہ جو شخص کل صبح سب سے پہلے حدودِ حرم میں داخل ہو وہ اس فریضہ کو پورا کرے۔ اتفاق دیکھئے کہ یہ شخص محمدؐ (ﷺ) ثابت ہوئے۔ جب آپ سے اس قضیہ کو طے کرنے کے متعلق کہا گیا تو آپ نے ایک چادر منگائی۔ پتھر کو اس کے درمیان رکھا اور سب لوگوں سے کہا کہ اس کے سرے پکڑ کر اس جگہ پہنچا دیں۔ جہاں اسے نصب ہونا تھا۔ اس طرح سب لوگ اس کارِ ثواب میں شریک ہو کر خوش اور مطمئن ہو گئے۔ بعد میں آپؐ نے اسے اٹھا کر اپنی جگہ پر رکھ دیا۔

اس ایک واقعہ کے علاوہ یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ آپ گاہے بگاہے بلا مقصد قرب و جوار کی پہاڑیوں میں گھومتے پھرتے ہیں۔ ان ایام کی تاریخ بہت مختصر بھی ہے اور اس کے اکثر واقعات صفحۂ ہستی سے محو بھی ہو چکے ہیں۔ محمدؐ کو بسا اوقات غور و تفکر کی حالت میں دیکھا گیا ہے اور یہ بھی اندازہ ہوا ہے کہ آپ رفتہ رفتہ تنہائی پسند ہوتے جاتے ہیں۔ ان لق و دق سنسان پہاڑیوں' چٹانوں اور عمیق غاروں کے درمیان جہاں نہ کوئی درخت ہے' نہ سایہ' نہ پھول کھلتے ہیں نہ چشموں کے پانی کی آواز سنائی دیتی ہے۔ محمدؐ گہرے غور و خوض میں مصروف رہتے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ بات آپ کے ذہن نشین ہوتی جاتی ہے کہ اب تک جو مذاہب وحی کے ذریعہ نازل ہوئے یا جو معاشرتی نظام قائم کیے گئے' جن میں اس دور کا تمدن بھی شامل ہے وہ سب خارج المعیاد ہو چکے ہیں اور اب ان کی افادیت باقی نہیں رہی۔ آپ کو اس بات کا پختہ یقین ہو گیا ہے کہ آپ کی قوم کو ایک صاف اور سچے دین کی ضرورت ہے جو بآسانی ہر شخص کی سمجھ میں آ جائے۔ لیکن ساتھ ہی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہو۔ ایک ایسا مذہب جو لوگوں کی ذہانت کو ابھارے' اصولوں کی بلندی میں یکتا ہو اور انہیں حقیقت سے روشناس کر دے۔

اس طرح رفتہ رفتہ آپ کو اپنی زندگی کا مقصد واضح طور پر نظر آنے لگا۔ ساتھ ہی ایک ایسا واقعہ پیش آ جاتا ہے جس سے آپ کے ان شبہات پر مہر تصدیق ثبت ہو جاتی ہے۔

﴾4﴿

بہار کا موسم اور صبح صادق کا وقت ہے۔ شمال مشرق کی ٹھنڈی ہوا بدن میں کپکپی پیدا کر رہی ہے۔ ستارے نیند میں آنکھیں جھپکا رہے ہیں۔ اور مشرقی افق پر آسمان ہلکا نیلا نظر آنے لگا ہے۔ محمدؐ ایک پہاڑی سے اتر رہے ہیں۔ نیچے وادی میں مکہ کا شہر ہے اور اس کے گھروں کی سپاٹ چھتیں دھندلی سی نظر آ رہی ہیں۔ کبھی کبھی مرغ کی بانگ صبح کی آمد کا اعلان بھی کر دیتی ہے۔ کعبہ کے قریب ایک سادے مکان میں خدیجہؓ معہ اپنے بچوں کے محو خواب ہیں۔ ایک کونہ میں چراغ جل رہا ہے جس کی روشنی کو نظروں سے اوجھل رکھنے کے لیے الگنی پر ایک شال ڈال دی گئی ہے۔ یکایک تیز قدموں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اور کوئی دروازہ پر زور کی دستک دیتا ہے۔ خدیجہؓ قدرے خوفزدہ ہو کر دریافت کرتی ہیں۔ ''کون دروازہ کھڑکھڑا رہا ہے؟'' جواب ملتا ہے۔ ''میں ہوں ابو القاسمؐ جلد دروازہ کھولو''۔ خدیجہؓ ہڑبڑا کر اٹھتی ہیں اور دروازہ کی کنڈی کھول دیتی ہیں۔ شور سے بچے بھی جاگ اٹھتے ہیں اور حیرت سے تکنے لگتے ہیں۔ محمدؐ گھبرائے ہوئے اندر آتے ہیں۔ آپؐ کے بال بکھرے ہوئے ہیں۔ آنکھوں میں خوف کے آثار ہیں اور گلا خشک ہو رہا ہے۔

خدیجہؓ پوچھتی ہیں۔ ''ابوالقاسم! کیا معاملہ ہے؟''

ایک لمحہ کے لیے آپؐ کی زبان نہیں کھلتی۔ پھر جب کچھ سکون ہوتا ہے تو فرماتے ہیں۔ ''میں بتا نہیں سکتا''۔

کیوں؟ کیا بات ہو گئی ہے؟ کیا رات کو خاص واقعہ ہو گیا؟

جب تک خدیجہؓ کل حالات توجہ سے سننے کا وعدہ نہیں کر لیتیں۔ محمدؐ کچھ بتانے پر تیار نہیں ہوتے۔ پھر جب وہ آپ کا ہاتھ پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے جاتی ہیں۔ جہاں بچے ان کی باتیں نہ سن سکیں تو آپ کی آنکھوں سے پھر اسی خوف کا اظہار ہونے لگتا ہے اور سانس اسی طرح پھول جاتا ہے لیکن بالآخر آپ فرماتے ہیں۔

پچھلی راتوں کی طرح گذشتہ شب بھی غار حرا میں بالکل سکون اور خاموشی تھی۔

ہاں ستارے کچھ زیادہ چمکدار نظر آتے تھے۔ عبادت سے فارغ ہونے کے بعد میں نے کمبل اوڑھا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ آدھی رات کے اوپر کچھ ہی وقت گزرا ہو گا کہ ایک گھن گرج آواز نے مجھے بیدار کر دیا۔ ایک سیاہ بادل مکہ کی سمت میں چھایا ہوا تھا۔ یکا یک ایسا معلوم ہوا کہ کسی طاقتور ہاتھ نے مجھے اٹھا کر بٹھا دیا ہے۔ اور فوراً ہی جبریل امین دوسرے فرشتوں کے جھرمٹ میں نمایاں ہوئے۔ آسمان پر گرج چمک سے شور محشر برپا ہو گیا اور دو مرتبہ کسی آواز کو میں نے اپنی طرف متوجہ کرتے سنا' میں جواب دینا چاہتا تھا۔ لیکن ہونٹ نہ کھلتے تھے۔ تیسری مرتبہ آواز نے بڑی تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''اقرا'' (پڑھو) تب میں نے دریافت کیا کہ کیا پڑھوں؟

جواب ملا ''اس رب کے نام سے جو خالق ہے''۔

میں نے جواب دیا کہ مجھے پڑھنا نہیں آتا۔

جبریلؑ مسکرائے اور چوتھی مرتبہ مجھے حکم دیا کہ پڑھو۔

''پڑھو اس خدا کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ جس نے انسان کو گوشت کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ پڑھیے آپ کا رب کریم ہے۔ وہ جس نے قلم کے ذریعے سے انسان کو علم سکھایا اور وہ باتیں بتائیں جو اسے معلوم نہ تھیں''۔

''پھر کیا ہوا؟''

''آسمانی قوتوں کے وہی مظاہرے' گرج چمک اور اس کے بعد مکمل تاریکی۔ خدیجہؓ میں سچ کہتا ہوں کہ یہ خواب کی کیفیت نہ تھی۔ بلکہ جو کچھ ہوا عالم بیداری میں ہوا۔ نہ میرے دماغ میں کوئی فتور آیا ہے''۔ مجھے جان کا خطرہ ہے۔

''ابو القاسمؐ اللہ آپ کو کبھی رسوا نہ کرے گا۔ آخر وہ کیوں آپ کو ضرر پہنچائے' آپ ہمیشہ سچ بولتے ہیں' برائی کے بدلے بھی لوگوں سے نیکی ہی کرتے ہیں۔ آپ اپنی بات کے پکے اور وعدے کے سچے ہیں۔ آپ مہربان بھی ہیں۔ اور مخیرّ بھی۔ لین دین میں کھرے ہیں اور شرم و حیا آپ کا طرۂ امتیاز ہے۔

اسی روز شام کے وقت خدیجہ محمدؐ کو اطلاع کیے بغیر اپنے بوڑھے نابینا چچا زاد

بھائی ورقہ کے پاس جاتی ہیں جو یہودی اور عیسائی دونوں مذاہب کی آسمانی کتابوں کے عالم ہیں۔ خدیجہؓ کے بیان کو سن کر وہ اپنی خوشی ضبط نہیں کر سکتے اور ان کے جھری بھرے رخساروں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی ہے۔

ان کی زبان سے بے اختیار نکلتا ہے۔ ''قدوسم! قدوسم! مقدس! مقدس! یہ تو وہ ناموس اکبر ہے جو حضرت موسیٰ ؑ اور حضرت عیسیٰؑ پر وحی لایا کرتے تھے۔ محمدؐ سے کہہ دو کہ وہ خوش ہو جائیں اور ہمت نہ ہاریں۔ یہ مقدر ہو چکا ہے کہ وہ اپنی قوم کے پیغمبر ہوں گے۔

خدیجہؓ ورقہ کی پیشن گوئی سنانے کے واسطے فوراً ہی گھر لوٹ آتی ہیں اور کہتی ہیں۔

''ابو القاسم مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ جو کچھ آپ نے غار حرا میں دیکھا وہ کوئی دماغی ہیولا نہ تھا۔ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ خدا تعالیٰ نے آپ کو اپنی قوم میں رسالت کے لیے منتخب کیا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اس کے رسول ہیں۔

(لَآ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰہِ)

﴿5﴾

گو خدیجہؓ اور ورقہ نے وحی کے نزول پر فوراً ہی آمنا و صدقنا کہہ دیا لیکن خود نامزد پیغمبر کو محض ایک وحی کے نزول پر اپنے پیغمبر بن جانے کا یقین نہیں ہے۔ اور آپ مزید ثبوت کے منتظر ہیں جس میں زیادہ دیر بھی نہیں لگتی اور دوسری وحیوں کا نزول ہونے لگتا ہے۔ جبرئیل امین کو یہ خدمت سپرد کی گئی ہے کہ وہ محمدؐ کو نئے مذہب کی تعلیم دیں اور وہ ان سے بالعموم غار حرا میں ملتے ہیں۔ اس وقت آپ یا تو مراقبہ میں ہوتے ہیں، یا طول طویل عبادت کے بعد آرام و استراحت فرما رہے ہوتے ہیں۔

ایک دوسری رات یہ وحی نازل ہوتی ہے۔

''اے کپڑے میں لپٹنے والے' اور لوگوں کو تنبیہ کر دو' اپنے رب کی عظمت بیان کرو۔ اپنے کپڑوں کو صاف رکھو اور نجاست سے بچو' اس خیال سے خیرات نہ کرو کہ زیادہ

ملے گا اور اپنے رب کے لیے صبر کرو۔ جب صور پھونکا جائے گا تو وہ دن بڑا سخت ہو گا"۔

پھر ایک اور موقع پر جبریل امین کے ذریعے اس طرح خطاب کیا جاتا ہے۔

"یَا اَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ" اور آپ کو ہدایت کی جاتی ہے کہ آپ رات کو زیادہ جاگا کریں اور عبادت کیا کریں۔ کیونکہ اللہ آپ کے اوپر بڑی ذمہ داری عائد کرنا چاہتا ہے۔ جبریلؑ آپ کو یہ بھی بتاتے ہیں کہ آپ دوسرے معبودوں' دیوتاؤں سے کوئی واسطہ نہ رکھیں۔ ہمیشہ ایک ہی خدا کو یاد کیا کریں اور اسی کے ہو رہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ وعدہ بھی کیا گیا ہے کہ نیک لوگ جو اعمال بھی اپنی عاقبت درست کرنے کے لیے آگے بھیجیں گے۔ وہ سب رتی رتی اللہ کے ہاں مل جائیں گے۔ آپ کو اس کی بھی ہدایت کی گئی ہے کہ آپ اللہ سے مغفرت کی دعائیں کرتے رہیں۔ کیونکہ اللہ بڑا غفور الرحیم ہے۔

دوسرے مواقع پر مختلف ارشادات الٰہی نازل ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً خدا تعالیٰ کا اُن لوگوں سے اظہار ناراضگی جو ناپ تول میں کمی کر کے عوام کو دھوکہ دیتے ہیں۔ اپنے وعدوں اور معاہدوں سے پھر جاتے ہیں۔ یتیموں اور بیواؤں کی جائیداد میں بے جا تصرف کرنے یا دینی معاملات میں تمسخر سے کام لیتے ہیں اور اس کے مقابلے میں ان لوگوں کو خوشنودی کی بشارت دی گئی ہے' جو اپنے غلاموں کو آزاد کرتے' بھوکوں کو کھانا کھلاتے اور یتیموں اور مصیبت زدہ لوگوں کی امداد کرتے ہیں۔ وحی کے ذریعے یہ بھی بتایا گیا کہ قیامت کے روز جس کے نامہ اعمال میں ذرّہ برابر نیکی ہوگی۔ اس کا ثواب اسے ضرور ملے گا۔ اور جس نے رتی بھر بھی برائی کی ہوگی اس کی سزا بھی اسے بالیقین دی جائے گی۔ اگر میزان عدل کا پلڑا نیکیوں کی طرف جھکے گا تو اسے جنت کے باغوں میں جگہ ملے گی ورنہ اس کو دوزخ کی آگ میں جھونک دیا جائے گا۔

صحابہؓ کو یہ اطمینان دلانے کے واسطے کہ آپ پر کسی بدروح یا شیطان کا سایہ نہیں ہے۔ محمدؐ (ﷺ) کو بتایا جاتا ہے کہ اللہ ان سے تغافل نہیں برتتا۔ محمدؐ سے یہ بھی وعدہ کیا جاتا ہے کہ خدائے قدیر آگے چل کر آپ کو اتنا دے گا کہ آپ خوش ہو جائیں

گے۔ کیا ایسا نہیں ہوا کہ جب آپ یتیم تھے تو خدا تعالیٰ نے آپ کی حفاظت فرمائی۔ جب آپ دوسروں کی طرح بھٹک رہے تھے تو آپ کو سیدھا راستہ دکھایا اور جب آپ غریب و نادار تھے تو آپ کو غنی کر دیا۔ کیا آپ کو ناموری سے سرفراز نہیں فرمایا گیا اور زندگی کے بوجھ کو آپ سے ہلکا نہیں کیا گیا۔ جس شب قدر میں آپ پر پہلے وحی نازل ہوئی وہ ایک ہزار راتوں سے زیادہ افضل تھی اور اس رات کی برکت صبح تک باقی رہتی ہے۔ جس طرح اس رات نازل ہونے والا اسلام ابد تک قائم رہے گا۔ ان لوگوں کے بارے میں جو محمدؐ کو بیٹوں کی وفات اور بیٹیوں کی زندگانی پر طعنہ زنی کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے آپ کو ایک طاقت (کوثر) عطا فرمائی ہے اور آپ نہیں بلکہ آپ کے دشمن یعنی کفار ہی وہ لوگ ہیں جو بے نسل ہو کر رہ جائیں گے۔

محمدؐ (ﷺ) کو فاتحہ کی تعلیم بھی دی جاتی ہے جو ایک سیدھی سادی دعا ہے اور اس میں بتایا گیا ہے کہ عبادت صرف خدائے واحد ہی کی کرنی چاہیے۔

"ہر قسم کی تعریف صرف اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام کائنات کا بادشاہ ہے' رحمٰن ہے' رحیم ہے اور روز قیامت کا مالک ہے۔ اے خدا ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ ہی سے مدد کے خواستگار ہیں۔ ہمیں سیدھا راستہ دکھا دے۔ ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے اپنا فضل و کرم فرمایا نہ کہ ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے غضب نازل کیا۔ یا جو صراط مستقیم سے برگشتہ ہو گئے۔"

یہ ہے مختصر طور پر وہ عقیدہ جو محمدؐ (ﷺ) کے دعوئ نبوت اور اس حیثیت سے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے جانشین ہونے کی تصدیق کرتا ہے۔ یہ ہے وہ اصول جس کو ایک معمولی عقل کا انسان بھی بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ بین طور پر یہ ایک مرکزی نقطہ ہے۔ جس پر مختلف الخیال لوگ مجتمع ہو سکتے ہیں۔ اس کے اصول آسان بھی ہیں اور مہتمم بالشان بھی۔ یعنی خدا کو واحد اور قادر مطلق تسلیم کرنا۔ کائنات کی ہر شے کا خالق گرداننا۔ اور اس پر عقیدہ رکھنا کہ وہ منصب' راست باز' عالم الغیب' غفور الرحیم اور سخی داتا ہے۔

محمدؐ (ﷺ) کے اس سیدھے سادھے اور عام فہم دین نے ان تمام مذہبوں کی جو عرب میں اس وقت رائج تھے' بساط الٹ دی ہے۔ اب اس بات کی حاجت نہیں رہی کہ کوئی شخص دین کے معاملہ میں ذہانت' تخیل سے کام لے کر خیالی تصاویر بناتا پھرے۔ نہ اسے اس بات کی ضرورت رہی کہ وہ ایک خدا کو کئی ٹکڑوں میں تقسیم کرے یا مظاہر قدرت کو کوئی مادی شکل دے کر اس کو معبود بنائے۔ درختوں' ستاروں اور فطری اشکال کی پرستش کھوکھلی معلوم ہونے لگی ہے اور یہی حال دیوتاؤں' دیوؤں' پروہتوں' پجاریوں یا پتھر اور لکڑی کے تراشیدہ بتوں کا ہے۔

اہل عرب کے تخیل میں یہ عقیدہ تو پختہ تھا کہ ان تمام دیوتاؤں سے بالاتر ایک اللہ ہے جو کل کائنات کا خالق ہے۔ محمدؐ (ﷺ) پر جو وحی نازل ہوئی اس نے اس بات پر سب سے زیادہ زور دیا کہ وہ اللہ ایک ہے اور عدیل ہے۔ محمدؐ (ﷺ) کا خدا نہ کبھی پیدا ہوا۔ نہ کبھی اسے موت آئے گی۔ اس کی عظمت و قوت' رحم و کرم کا بیان حدود الفاظ سے باہر ہے۔ اس کی قوت تخلیق فہم انسانی سے بالاتر ہے۔ محمدؐ (ﷺ) کو اپنے آسمانی یا نیم آسمانی مخلوق ہونے کا کوئی دعویٰ نہیں۔ آپ کو نہ شہرت کی خواہش ہے نہ بزرگی و برتری کی۔ آپ کو تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے آپ کو اپنا پیام پہنچا دینے کی خدمت سپرد کی ہے اور آپ اس کے ایک ادنیٰ بندے اور رسولؐ ہیں۔ آپ کی دانست میں اسلام یعنی دائمی امن و سکون۔ خدائے عزوجل کی ایک ایسی نعمت ہے جس کے ذریعے لوگوں کو سربلندی حاصل ہو سکتی ہے۔ چنانچہ آپ اس فریضہ کو بڑی تندہی' مستعدی اور عزم لیکن ساتھ ہی منکسر المزاجی کے ساتھ انجام دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ جس اسلام کی آپ نے دعوت دینی شروع کی ہے اس کے موٹے موٹے اصول یہ ہیں کہ ہر شخص کو خالق ارض و سما کی وحدت' دائمی بقا و قیام' قدرت کاملہ' رحم و کرم' شفقت و محبت پر ایمان رکھنا چاہیے۔ اس کے علاوہ اخوت و مساوات نفس پر تاحد انسانی قابو رکھنا اور خدائے رؤف الرحیم کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ آپ نے یہ بھی بتایا کہ قیامت کا ایک ایسا دن بھی آنے والا ہے جب ہر شخص کے اعمال کا محاسبہ کیا جائے گا۔ لیکن محمدؐ (ﷺ)

باہر نکل کر کوئی طمطراق یا نمائش نہیں کرتے۔ شہرت کا حصول یا اظہار برتری آپ کی طبیعت کا خاصہ ہی نہیں۔ سولہ برس کا زمانہ آپ نے عزلت میں گزرا ہے اور ہر قسم کی تشہیر اور مظاہروں سے دور رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایسی صورت میں دنیا آپ کی باتوں پر یقین کرے گی۔ یا کوچہ و بازاروں میں آپ کو تمسخر اور تضحیک کا نشانہ بنایا جائے گا۔ کیا آپ کو بھی (یسوعؑ کی طرح) کانٹوں کا تاج پہنا کر چوروں کی معیت میں صلیب پر چڑھا دیا جائے گا۔ یا لوگ آپ کو دیوانہ سمجھ کر حقارت سے ٹھکرا دیں گے۔ اس لیے آپ بڑے محتاط طریقے سے آہستہ آہستہ دین کی ترویج فرما رہے ہیں۔

﴿6﴾

محمدؐ (ﷺ) کو اگرچہ اب اپنے پیغمبر ہونے کا یقین کامل ہے اور جو وحی آپ پر نازل ہوتی ہے اسے منجانب اللہ تصور فرماتے ہیں۔ لیکن دین کی اشاعت کے معاملہ میں بڑے حزم اور احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ سب سے پہلے آپ اپنے خاندان کی طرف توجہ فرماتے ہیں۔ تاکہ وہ سب لوگ آپ کی رسالت کو تسلیم کر لیں۔ خدیجہؓ کا ایمان تو پہلے ہی سے پختہ ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ماحول کو دیکھتے ہوئے ضرورت سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ آپ کی اولاد بھی ظاہر ہے کہ اس زمرہ میں شامل ہے۔ اس کے بعد علیؓ کا نمبر آتا ہے جو کہ ابوطالب کے گیارہ سالہ فرزند ہیں اور حضورؐ سے بے انتہا محبت کرتے ہیں۔ خاندان کے دوسرے افراد کی طرح انہوں نے بھی اسلام کی دعوت کو سنا ہے۔ ان کا جوش اور ولولہ انہیں بھی اس حلقہ کی طرف کھینچ لایا ہے۔ جب ان کے ساتھی یہ کہہ کر انہیں چھیڑتے ہیں کہ تمہارے چچا زاد بھائی پاگل ہو گئے ہیں تو وہ ان سے بحث کرتے اور ان کا منہ بند کر دیتے ہیں۔ محمدؐ (ﷺ) کو بھی علیؓ سے بے انتہا انس ہے۔ آپ کو اس ہونہار بچے میں وہ تمام صلاحیتیں نظر آتی ہیں جو کسی فرد کو قوم کا ہیرو بنا دیتی ہیں۔ خدوخال کا حسن، عالی ہمتی، بلند تخیل اور غیر معمولی ذہانت ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ علیؓ کو محمدؐ (ﷺ) کے ہر لفظ پر اعتماد ہے اور اپنی طفلان شہادت کے جوش میں انہوں نے قسم کھا لی ہے کہ خدائے اسلام اور اس کے رسول کی خاطر اپنا خون بہانے میں بھی دریغ نہیں

کریں گے۔

محمدؐ (ﷺ) کے خاندان میں ان سے محبت کرنے والے زیدؓ بن حارث بھی ہیں۔ کسی زمانہ میں وہ غلام تھے اور یثرب کے بازاروں میں ان پر بولی لگ رہی تھی۔ خاتون خدیجہؓ نے ان کو خریدا اور اپنے شوہر محمدؐ (ﷺ) کی خدمت کے واسطے وقف کر دیا۔ چند روز بعد آپ کو ان سے انس پیدا ہو گیا۔ اور بیوی کی اجازت سے انہیں آزاد کر دیا۔ جب زید کے والد اپنے بیٹے کو ساتھ لے جانے کے واسطے آئے تو انہوں نے اپنے سابقہ مالک اور مالکہ سے وفاداری کے باعث ان کے ہمراہ جانے سے انکار کر دیا۔ اور بدستور دونوں کی خدمت کرتے رہے۔

زیدؓ کو بھی محمدؐ کی رسالت کا پورا یقین ہے۔ انہوں نے کبھی آپ کو جھوٹ بولتے سنا نہ کسی سے استفادہ کرتے دیکھا۔ ان کے نزدیک محمدؐ (ﷺ) میں وہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں جو ایک صاف ستھری زندگی کا مابہ الامتیاز ہوتی ہیں۔ ان کے نزدیک یہ بات بالکل ناقابل قبول ہے کہ آپ نے وحی کے متعلق کوئی افسانہ گھڑ لیا ہوگا کہ لوگ آپ کو انبیائے سابقہ کا جانشین سمجھ کر عزت و احترام کرنے لگیں۔ چنانچہ زید کا نمبر اسلام میں شمولیت کے لحاظ سے تیسرا ہے۔

علیؓ کے کردار کا جلد ہی امتحان ہو جاتا ہے۔ ابوطالب کو علم ہوتا ہے کہ علی نہ صرف یہ کہ اپنا تمام وقت محمدؐ (ﷺ) کی معیت میں گزارتے ہیں بلکہ انہوں نے اس نئے عقیدہ پر جان تک قربان کر دینے کی قسم کھا لی ہے اور پھر ایک روز ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ وہ بچشم خود ان چند لوگوں کے ساتھ خضوع خشوع سے عبادت کرتے دیکھ لیتے ہیں۔ جن میں محمدؐ (ﷺ) اور خدیجہؓ بھی شامل ہیں۔

ابوطالب پوچھتے ہیں۔ ''محمدؐ یہ کس قسم کی عبادت ہے؟''

آپ نہایت اطمینان سے جواب دیتے ہیں۔ ''یہ خدائے قدوس کی عبادت ہے جو ہمارے دادا ابراہیمؑ کا دین تھا۔''

ابوطالب کچھ مسکراتے ہوئے دریافت کرتے ہیں۔ ''اور تمہاری اس دین میں

کیا حیثیت ہے؟'' محمدؐ (ﷺ) کو یقین ہے کہ وہ بھی اس مذہب کو اختیار کر لیں گے۔ اس لیے بڑے اعتماد سے فرماتے ہیں'' میں خدا کا رسول ہوں اور آپ کو اس دین میں شامل ہونے کی دعوت دیتا ہوں۔''

ابوطالب کو آنحضرتؐ سے اتنی محبت ہے کہ وہ آپ کی اس بات سے ناراض یا برافروختہ نہیں ہوتے۔ اور بڑے پیار سے کہتے ہیں ''محمدؐ! مجھے علم ہے کہ تم مخلص اور صاف گو ہو۔ تم ہی بتاؤ کہ میں اپنے آباؤ اجداد کا دین کیسے ترک کر سکتا ہوں۔ ہاں میں صرف اس بات کی کوشش کر سکتا ہوں کہ تمہیں اعزاء و اقربا کے غصہ اور برہمی کے مضر اثرات سے محفوظ رکھوں اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک جان میں جان ہے تمہیں ان لوگوں سے کوئی گزند نہیں پہنچنے دوں گا۔''

یہ کہہ کر اپنے لڑکے کا ہاتھ تھامتے ہیں اور کہتے ہیں ''علیؓ میرے ساتھ چلو۔''

علیؓ کے دل نے کچھ تیزی سے دھڑکنا شروع کر دیا ہے۔ رخسار تمتما گئے ہیں۔ اور باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتے ہیں۔ ''ابا جان! یہ بات ناممکن ہے۔ میں نے خدائے وحدہٗ لاشریک اور اس کے رسول کی اطاعت پر قسم کھا لی ہے۔''

ادھر محمدؐ (ﷺ) شفقت سے ان کا ہاتھ تھام کر فرماتے ہیں ''اگر جانا چاہتے ہو تو میری طرف سے اجازت ہے۔''

علیؓ کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک پیدا ہوتی ہے اور وہ کہتے ہیں ''یا رسول اللہؐ ہرگز نہیں۔'' ابوطالب بھی ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور کہتے ہیں۔ ''اگر نہیں جانا چاہتا تو نہ جائے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ تمہارے پاس ہر طرح محفوظ اور خوش رہے گا اور مجھے یقین ہے کہ تم اسے کوئی نامناسب بات نہیں سکھاؤ گے۔''

علیؓ، زیدؓ اور خدیجہؓ کے اسلام لانے سے اسلام کی بنیاد تو پڑ ہی چکی ہے۔ اس لیے اب محمدؐ (ﷺ) اپنے جگری دوستوں پر نظر ڈالتے ہیں۔ عبد اللہ بن ابوقحافہ بچپن ہی سے یارِ غار ہیں۔ ایام طفولیت میں دونوں ایک ساتھ کھیلتے رہے۔ جوانی میں بھی یہی یگانگت قائم رہی اور آج بھی ہمدم و ہمراز ہیں۔ بچپن کے عبد اللہ اب عبد الکعبہ بن گئے

ہیں اور حرم مقدس کے ایک ممتاز کارکن ہیں۔ ان کا پیشہ تجارت ہے اور اللہ نے انہیں بہت کچھ مال و دولت دے رکھا ہے۔ ان کی غیر معمولی دور اندیشی' دیانتداری اور قوت فیصلہ سے لوگ بخوبی آگاہ ہیں۔ پھر دولت کے علاوہ کردار نے قوم میں انہیں بڑی عزت دے رکھی ہے۔ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو احساس ہے کہ اگر وہ آپؐ کے ہمنوا ہو جائیں۔ نئی تحریک میں معتد بہ اضافہ ہو جائے گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کو اس پر آمادہ بھی کر سکیں گے؟ بھلا عبد اللہ ایک سرپھرے دوست کی اس متنازعہ تجویز کو قبول کر کے اپنا عہدہ اور مرتبہ کس طرح چھوڑ سکتے ہیں؟ لیکن چند ماہ بھی نہیں گزرتے کہ وہ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت کو قبول کر کے اسلام لے آتے ہیں۔

آج جو مبلغ دنیا میں اپنے دین کی اشاعت کے لیے مارے مارے پھرتے ہیں۔ وہ جوش ایمان اور عقائد کی پختگی میں ان مسلمانوں کے پاسنگ بھی نہیں کہے جا سکتے۔ اسلام کے بوئے ہوئے بیج بڑی تیزی سے اگ رہے ہیں۔ ہر نووارد جو اس مذہب میں داخل ہوتا ہے۔ اس کا زبردست داعی بن جاتا ہے۔ علیؓ' زیدؓ اور خدیجہؓ بڑی شدومد سے اس کی اشاعت میں معروف ہیں۔ عبدالکعبہ تو ہر گوشہ میں کام کر رہے ہیں۔ اور قریش کی کئی معروف ہستیوں کو حضورؐ کے قدموں تک پہنچا چکے ہیں۔ ان میں نمایاں ترین عبدالرحمٰن بن عوفؓ' سعد ابن ابی وقاصؓ' زبیر بن العوامؓ' طلحہ بن عبد اللہؓ' سعد بن زیدؓ' عبد اللہ ابن مسعودؓ' عمیر بن یاسرؓ ہیں۔ یہ اسلام کی اوّلین فتوحات ہیں۔ تعداد میں زیادہ نہ سہی لیکن خاندان قابلیت اور دنیاوی حیثیت کے لحاظ سے انہیں بڑی اہمیت حاصل ہے۔

اور اس طرح تین سال گزر جاتے ہیں۔ بہت آہستہ آہستہ بعض اوقات بالکل غیر مرئی طور پر محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پیروؤں کی تعداد اپنے خاندان کے افراد سے نکل کر بڑھتے بڑھتے چالیس تک پہنچ جاتی ہے۔ آپ کا زیادہ وقت ان کو تعلیم دینے اور نئے دین کی مبادیات سکھانے میں صرف ہوتا ہے اور اس زمانہ میں آپ کو خوش آئند مستقبل کی ہلکی ہلکی جھلکیاں بھی دکھائی دینے لگتی ہیں۔

.............﴿7﴾.............

محمدؐ (ﷺ) کی تعلیمات ابھی تک ایک خاص حلقہ کے اندر محدود ہیں۔ یعنی آپ کا خاندان، جگری دوست یا وہ چند اصحاب جنہوں نے آپ سے تعاون کیا ہے۔ نہ معلوم پوشیدہ تبلیغ کا دور کب تک جاری رہتا ہے کہ یکایک وحی کے ذریعے آپ کو حکم ملتا ہے کہ اب اعلانیہ لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں۔ آواز سروش کہتی ہے۔

''آپ ان لوگوں کی جماعت کو جنہیں ہم نے دنیاوی نعمتوں سے بہرہ مند کر رکھا ہے نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھئے اور نہ ان پر غم کھایئے۔ ہاں مومنوں کے ساتھ شفقت سے پیش آیئے۔ ان سے کہہ دیجئے کہ میں تو محض عذاب الٰہی سے ڈرانے والا ہوں۔ جس طرح ہم نے ان لوگوں پر عذاب نازل فرمایا۔ جنہوں نے قرآن کو جھٹلایا۔ آپ لوگوں سے صاف صاف کہہ دیجئے کہ آپ تو میرے احکام کے پابند ہیں اور میرے ہی احکام لوگوں تک پہنچانے کی غرض سے مبعوث ہوئے ہیں۔ زمین اور آسمان کو اور جو کچھ ان کے مابین ہے۔ ہم نے ہی پیدا کیا ہے اور یہ سب کچھ حق پر مبنی ہے اور ہم نے آپ کو وہ سات آیات جو بار بار پڑھی جاتی ہیں۔ (یعنی سورہ فاتحہ) اور قرآن عظیم عطا فرمایا ہے، تو آپ اپنے رب کی عبادت کرتے رہیے حتیٰ کہ آپ کو امر یقینی (موت) پیش آجائے۔''

اس وحی کی بناء پر آپ اہل قریش کو فوراً ہی کوہ صفا کے دامن میں اکٹھا کرتے اور پہلی مرتبہ علی الاعلان اسلام کی دعوت دیتے ہیں۔

سب سے پہلے پیغمبر اسلام حاضرین سے دریافت کرتے ہیں۔ ''کیا آپ لوگوں نے کبھی مجھے جھوٹ بولتے دیکھا ہے؟''

جواب میں سب یک زبان ہو کر کہتے ہیں ''کبھی نہیں۔''

پھر آپؐ فرماتے ہیں ''اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک لشکر جرار آپ پر حملہ کرنے اور تباہی مچانے کے واسطے مستور کھڑا ہے تو کیا آپ کو میری بات کا یقین آجائے گا۔''

جواب ملتا ہے "یقیناً" بے شک۔"

تو پھر سنیئے۔ اس کے بعد آپؐ قرآن حکیم کی آیات سناتے ہیں۔ اس کی قرأت لوگوں کو مبہوت کر دیتی ہے۔ عرب گذشتہ ایک صدی سے اپنی نثر و نظم کی فصاحت و بلاغت میں مشہور ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کی شہرت روم اور ہندوستان کے درباروں تک پہنچ چکی ہے۔ ان میں لاتعداد شاعر اور مصنف پیدا ہو چکے ہیں اور ان کا رسم الخط تکمیل کی حد کو پہنچ چکا ہے۔ لیکن محمدؐ (ﷺ) جو کلام انہیں سنا رہے ہیں وہ بالکل ہی مختلف نوعیت کا ہے۔ اس کی خوش کلامی بے مثال' زمزمہ پرداز کی عظیم النظیر اور نفس مضمون بہت اعلیٰ و ارفع ہے۔ انسانی دماغ جو اعلیٰ تخیلات پیش کر سکتا ہے یہ ان سے کہیں بالاتر ہے۔ یہ بیک وقت شیریں بھی ہے اور تلخ بھی' اس سے امیدیں دوبالا ہوتی ہیں۔ وہ بڑے حسین و جمیل نظارے پیش کرتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کو سن کر برق و رعد کی سی کیفیت بھی طاری ہو جاتی ہے۔ پھر اس میں دنیا کی تمام مذہبی کتب کا لب لباب اور موعظمت و حکمت بھی شامل ہے۔

"اپنے پروردگار عالی مقام کی تعریف کیجئے۔ جس نے مخلوق کو بنایا اور پھر اسے تکمیل کو پہنچایا۔ جس نے ہر چیز کا اندازہ لگایا اور پھر راہ دکھائی۔ جس نے زمین سے چارہ اگایا۔ پھر اسے سیاہ کوڑا کر دیا۔ آخرت کی زندگی بہت بہتر اور زیادہ پائیدار ہے۔ بلاشبہ یہ بات پہلے صحیفوں میں بھی بتائی جا چکی ہے یعنی ان کتابوں میں جو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ پر نازل ہوئی تھیں۔

پھر دوسری وحی سناتے ہیں "خدا تعالیٰ کے نام سے جو نہایت بخشش کرنے والا اور مہربان ہے۔ قسم ہے فجر کی اور دس راتوں کی اور جفت و طاق کی اور رات کی جب وہ گزرنے لگے۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آپ کے رب نے عاد اور ثمود اور فرعون کے ساتھ کیا کارروائی کی جن کے زبردست لشکر تھے۔ اپنے رب کی طرف واپس آ جایئے اور برگزیدہ بندوں میں شامل ہو کر جنت میں داخل ہو جایئے۔"

"سورج کی قسم اور اس کی تیز روشنی کی اور چاند کی جب وہ اس کے بعد طلوع

ہو اور دن کی' جب وہ سورج کو نمایاں کرے اور رات کی جب وہ اسے چھپا لے اور آسمان اور اس کے خالق کی' اور زمین اور اس کے پھیلانے والے کی۔ اور انسان کی اور جس نے اسے تکمیل تک پہنچایا...... قسم ہے رات کی جب وہ چھا جائے اور دن کی جب وہ روشن ہو جائے اور اس کی جس سنے نر و مادہ پیدا کیا...... اور جس نے اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور اسی سے ڈرتا رہا۔ اور اچھی بات کو سچ جانا ہم بہت جلد اس کے لیے نیکی کی راہ آسان کر دیں گے۔ لیکن جس نے اسے جھٹلایا۔ تو ہم اس کے واسطے بدی کی راہ پر چلنا آسان کر دیں گے۔ وہ گڑھے میں گرے گا۔ اور اس کی دولت کچھ بھی کام نہ آئے گی۔ اس لیے ہم تمہیں بھڑکتی ہوئی آگ سے خوف دلا رہے ہیں۔"

کچھ لوگوں کے دلوں پر ان باتوں کو سننے سے ہلکا سا خوف طاری ہوتا ہے۔ لیکن زیادہ تر حاضرین آپ کا مذاق اڑاتے ہیں۔ حق اور سچائی کی وسعت تو بے پناہ ہے لیکن اس کو سمجھنے اور اسلام میں داخل ہونے والے تھوڑے ہی ہیں۔

اس کے بعد محمدؐ (ﷺ) علیؓ کو ہدایت فرماتے ہیں کہ قریش کو کھانے کی دعوت دیں۔ چالیس کے قریب اس میں شرکت کرتے ہیں۔ اس کے بعد آپ ان لوگوں کو نئے دین کے متعلق سمجھاتے اور ان کے شک و شبہات دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن عبدالعزیٰ بیچ میں کود پڑتا ہے اور گفتگو کو درمیان ہی میں روک کر کہتا ہے 'محمدؐ! میرا خیال ہے کہ تم نے ہمیں دعوت میں بلایا تھا نہ کہ وعظ میں' رات زیادہ ہو گئی ہے۔ اب ہمیں رخصت کی اجازت دو۔"

اس کے ساتھ ہی مہمان منتشر ہو جاتے ہیں۔ لیکن آپ برداشتہ خاطر نہیں ہوتے' اس طرح کے واقعات تو متوقع ہیں۔ آپ علیؓ سے فرماتے ہیں "تم نے دیکھا کہ عبدالعزیٰ نے کس طرح مجھے بات کرنے سے روک دیا۔ اب ہمیں کل پھر کوشش کرنی ہے انہیں سب کو دوبارہ مدعو کرو۔"

اکابرین قریش پھر جمع ہو گئے ہیں۔ کیونکہ وہ سمجھدار لوگ ہیں اور دعوت میں شرکت سے کبھی انکار نہیں کرتے۔

جب دسترخوان بڑھا دیا جاتا ہے اور مہمان اطمینان سے بیٹھ جاتے ہیں تو محمدؐ (ﷺ) پھر ایک مرتبہ انہیں انسانی مسائل سے روشناس کراتے ہیں۔ معاشرتی زندگی میں معاصی' پھر موت روز حشر' نامۂ اعمال کی پیشی' خدا تعالیٰ کا انصاف اور ترحم' اعمال کی جزا و سزا' نیکو کاروں کے واسطے جنت کا صلہ' جہاں دودھ اور شہد کی نہریں رواں ہوں گی۔ کسی انسان نے کبھی لوگوں کے سامنے اس قسم کی نعمتیں پیش نہیں کیں۔ میں آپ سے اس زندگی میں بھی خوش بختی اور کامیابی کا وعدہ کرتا ہوں اور عاقبت تو اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ چونکہ خدا تعالیٰ نے مجھے آپ لوگوں میں مبعوث فرمایا ہے اس لیے میں آپ کو اسی ہستی کی طرف بلا رہا ہوں جو تمام کائنات کی خالق و مالک ہے۔ آپ میں کون کون میرے ساتھ اس دعوت میں شریک ہو گا۔ کون میرا بھائی' ہمدم یا نائب بننا پسند کرتا ہے۔"

سب خاموش ہیں۔ تمام مہمان ایک دوسرے کو متوحش نظروں سے دیکھتے ہیں۔ کیا کوئی مائی کا لال ایسا ہے جو اس دعوت کو قبول کرے گا؟ کیا کسی میں یہ ہمت ہے کہ وہ محمدؐ کا بھائی' بننے پر آمادہ ہو جائے؟ عبدالعزیٰ دل ہی دل میں ہنستا ہے۔ علیؓ اس پر ایک کڑی نظر ڈالتے ہیں۔ غصہ سے ان کا چہرہ تمتمایا ہوا ہے۔ مقہور نظریں اس پر جمائے ہوئے کہتے ہیں۔ "یا رسول اللہ! میں وہ شخص بنوں گا میں آپ کی تمام مشکلات میں شریک رہوں گا۔ میں آپ کے دشمنوں سے لڑوں گا۔ ان کی مخالفت کا بیڑہ غرق کر دوں گا۔ اور اس تلوار سے آپ کی حفاظت کروں گا۔"

محمدؐ (ﷺ) علیؓ کو سینے سے لگا لیتے ہیں۔ اور اپنے اعزاء سے فخریہ طور پر کہتے ہیں۔ "دوستو! یہ میرا بھائی ہے اور اب معین بھی بن گیا ہے۔

عبد العزیٰ قہقہہ لگاتا ہے اور ابوطالب کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔ "سنو ابوطالب آج سے تمہیں اپنے بیٹے کے احکام کی پابندی کرنی ہو گی۔"

اس برائے نام کامیابی سے نئے پیغمبر کی سرگرمی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ اس پختہ عقیدہ کے ماتحت کہ آپ خدائے قدوس کی رضا کے لیے کام کر رہے ہیں' ہاتھ نہیں روکتے اور قطع نظر اس کے کہ انجام کیا ہو گا۔ اسلام کی تبلیغ کرتے رہتے ہیں۔

قریش کو اپنے دیوتاؤں کا انجام نظر آنے لگا ہے۔ اور وہ اس کے خیال ہی سے لرز رہے ہیں۔ ادھر اکابرین کو اپنی سیادت خطرے میں نظر آ رہی ہے۔ کیونکہ محمدؐ (ﷺ) کی باتوں کو سننے اور مقبول کرنے والوں کا حلقہ وسیع تر ہو رہا ہے۔ قبیلہ میں بہ حیثیت مجموعی آپ کی تبلیغ نے مخالفت اور مخاصمت کے طوفان اٹھا رکھے ہیں۔ صرف ابوطالب ان گنتی کے چند لوگوں میں سے ہیں جو آپ کی سرگرمیوں کو برداشت کر رہے ہیں۔ کیونکہ ان تین سو ساٹھ بتوں کے مقابلے میں جن کی حفاظت ان کے ذمہ ہے۔ انہیں محمدؐ (ﷺ) زیادہ عزیز ہیں۔

سردارانِ قریش یعنی عبد العزیٰ' عتبہ اور ابوسفیان' ابوطالب سے اس معاملہ میں مداخلت کے خواستگار ہیں۔ وہ کہتے ہیں ''ابوطالب! تمہارا بھتیجا ہمارے خداؤں کی تفحیک کرتا ہے۔ ہمارے ولیوں کو جاہل اور انجان گردانتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد غلط راستہ پر گامزن تھے۔ ہم اس لیے آئے ہیں کہ تم سے مداخلت کی درخواست کریں ان سے کہو کہ اپنی اصلاح کر لیں۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوا تو ہمیں خوف ہے کہ قبیلہ میں پھوٹ پڑ جائے گی۔ جس کا انجام اچھا نہ ہوگا۔ وہ اشارتاً یہ بھی جتلا دیتے ہیں۔ کہ اپنے دین کا تحفظ ابو طالبؑ کے ذمہ بھی اتنا ہی عائد ہوتا ہے جتنا خود ان کے ذمہ ہے۔ جاتے جاتے جو لفظ ان کے منہ سے نکلتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں ان کا رویہ کیا ہے ''یا تو تم خود ان سے معاملات طے کرو' ورنہ اجازت دو کہ ہم خود ان سے نبٹ لیں۔''

ابوطالبؑ کو اس معاملہ میں چنداں کامیابی نہیں ہوتی۔ محمدؐ (ﷺ) پر زور الفاظ میں فرماتے ہیں ''میں سوائے خدائے وحدہٗ لاشریک کے کسی دوسرے کی تبلیغ نہیں کر سکتا۔ میری تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ اپنی قوم کو ان غلط راہوں سے آگاہ کروں جن میں وہ بھٹک رہی ہے البتہ اگر وہ یہ کہتے ہیں کہ میں خانہ کعبہ کی بے حرمتی کر رہا ہوں تو یہ ان کی سخت غلط فہمی ہے۔ اس کے برخلاف میں حج کے موقع پر برابر ان کا شریک رہا ہوں۔ یہ بھی غلط ہے کہ میں کسی کے دیوتا کو بُرا بھلا کہتا ہوں۔ کیونکہ قرآن صریح طور پر اس کی

مخالفت کرتا ہے اس کے الفاظ ہیں ''جن کو یہ لوگ اللہ کے سوا معبود کہتے ہیں ان کی مذمت نہ کرو۔'' میں جو بات کہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا جن بتوں کو یہ لوگ پوجتے ہیں۔ وہ انہیں نہ کوئی فائدہ پہنچا سکتے ہیں' نہ نقصان۔'

اس طرح آپؐ بدستور تبلیغ فرماتے رہتے ہیں۔ آپؐ خدائے بزرگ و برتر کی حمد و ثناء بیان کرتے ہیں۔ اور ساتھ ہی بتوں کی بے دست و پائی کی کیفیت بتاتے ہیں۔ آپ کے مواعظ دلوں کو روشن کرتے اور روح کو جلا بخشتے ہیں۔ لیکن اہل عرب کے دماغوں میں معبودوں کی کثرت منقوش ہو چکی ہے۔ اس میں کچھ ایسی کشش ہے جو نئے مذہب میں نہیں ملتی۔ مروجہ مذہب کی عبادات و رسوم اس بازاری عورت کی طرح ہیں جو بھڑک دار لباس پہن کر لوگوں کو اپنی طرف مائل کرتی اور جذبات کو اکساتی ہے۔ برخلاف اس کے نئے دین میں نہ دھوم دھڑکا ہے نہ تکلفات۔ وہ تو ایک سیدھا سادھا' بے تصنع اور عام فہم مذہب ہے۔ قریش کو حرم اور مقامات حج کے متولی ہونے کی حیثیت سے اور اس کے ساتھیوں کی سلطنت میں ایک کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ اس تعلق کے علاوہ مسلمہ توہمات اور عقائد کی بیڑیاں بھی ان کے پاؤں میں پڑی ہوئی ہیں۔ پھر یہ بات بھی انسانی فطرت میں داخل ہے کہ وہ تبدیلیوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ محمدؐ (ﷺ) کی تعلیمات سخت مخالفتوں کا نشانہ بنی ہوئی ہیں۔

پھر ایسے موقعوں پر لوگوں کو جو خطرات نظر آنے لگتے ہیں۔ وہی سردارانِ قریش کے پیش نظر ہیں۔ اس لیے وہ اس نئے داعی دین کی مخالفت میں جس نے ان کی قربان گاہوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے' متفق ہو گئے ہیں۔

قریش کے سردار پھر ایک مرتبہ ابوطالب کے پاس جاتے ہیں اور اس پر تلے ہوئے ہیں کہ کوئی بات حتمی طور پر طے ہو جائے۔ وہ یاد دلاتے ہیں کہ پچھلے موقع پر انہیں کیا دھمکی دی گئی تھی اور بتاتے ہیں کہ حالات کس طرح بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ محمدؐ (ﷺ) کے ساتھیوں میں اضافہ ہوتے دیکھ کر سخت متوحش ہیں۔ اور زور دے کر کہتے ہیں کہ اس کا جلد ہی سدباب ہونا چاہیے۔ کیونکہ اب لوگ محمدؐ (ﷺ) کو کوئی عجوبہ

نہیں سمجھتے بلکہ ان کی باتیں اس طرح سننے لگے ہیں گویا وہ انہیں کوئی بڑا اچھا اور مفید پیام پہنچا رہے ہیں۔ یہ لوگ اس طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ محمدؐ (ﷺ) مذہب کے پردہ میں مکہ پر اپنی سیادت قائم کرنے کی فکر میں ہیں۔ اور اگر اس نو آموز اور خود ساختہ پیغمبر کے کاروبار کو اسی طرح بڑھنے دیا گیا تو گمان غالب یہی ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد کا دین جو ہمیں جان و دل سے پیارا ہے۔ صفحہ ہستی سے مٹ جائے گا۔ ابوطالب دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ اس معاملہ میں بہت سنجیدہ ہیں' بالخصوص جب وہ کہتے ہیں کہ "اگر تم نے اپنے بھتیجے کو خاموش نہ کیا اور ہمارے خداؤں کو بُرا بھلا کہنے پر تنبیہ نہ کی تو ہمیں اپنے خونی رشتوں سے قطع نظر کر کے دیوتاؤں کے تحفظ میں ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہو جانا پڑے گا۔"

ابوطالب جو طبعاً صلح جُو واقع ہوئے ہیں اس وقت سخت کشمکش میں مبتلا ہیں۔ ایک طرف محمدؐ (ﷺ) کی الفت ہے اور دوسری جانب قبیلہ سے وفاداری کا سوال ہے۔ وہ بڑے ملتجانہ لہجہ میں بھتیجے سے کہتے ہیں "اس ضعیفی کے زمانے میں میرے اوپر رحم کرو۔ اور میرے اوپر ایسی ذمہ داریاں نہ ڈالو جن کو میں پورا نہ کر سکوں۔ مجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ پورے قبیلہ کا مقابلہ کر سکوں۔"

ابوطالب آپ کو طرح طرح سے سمجھاتے اور بحث کرتے ہیں۔ لیکن محمدؐ (ﷺ) اپنے فرائض کی ادائیگی میں راسخ اور ثابت قدم ہیں اور ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہوتے وہ فرماتے ہیں کہ "اگر قریش چاند اور سورج کو بھی میرے مقابلے کے لیے لے آئیں تو کوئی فرق واقع نہ ہو گا۔ خدا تعالیٰ نے جو فرض میرے ذمہ عائد کیا ہے۔ میں اسے ہرگز ترک نہ کروں گا۔ انجام کچھ ہی ہو مجھے تو بہرحال یہ کام کرتے ہی رہنا ہے۔"

بوڑھے سردار کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں' وہ محمدؐ (ﷺ) کی پیشانی پر محبت سے بوسہ دیتے اور کہتے ہیں "مجھے یہاں آنے سے پہلے ہی علم تھا کہ تمہارا جواب کیا ہو گا۔ محمدؐ (ﷺ) جب تک میں زندہ ہوں تمہارا ساتھ ہرگز نہ چھوڑوں گا۔"

ابو طالب اپنی اس ناکامیابی کی اطلاع قریش کو دے دیتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی ان سے یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ تم ان کے خلاف جو کارروائی کرنا چاہتے ہو اس میں جلدی نہ کرو انہیں یہ بھی سمجھاتے ہیں کہ ان لوگوں اور ان کے بھتیجے کے اعتقادات میں جو اصولی اختلافات پیدا ہو گئے ہیں ان سے درگذر کریں اور رواداری سے کام لیں۔ محمدؐ ایک قابل احترام شخصیت ہیں اور خود تم لوگوں نے ہی ان کو امین کا لقب دیا ہے۔ اب جو انہوں نے نیا مذہب اختیار کر لیا ہے تو تم سب خواہ مخواہ ان کے خلاف ہو گئے ہو۔"

لیکن قریش ایذا دہی پر کمربستہ ہیں۔ اور اب اس پر عمل پیرا بھی ہو رہے ہیں۔ اس کا سب سے زیادہ اثر آپ کے غریب اور بے نوا معتقدوں پر پڑ رہا ہے۔ اس کی ایک مثال یاسرؓ ہیں جن کی دونوں ٹانگیں دو اونٹوں سے باندھ دی جاتی ہیں اور انہیں مخالف سمتوں میں ہانک دیا جاتا ہے۔ سمیہؓ کے ساتھ بدفعلی کی جاتی اور پھر ان کے پرخچے اڑا دیئے جاتے ہیں۔ بلالؓ حبشی پر سخت زیادتیاں کی جاتی ہیں اور چلچلاتی دھوپ میں جلتی ہوئی ریت پر لٹا کر ایک بڑا وزنی پتھر ان کی ٹانگوں پر رکھ دیا جاتا ہے۔ پیغمبرؐ اور آپ کے ساتھیوں کو بھی طرح طرح کی ایذائیں پہنچائی جاتی ہیں۔ مختلف الزام لگائے جاتے ہیں' بدنامیاں کی جاتی ہیں اور انہیں عبادتوں کے دوران تنگ کیا جاتا ہے اور ان سب حرکتوں میں نفس ناطقہ عبدالعزیٰ ہے۔

انسانی توجہ کو جو چیز سب سے زیادہ اپنی طرف منعطف کراتی ہے وہ جرأت و شہامت اور اس کے ساتھ وہ عزم راسخ ہے جس کو بڑے سے بڑا خوف و خطر بھی متزلزل نہ کر سکے' نہ کسی قسم کی ایذا رسانی اسے باز رکھ سکے۔ ایسی قوت ارادی جو مخالفت اور بندشوں سے اور بھی زیادہ قوی ہو جائے بلکہ ان کی وجہ سے جوش و خروش میں اضافہ ہو جائے۔ شعلے تیزی سے بھڑکنے لگیں اور خطرات کی انتہا ہو جانے پر بھی اس میں کمی واقع نہ ہو۔ پھر جو شخص یہ سمجھتا ہو کہ انسان کی نجات اسی مقصد سے وابستہ ہے جس کے واسطے اس نے خود اپنی جان کی بازی لگا دی ہے۔ اس کی بہادری کا دوسروں پر کیا اثر ہو گا۔ ان کے بچوں میں بھی چنگاریاں سلگ اٹھیں گی۔ چنانچہ آپ کی مقناطیسی کشش ہر جگہ محسوس

ہو رہی ہے۔ نئے مذہب کی تازہ روح لوگوں کے دلوں کو گرما رہی ہے اور آپ کی دعوت دین' بانگ درا کا کام کر رہی ہے۔ قریش نے ایذا دہی کی جو پالیسی اختیار کی ہے اس کے دو نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔ پیغمبر ﷺ اور آپ کے تابعین میں ہمت اور عزم دوبالا ہو گیا ہے اور سامعین کے ایک بڑے طبقہ کو آپ سے ہمدردی پیدا ہو چکی ہے۔ اور وہ آپ کا ہمدرد اور مداح ہو گیا ہے۔

مؤخر الذکر میں سب سے زیادہ نمایاں حیثیت حمزہؓ کو حاصل ہے جو آپ کے چچا ہیں۔ وہ ایک نامور جنگجو ہونے کے علاوہ بڑے باہمت' الوالعزم اور جرأت آزما ہیں اور جس کام کا تہیہ کر لیں۔ اس میں انجام کی پرواہ نہیں کرتے۔ مخالفین کی کثرت کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ لوگ ان کی شجاعت کا لوہا مان چکے ہیں اور اس قدر مرعوب ہیں کہ انہیں ''اسد'' کا خطاب دے رکھا ہے۔ خطرہ کا لفظ ان کے لیے بے معنی ہے۔ دشمن کے سامنے ان کی نظریں جھکتی تک نہیں۔ اور طبل جنگ کی آواز ان کے اوپر جادو کا سا اثر کرتی ہے۔

عبدالعزیٰ اور اس کے ہمنوا قریش نے پیغمبر ﷺ اور آپ کے ہمراہیوں پر ظلم و تشدد روا رکھنے کے علاوہ تضحیک و تذلیل کا سلسلہ بھی شروع کر دیا ہے۔ حمزہؓ کو جب علم ہوتا ہے کہ اس سردار کفر نے آپ کی اہانت کی ہے تو وہ غصہ سے لال پیلے ہو کر اپنی بھاری بھرکم کمان کاندھے پر آویزاں کیے قریش کے مجمع میں پہنچ جاتے اور ابوجہل کو اپنے تیر کا نشانہ بنانا چاہتے ہیں۔ لیکن چند دوستوں کی بروقت مداخلت کام آ جاتی اور اس کی جان بچ جاتی ہے۔

اسی اشتعال کے دوران میں حمزہؓ بآواز بلند اعلان کرتے ہیں ''یا اہل قریش! اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ میں نے تمہارے بتوں کی پوجا آج سے ترک کر دی۔ اب میں بھی انہیں میں سے ایک ہوں۔ یعنی مسلم۔'' حمزہؓ کا ایمان لانا آنحضرت ﷺ کے نزدیک بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن اس کے جلو میں ایک دوسری کامیابی جلد ہی رونما ہونے والی ہے۔ حمزہؓ کے اسلام لانے سے جس درجہ مسلمانوں کے دلوں کو تقویت ہوتی ہے۔

اسی پیمانے پر اہل قریش کے غرور کا سر بھی نیچے جھک گیا ہے۔ کچھ عرصہ تک تو یہ حال رہا کہ وہ اپنے تنفر اور بیزاری کا علانیہ اظہار بھی نہ کر سکے۔ البتہ اب انہوں نے خفیہ طور پر حضورؐ کو ہلاک کر دینے کی سازشیں شروع کر دی ہیں۔ اور اب اس کی جستجو ہے کہ کون ایسا شخص ہو سکتا ہے جو ان تدابیر کو عملی جامہ پہنائے۔ سب کی نظریں عمرؓ پر پڑ رہی ہیں۔

ان کی عمر اس وقت بائیس سال ہے۔ نہایت قد آور اور بے پناہ قوت کے مالک ہیں۔ جلد مشتعل ہو جاتے ہیں۔ اور اس وقت ان کے چہرے پر ایسی خشونت طاری ہو جاتی ہے کہ بہادر سے بہادر شخص بھی زیر آب ہو جائے۔ لوگ دوسروں کی تلوار سے اتنے خائف نہیں جتنے ان کی قوت بازو سے ڈرتے ہیں۔ اسی لیے ان کو اس کام کے واسطے موزوں ترین شخص سمجھا جا رہا ہے۔ سازش، خوشامد، چاپلوسی اور ترغیبوں کے ذریعہ ان کو اس فعل پر آمادہ کر لیا جاتا ہے۔ یہ لوگ ان کی بہادری اور شرافت کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے اور پھر کہتے ہیں کہ یہ ایک ایسا قومی فریضہ ہے جس کو صرف آپ ہی انجام دے سکتے ہیں۔ قریش کا یہ حربہ کامیاب ہو جاتا ہے۔ عمرؓ کو جوش آ جاتا ہے۔ اور وہ کہتے ہیں "میں اس صابی کو ضرور قتل کر دوں گا۔ جس نے قوم کی یکجہتی کو پارہ پارہ کر دیا ہے جو ہمارے دین کو شرمناک بتاتا اور ہمارے دیوتاؤں کی تذلیل کرتا ہے۔"

اور پھر وہ ہتھیاروں سے لیس ہو کر گھر سے اور تیز تیز دراز قدم اٹھاتے گلیوں سے گزرتے ہیں۔ انہیں اس حال میں دیکھ کر بچے تو خیر گھر میں گھس ہی جاتے ہیں۔ بڑے بھی کچھ کم خائف نہیں۔ ان کے چہرے پر خشونت کے آثار اور ہاتھ میں ننگی تلوار کسی عظیم حادثہ کا پیش خیمہ نظر آتی ہے۔ اثنائے راہ میں ایک دوست سے مڈبھیڑ ہوتی ہے اور وہ پوچھ لیتے ہیں "عمرؓ! کدھر کا رخ کر دیا؟ کیا ارادے ہیں؟"

جواب دیتے ہیں "محمدؐ (ﷺ) کے قتل کا ارادہ ہے۔ جو ہمارے بتوں کی مذمت کرتے ہیں۔" دوست مشورہ دیتے ہیں "میری بات مانو، محمدؐ (ﷺ) کو مت مارو ان کا قتل ان کی حیات سے زیادہ مصیبت کا باعث بن جائے گا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ اس

کے بعد بنی ہاشم تمہیں زیادہ عرصہ تک زندہ رہنے دیں گے۔ اس سے زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ تم خود اپنے گھرانے میں جو لوگ مسلمان ہو گئے ہیں۔ انہیں راہِ راست پر لانے کی کوشش کرو۔"

عمرؓ حیرت سے دریافت کرتے ہیں "وہ کون لوگ ہیں؟" جواب ملتا ہے "تمہاری بہن فاطمہ اور ان کے شوہر سعید بن زید۔"

عمرؓ کا غصہ دوسری طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ محمدؐ سے انتقام لینے کا ارادہ ملتوی کر کے اب وہ اپنی ہمشیرہ کے گھر کا رُخ کرتے ہیں۔ صحن میں داخل ہوتے ہی ان کے کانوں میں بہن کی آواز آتی ہے جو کچھ پڑھ رہی ہیں۔ وہ ٹھٹک کر رہ جاتے ہیں اور سننے لگتے ہیں "میرا رب ہر شے پر قادر ہے۔"

انہیں آتا دیکھ کر فاطمہ اس کاغذ کو جس پر سورۃ لکھی ہوئی ہے۔ زانو کے نیچے دبا لیتی ہیں۔ عمرؓ کا پارہ اس وقت تک کافی چڑھ چکا ہے۔ اندر آ کر وہ غصہ سے دریافت کرتے ہیں۔ "یہ میں کیا سن رہا ہوں؟"

بہن بات ٹالنے کے لیے کہتی ہیں "تم نے کچھ بھی تو نہیں سنا۔ محض خیال ہی خیال ہے۔" عمرؓ گرجتے ہیں "میں بہرا تو نہیں ہوں۔ کیا یہ صحیح ہے کہ تم نے اسلام قبول کر لیا ہے۔" اب ان کی نظریں سعید پر گڑ جاتی ہیں اور یہ کہہ کر تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ تلوار چمکاتے آگے بڑھتے ہیں۔ لیکن فاطمہ بھائی کا ہاتھ تھام لیتی ہیں اور تلوار بلا کسی کو نقصان پہنچائے پتھر کے فرش سے ٹکرا جاتی ہے۔ اب وہ سعید سے لپٹ جاتے ہیں۔ لیکن فاطمہ بیچ میں آ جاتی اور زخمی ہو جاتی ہیں۔ ان کا خون زمین پر گرتے دیکھ کر عمرؓ اپنا ہاتھ روک لیتے اور سعید کو چھوڑ دیتے ہیں۔

اس وقت فاطمہ جوشِ ایمانی سے سینہ سپر ہو کر کہتی ہیں "ہاں عمرؓ! یہ واقعہ ہے کہ ہم مسلمان ہو گئے ہیں۔ ہم اللہ اور اسکے پیغمبر ﷺ پر ایمان لے آئے ہیں۔ اب تمہیں جو کچھ کرنا ہے کر گزرو۔" عمرؓ مردوں سے تو بارہا لڑ چکے ہیں۔ لیکن عورتوں پر ہاتھ اٹھانا مردانگی سے بعید نظر آتا ہے۔ اس لیے ان کا غصہ یک دم فرو ہو جاتا ہے اور وہ بہن سے

کہتے ہیں "لاؤ میں بھی تو دیکھوں کہ تم کیا پڑھ رہے تھے۔"

"مگر تم اسے پھاڑ دو گے تو نہیں۔"

"نہیں۔ میں قسمیہ کہتا ہوں کہ ایسا نہ ہو گا۔ میں پڑھ کر کاغذ تمہیں واپس کر دوں گا۔" عمرؓ قسم کے بڑے پکے ہیں اس لیے کاغذ مل جاتا ہے۔ وہ فاطمہ کے بستر پر بیٹھ جاتے اور پڑھتے ہیں۔

"طٰہٰ! ہم نے یہ قرآن تمہارے اوپر اس لیے تو نازل نہیں کیا ہے کہ تم مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ۔ یہ تو ہر ایک شخص کی آنکھیں کھولنے کے لیے ہے جو ڈرتا ہے۔ یہ اس ذات پاک کی طرف سے نازل ہوا ہے جس نے زمین کو پیدا کیا اور آسمانوں کو بلند کیا۔ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اس لیے میری ہی عبادت کرو اور میری ہی یاد کے لیے نماز قائم کرو۔ کسی کا خوف نہ کرو۔ میں تمہاری پشت پناہی کروں گا۔ میں دیکھنے اور سننے والا ہوں۔" وغیرہ۔

ان کی خشونت یکا یک ایک نئے ولولے کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ ان کے منہ سے بے ساختہ نکلتا ہے۔ "کیا خوب کلام ہے' کیسی عمدہ باتیں ہیں۔ محمدؐ (ﷺ) کہاں ہیں۔ ان کے پاس چلنا چاہیے۔" چنانچہ وہ سیدھے صفا پہنچتے ہیں جہاں ایک مکان میں حضورؐ قریش کی جور و جفا سے مجبور ہو کر مقیم ہو گئے ہیں۔ پیغمبر ﷺ ایک جماعت کو تلقین فرما رہے ہیں جو بڑے غور سے آپ کا لفظ لفظ سن رہی ہے۔ عمرؓ جیسے ہی آتے ہیں۔ حمزہؓ عبدالکعبہؓ اور علیؓ انہیں پہچان لیتے ہیں۔ دوسرے لوگ دیکھنے کے واسطے بڑھتے ہیں اور انہیں سر سے پاؤں تک مسلح دیکھ کر دم بخود رہ جاتے ہیں۔ ان کو حضورؐ کی جان خطرہ میں نظر آتی ہے۔ اس لیے وہ سب کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لیکن آنحضرت ﷺ کو مطلق کوئی خوف نہیں ہوتا۔ عمرؓ جیسے ہی سامنے آتے ہیں آپ وعظ کو درمیان ہی میں روک کر ان کے پاس پہنچتے اور ایک دوست کی طرح ان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

آپ فرماتے ہیں "اللہ کا شکر و احسان ہے۔ کل ہی میں نے خدا سے دعا کی تھی کہ اسلام کو عمرو بن ہشام یا عمر بن الخطاب کے ذریعے تقویت عطا فرما۔ اللہ بڑا

کارساز ہے۔ اس نے عمرؓ کو بھیج دیا" یہ کہہ کر آپؐ اپنا دست مبارک اُن کے ہاتھ پر رکھتے اور فرماتے ہیں "عمرؓ جب تک چاہو ہمارے ساتھ رہو۔"

عمرؓ کہتے ہیں "میں یہاں اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لانے کی خاطر حاضر ہوا ہوں۔" اس اعلان سے ایک ہیجان برپا ہو جاتا ہے اور اللہ اکبر کے نعرے لگنے لگتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ یہ کہہ کر کہ "تم میرے بھائی ہو۔" انہیں سینے سے لگا لیتے ہیں۔ پھر تو ہر شخص ان کی اسی طرح تواضع کرتا ہے۔ ان کے اسلام لانے سے تمام مسلمانوں میں ایک غلغلہ مچ گیا ہے۔

یہ اسلام کی پہلی فتح ہے اور ایک معجزہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے بدترین دشمنوں کا یکایک پرجوش مسلمان بن جانا خاک کے ذرات کا خالص سونے میں تبدیل ہو جانے سے کہیں زیادہ حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے۔ اسلام کا پیام کیسا بن گیا ہے۔ حضرت عمرؓ کا مسلمان ہو جانا کئی صورتوں سے اہم ہے۔ سب کو علم ہے کہ وہ اس نئے دین کے سخت دشمن ہیں۔ یہ بھی معلوم ہے کہ حضور کے قتل کی سازش میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ لیکن اب وہ یکایک حضورؐ کے سامنے آتے اور اسلام کے معتقد ہو جاتے ہیں۔ اور آنحضرت ﷺ کیا کرتے ہیں؟ کیا آپ ان سے کوئی ضمانت طلب کرتے ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ درپردہ حضورؐ کی جان کے درپے ہوں؟ کیا عمرؓ مخلص ہیں؟ آج تک تو وہ بڑے خضوع و خشوع کے ساتھ بتانِ کعبہ کے آگے سجدہ ریز رہا کرتے تھے۔ بت پرستی کے تمام مراسم ادا کرتے اور مسلمانوں کا مذاق اڑاتے تھے۔ لیکن آنحضرت ﷺ نہ ان سے کچھ سوال کرتے، نہ کوئی امتحان لیتے ہیں، نہ کوئی شرائط عائد کرتے ہیں، نہ کوئی احتیاط برتتے ہیں۔ بس اتنا کافی ہے کہ عمرؓ خدائے وحدہٗ لاشریک پر ایمان لے آئے ہیں۔ محمدؐ (ﷺ) ان کے خیالات کو پڑھنے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ کیونکہ اب ان کا ضمیر جانے اور خدائے قدوس۔

عمرؓ جس طرح حلقۂ اسلام میں ہاتھوں ہاتھ لیئے گئے اس نے ایک مثال قائم کر دی ہے کہ نومسلموں کا اس طرح خیرمقدم ہوتا ہے۔ اسلام قبول کرتے ہوئے کسی

شخص کو اپنے خاندان یا قبیلہ سے بھلے ہی قطع تعلق کرنا پڑے لیکن وہ مسلمانوں کے وسیع خاندان کا ایک رکن بن جاتا ہے جس میں بہت زیادہ یکجہتی' بھائی چارہ اور وسعت نظر آتی ہے۔ اس میں نہ رنگ و نسل کی تفریق ہے' نہ مرتبہ و مال کی۔ پہلے خواہ اس کی کچھ بھی حیثیت ہو۔ لیکن اسلام قبول کرنے کے بعد اسے حضورؐ (ﷺ) کے ساتھ بیٹھنے' ایک ہی برتن میں کھانے اور بڑے سے بڑے سردار کے ہم پہلو عبادت کرنے کی اجازت حاصل ہو جاتی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے خدا سے عمر بن ہشامؓ اور عمر بن الخطابؓ کے متعلق جو دعا مانگی تھی اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اسلام کی ترقی کے واسطے خدا سے التجا کی جائے کہ اس میں سب سے زیادہ ذہین' بہادر اور مخلص بندوں کو داخل ہونے کی ہدایت فرمائے۔

پیغمبر ﷺ کو اس امر سے کوئی واسطہ نہیں کہ پہلے اس شخص نے اسلام کی کتنی مخالفت کی تھی یا کتنا مذاق اُڑایا تھا۔ اگر اس کا کردار بلند ہے یا وہ ذہانت اور بہادری کی صفات سے متصف ہے تو آپ اسے اسلام کے واسطے منتخب فرما لیتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے اسلام میں صرف بہترین لوگوں ہی کی گنجائش ہے۔ پھر یہ لوگ اپنے ہی جیسے اشخاص کو اپنی طرف مائل کر لیتے ہیں۔ اور ایک ایسا جتھا بن جاتا ہے جس کو مخالف طاقتیں مغلوب نہیں کر سکتیں۔ صدیاں گزر جاتی ہیں لیکن یہ معیار قائم رہتا ہے۔

............﴿8﴾............

اب محمدؐ (ﷺ) کو دعوت دیتے چھٹا برس شروع ہو رہا ہے۔ آپ کے متبعین کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ ابوطالب ابھی تک اپنے قول کے مطابق قریش کے خونخوار بھیڑیوں کو آپ پر حملہ کرنے سے روکے ہوئے ہیں۔ لیکن کفار کی طرف سے مسلمانوں کی ایذ دہی ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہے۔ گالی گفتار' لعن طعن' ظلم و تشدد روزمرہ کا معمول بن گئے ہیں۔ خود حضورؐ کی ذات بھی ان سے محفوظ نہیں۔ عبدالعزیٰ اور ان کی بیوی اُمّ جمیل نے جو قریش کے سردار ابوسفیان کی بہن ہے آپؐ کی طرف پوری توجہ مبذول کر رکھی ہے۔ عبدالعزیٰ ہر جگہ سایہ کی طرح آپ کے پیچھے لگا رہتا ہے۔ اور کہتا

رہتا ہے کہ آپ دروغ گو اور گندہ دین (معاذ اللہ) ہیں۔ اُمّ جمیل اپنے ہی حربے استعمال کرتی اور آپ کے راستہ میں کانٹے اور خاردار جھاڑیاں بچھاتی رہتی ہے۔ لیکن آپؐ صبر اور خندہ پیشانی سے ان سب کو برداشت فرماتے ہیں۔ وحی کے ذریعے سے حضورؐ کو ان کا انجام بتا دیا گیا ہے کہ یہ دونوں دوزخ کا ایندھن بنیں گے۔ اور اس آیۃ کی بنا پر ہی اسے ابولہب کا متبدل لقب بھی حاصل ہو گیا ہے۔

اس دور ابتلاء میں محمدؐ (ﷺ) کو احساس ہوتا ہے کہ انہیں ہر شخص کی خدمت درکار ہیں۔ لیکن اپنے معبود حقیقی کی طرح آپؐ بھی رحیم اور نرم دل واقع ہوئے ہیں۔ آپ کو یہ دیکھ کر سخت قلق ہوتا ہے کہ آپ کی وجہ سے دوسروں کو تکلیف پہنچ رہی ہے۔ اگر آپ حکم خداوندی کے تابعدار نہ ہوتے تو یقیناً پیغمبری کے منصب سے مستعفی ہو چکے ہوتے۔ آپ کو اپنے بچپن کا وہ زمانہ یاد آتا ہے جب ہر طرح کی بے فکری تھی۔ اس زمانہ کا خیال آتا ہے' جب شادی ہوئی تھی۔ آپ کو نہ تو اس وحی کے مستقبل کا فکر ہے جو خدا تعالیٰ آپ کی وساطت سے لوگوں تک پہنچا رہا ہے۔ کیونکہ خدائے قدوس خود اس کا محافظ ہے' نہ خود اپنے متعلق کوئی اندیشہ ہے کیونکہ اللہ آپ کا بھی اسی طرح تحفظ کرے گا۔ ہاں فکر ہے تو صرف ان آلام و مصائب کی جن میں آپ کے صحابہ مبتلا ہیں۔

موقع کی نزاکت ہمت و جرأت کی متلاشی ہے۔ چنانچہ فیصلہ کر لیا جاتا ہے۔ آپ نے طے کر لیا ہے کہ جو لوگ اپنی جان کی حفاظت کے واسطے باہر جانا چاہتے ہوں۔ انہیں اجازت دے دی جاتی ہے۔ چنانچہ آپ اپنے ہمراہیوں کو جن کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ فرداً فرداً بلاتے اور مشورہ دیتے ہیں کہ وہ حبشہ کو ہجرت کر جائیں۔ جہاں کا فرمانروا ایک عادل اور باضمیر شخص ہے۔

آپؐ ان سے فرماتے ہیں "اس ملک کا بادشاہ نجاشی ایک مثالی حکمران ہے اور کسی کو خواہ مخواہ نقصان نہیں پہنچاتا۔ مجھے امید ہے کہ وہاں تمہارا معقول طریقے سے خیر مقدم ہو گا اور تمہارے ساتھ رواداری اور مہمان نوازی کا سلوک کیا جائے گا۔ وہاں پر اس وقت تک قیام کرنا جب تک خدائے رحمٰن تمہاری واپسی کی معقول سبیل نہ پیدا کر

دے۔"

چنانچہ چند روز بعد مہاجرین کی دو جماعتیں خفیہ طور پر سمندر پار کر جاتی ہیں۔ ان بے خانماں افراد میں پیغمبر ﷺ کی دختر رقیہؓ اور ان کے شوہر عثمانؓ بھی شامل ہیں۔ حبشہ پہنچنے پر یہ لوگ دربار میں پیش ہوتے ہیں اور ان سے تحفظ کا وعدہ کر لیا جاتا ہے۔

لیکن عثمانؓ اور انکی جماعت کو مکہ سے رخصت ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوتا کہ اہل قریش کو اس ہجرت کا پتہ چل جاتا ہے۔ وہ فوراً مجلسِ شوریٰ منعقد کرتے ہیں۔ جس کی رائے میں یہ کل کارروائی نجاشی کی امداد حاصل کرنے کے لیے کی گئی ہے۔ اس لیے وہ اس پر متفق ہو گئے ہیں کہ اس کا توڑ فی الفور ہو جانا ضروری ہے۔ چنانچہ نجاشی کی خدمت میں ایک وفد بھیجنے کا انتظام کیا جاتا ہے اور عثمانؓ کے عقب میں بھی عبداللہ بن ربیعہ اور عمرو بن العاص کو حبشہ کی طرف روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اب نجاشی کے سامنے ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ قریش کے سفیروں کا مطالبہ ہے کہ ان لوگوں کو اس جرم میں کہ انہوں نے مکہ میں ان کے آباؤ اجداد کے مذہب کی توہین کی ہے۔ اور ایک خطرناک نوآمد (معاذ اللہ) کا ساتھ دے رہے ہیں' ملک سے نکال دیا جائے۔ نجاشی کو خوش کرنے کے لیے وہ یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ اگر یہ لوگ عیسائی ہو جاتے تو انہیں معاف کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اب تو یہ مرتد ہیں۔

مکہ کے سفیروں نے مقامی پادریوں کو کچھ دے دلا کر گانٹھ لیا ہے اور وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا اخراج لازمی ہے۔ وہ بادشاہ کو مشورہ دیتے ہیں کہ ہمیں خواہ مخواہ اہل مکہ کو دشمن بنا لینے سے احتراز کرنا چاہیے۔ محمدؐ (ﷺ) ہمارے کون لگتے ہیں کہ ان کے ساتھیوں کو پناہ دی جائے۔

لیکن اہل مکہ اور خود اپنے مشیروں کی مرضی کے خلاف نجاشی ان پناہ گزینوں کو بلا بھیجتا ہے اور سرِ دربار ان سے سوال کرتا ہے "تمہارا یہ نیا مذہب کیا ہے۔ جس کی خاطر تم نے اپنے آباؤ اجداد کے دین کو چھوڑ دیا ہے اور نہ میرا مذہب اختیار کیا نہ دوسروں کا؟" اس موقع پر حضرت علیؓ کے خوبرو بھائی جعفر طیارؓ مہاجروں کی ترجمانی اس طرح

کرتے ہیں۔

''جلالت مآب' ہم ایک جاہل قوم تھے۔ بتوں کو پوجتے اور مردار کھاتے تھے۔ ہر قسم کی بدکاریاں کرتے اور ہمسایوں کو ستاتے تھے۔ بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا۔ جو طاقتور تھا وہ کمزوروں کو کھائے جاتا تھا۔ اس دوران اللہ نے خود ہم میں سے ایک پیغمبر پیدا کر دیا۔ جن کا اسم مبارک محمدؐ بن عبداللہ ہے۔ اور جو ہمارے شریف النفس سردار عبدالمطلب کے پوتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں اسلام کی دعوت دی اور ہمیں یہ سکھایا کہ بتوں اور پتھروں کی پوجا ترک کر دیں۔ اور صرف خدائے واحد کی عبادت کریں جو کل کائنات کا خالق ہے۔ انہوں نے ہمیں سچ بولنے' وعدہ وفا کرنے' رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے' ایماندار اور انصاف پسند بننے کی تلقین فرمائی اور ان باتوں سے منع فرمایا کہ بے گناہوں کا خون بہائیں۔ بدکاری کے مرتکب ہوں۔ یتیموں اور بیواؤں کی جائیدادیں غصب کر لیں۔ باعصمت و پاکدامن عورتوں پر تہمت نہ لگائیں۔ انہوں نے ہمیں نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے اور روزہ رکھنے کی بھی ہدایت فرمائی ہے۔ ہم نے ان تمام باتوں کو قبول کیا اور ان پر ایمان لے آئے۔ شرک اور بت پرستی چھوڑ دی اور تمام بُرے اعمال سے توبہ کر لی۔ اس پر ہماری قوم دشمنی پر کمر بستہ ہو گئی اور اس حد تک ایذا رسانی کی کہ وطن میں قیام اور مذہب پر کاربند ہونا دوبھر ہو گیا۔ اس وقت ہمارے پیغمبرﷺ نے ہم کو ہدایت کی کہ آپ کے سایۂ عدل میں آ کر پناہ لیں۔ چنانچہ ہم یہاں آ گئے ہیں اور اب آپ کے رحم و انصاف کے طالب ہیں۔''

بادشاہ اور اس کے درباریوں کو اس جھگڑے سے تو کوئی دلچسپی نہیں لیکن جعفرؓ کی تقریر نے ان کے دلوں پر کافی اثر کیا ہے۔ چنانچہ وہ ان سے دریافت کرتا ہے ''اللہ کی طرف سے تمہارے پیغمبر پر جو وحی آتی ہے وہ تم اپنے ساتھ یہاں لائے ہو؟''

جعفرؓ جواب دیتے ہیں ''بے شک! حضور والا۔''

''اس میں سے مجھے کچھ پڑھ کر سناؤ۔''

جعفرؓ اپنی عبا میں سے ایک مثنا نکالتے ہیں اور بادشاہ چہرہ کو ہاتھوں کا سہارا

دے کر ہمہ تن گوش سننے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

جعفرؓ کہتے ہیں کہ میں سورۃ مریم کی تلاوت کروں گا۔ اور جب وہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہتے ہیں تو نجاشی دریافت کرتا ہے کہ اس کا کیا مطلب ہوا۔ جعفرؓ جواب دیتے ہیں۔ شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو نہایت رحم والا اور مہربان ہے۔

اس کے بعد وہ سورۃ شروع کر دیتے ہیں۔ کھیٰعص! اور آخر تک ایک ایک آیۃ کا مطلب اور معنی بیان کرتے جاتے ہیں۔ نجاشی قرآن کی قرأت اور مطالب دونوں سے مسحور ہو جاتا ہے اور عمرو سے مخاطب ہو کر کہتا ہے "یہ سب کچھ تو یسوع کی تعلیمات سے بالکل مشابہہ ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں ان مہاجرین کو تمہارے حوالے نہیں کر سکتا انہیں میرے ملک میں رہنے اور اپنے طور پر عبادت کرنے کی مکمل آزادی ہے۔"

اس پر جعفرؓ اس کا شکریہ ادا کرتے اور وفادار رعایا کی طرح حبش میں رہنے کا وعدہ فرماتے ہیں۔ لیکن مکہ کے سفیروں کا حلیہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے' ان کے چہروں پر مایوسی کی جھلک صاف نظر آرہی ہے۔

﴿9﴾

جیسے جیسے اسلام کی ترقی ہو رہی ہے دشمنانِ دین حضورؐ کی جان کے زیادہ دشمن ہوتے جاتے ہیں۔ کچھ اور لوگ بھی حبشہ کی جانب ہجرت کر جاتے ہیں۔ اور اب صرف آنحضرت ﷺ اور آپ کے چند مخلص پیچھے رہ گئے ہیں۔ اس لیے ابوطالب کو آپ کی زندگی خطرہ میں نظر آنے لگی ہے اور وہ حضورؐ کو مشورہ دیتے ہیں کہ شہر کے باہر ایک قلعہ میں پناہ گزیں ہو جائیں۔

قریش ان سے پھر مطالبہ کرتے ہیں کہ اپنے بھتیجے کو ہمارے حوالے کر دو۔ اور پھر بالآخر بنو ہاشم کے تمام خاندان سے مقاطعہ کر لیتے ہیں۔ ابوطالب اور کل بنو ہاشم کو شہر سے باہر ایک قلعہ میں محصور ہو جانا پڑتا ہے۔ چونکہ مقاطعہ کا فیصلہ قبیلہ قریش کی طرف سے ہوا ہے۔ اس لیے عرب کی تمام قوم کو ان سے لین دین کرنے' تعلقات قائم رکھنے' قرابت داری کرنے یا کوئی شے مہیا کرنے کی ممانعت کر دی جاتی ہے۔ اور لوگوں کو بتا دیا

جاتا ہے کہ یہ عمل اس وقت تک جاری رہے گا جب تک قوم کے دشمن اور خطرناک راہنما کو ان کے حوالے نہ کر دیا جائے۔ یہ اعلان ایک موٹی کاغذ پر لکھ کر کعبہ کے دروازے پر آویزاں کر دیا جاتا ہے۔ تاکہ ہر شخص اس کو پڑھ لے اور واقف ہو جائے۔

محمدؐ (ﷺ) کو دعوت اسلام دیتے ہوئے سات برس گذر چکے ہیں۔ اب آپ کی عمر چھیالیس سے پچاس برس کی طرف بڑھ رہی ہے۔ خاتون خدیجہؓ ساٹھ برس سے اوپر ایک سن رسیدہ عورت ہیں۔ لیکن ان کی شان اب بھی بہت ارفع ہے۔ وہ اس وقت بھی اپنے شوہر کا اتنا ہی خیال رکھتی ہیں۔ جتنا بیس برس پہلے رکھا کرتی تھیں۔ اس وقت آپ نوجوان، وجیہ، باأثر اور ہردلعزیز تھے۔ اور تازہ خون آپ کی رگوں میں رواں تھا۔ اب آپ کے بالوں میں سفیدی نمایاں ہونے لگی ہے۔ عمر کے ساتھ مصائب کی کثرت نے پیشانی پر کچھ شکنیں پیدا کر دی ہیں اور اب آپ کو برادری سے بھی خارج کر دیا گیا۔ تمام عرب آپؐ سے متنفر ہے اور آپ کو اپنے ہم قوموں کے جوش انتقام سے بچنے کے لیے اس قلعہ میں محصور ہونا پڑ رہا ہے۔ پیغمبری کے سات سال نے ابھی تک کامیابی کی حدود کو نہیں چھوا۔ یہ درست ہے کہ آپ نے کچھ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا لیا اور ایک ہلچل پیدا کر دی ہے۔ لیکن دنیاوی نقطۂ نظر سے آپ کی تحریک غیر مؤثر اور بڑی حد تک ناکامیاب ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان ناکامیوں اور نارسائیوں کی وجہ سے خدیجہؓ کے اعتقادات میں کمی یا شوہر سے تعلقات میں کوئی خرابی واقع ہوئی ہے۔ کیا انہیں بالآخر آپؐ کے فائز المرام ہونے میں کوئی شک ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کا یہ یقین پختہ ہوتا جاتا ہے کہ ایک زمانہ آئے گا جب بالآخر آپ کو کامیابی حاصل ہو گی۔ ممکن ہے کہ ان کی زندگی میں ایسا نہ ہو سکے۔ لیکن وہ وقت دور نہیں جب اسلام کا ہر جگہ بول بالا ہو گا۔ چنانچہ اس دور ابتلاء میں وہ محمدؐ (ﷺ) کے لیے بہت بڑا ذریعۂ سکون اور ڈھارس ہیں۔ اور آپ کو تسلی و تشفی دیتی رہتی ہیں۔ جس کی بہت کم بیویوں کو توفیق ہوا کرتی ہے۔ جب آپ کو دنیا کی طرف سے مایوسی کا سامنا ہوتا ہے تو وہ انہیں امیدوں کے چراغ دکھاتی ہیں۔ جب دنیا آپ سے نفرت کا اظہار کرتی ہے تو وہ محبت

کے جوت جگاتی ہیں۔ اور جب لوگ آپ کے ساتھ حقارت کا سلوک کرتے ہیں تو وہ ان پر فخر کرتی ہیں۔ محمدؐ (ﷺ) کو بھی ان سے بے پناہ محبت ہے۔ اور آپؐ نے اپنے دل کے نہاں خانہ میں انہیں ایک اونچی جگہ دے رکھی ہے۔ آپؐ کے نزدیک وہ محض ایک وفادار بیوی یا بچوں کی والدہ ہی نہیں بلکہ ایک یار غمگسار بھی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اسلام کا ایک مضبوط قلعہ اور اس کی تبلیغ کا ایک مضبوط و مستحکم ستون بھی ہیں۔

﴿10﴾

تین سال اور گذر جاتے ہیں۔ لیکن مصیبت اور ابتلاء کے اس دور میں بڑے بڑوں کے قدم متزلزل ہو گئے ہیں لیکن جب لوگوں کے عزم راسخ' ارادے پختہ اور یقین محکم ہوتے ہیں وہ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ جمے رہتے ہیں۔ تین سال کا یہ زمانہ جلا وطنی' رہائش کی تکلیف' احتیاج اور فاقہ کشی کا دور ہے۔ اسلام ایک جگہ پہنچ کر ٹھپ ہو گیا ہے' قریش نے اس کے سرچشمے کو نہایت کامیابی سے ایک جگہ محصور کر دیا ہے' صرف ایام حج میں جب جنگ وجدل موقوف ہو جاتی ہے آپ کو باہر نکلنے اور دین کی اشاعت کا موقع ملتا ہے۔ اور اس وقت بھی ابولہب سایہ کی طرح آپ کے ساتھ ساتھ پھرتا اور لوگوں کو آپؐ کے متعلق طرح طرح کی نامعقول باتیں کہہ کر برگشتہ کرتا رہتا ہے۔ اہل مکہ نے اللہ کے خلاف دلوں پر آہنی غلاف چڑھا رکھے ہیں۔ لیکن پیغمبرﷺ کو پھر بھی موقع مل جاتا ہے کہ باہر سے آنے والے حاجیوں کے سامنے اسلام کی خوبیاں بیان کریں اور یثرب سے آنے والے زائرین آپ کی باتوں کو بالخصوص بڑی توجہ سے سنتے ہیں۔

مقاطعہ اب بھی جاری ہے۔ کشمکش نقطۂ عروج پر پہنچ چکی ہے۔ لیکن بعض وجوہات کی بناء پر اہل قریش کھلم کھلا تصادم سے گریز کر رہے ہیں۔ بنو ہاشم کے اخراج نے پورے خاندان کی سرگرمیوں اور روزمرہ کاروبار کو معطل کر رکھا ہے۔ اگر معاملہ صرف محمدؐ (ﷺ) کی ذات تک محدود ہوتا تو ہر شخص مطمئن ہو جاتا۔ لیکن پورے خاندان سے قطع تعلق بعض لوگوں کو اس واسطے سے بھی ناگوار گزر رہا ہے کہ ان کے درمیان مناکحتی رشتہ داریاں قائم ہیں۔ اور بعض سلیم الطبع لوگ یہ بھی کہتے نظر آتے ہیں کہ

قصور صرف ایک فرد واحد کا ہے اور سزا یہ سب ناکردہ گناہ بھگت رہے ہیں۔ لیکن دوسری طرف یہ بھی درست ہے اگر پورا خاندان جس میں محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے پناہ دہندہ ابوطالب شامل ہیں اس کی زد میں نہ آتا تو مقاطعہ ہرگز کامیاب نہ ہوتا۔ ان حالات کے تحت قریش خانہ جنگی سے گریز کر رہے ہیں۔ انہوں نے بات تو اچھی طرح معلوم کر لی ہے کہ ان کا یہ حربہ ناکام ہو چکا ہے۔ اس لیے اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے دوسرا ہی طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جہاں سختی سے کام نہیں چلتا وہاں لالچ و طمع کارگر ہو جاتا ہے۔

ایک دن محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کعبہ کے اندر معاندین و مخالفین سے کچھ فاصلہ پر قیام فرما ہیں۔ اس موقع پر سرداروں میں سے ایک شخص عتبہ بن ربیعہ آپ سے بات کرنے کے لیے آتا ہے اور یوں مخاطب ہوتا ہے۔

''محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں تمہارے والد صاحب کا دوست ہوں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو بھائیوں کی طرح چاہتے تھے۔ تمہیں عبداللہ کا فرزند ہونے کی حیثیت سے ایک خاص شرف حاصل ہے۔ ہمیں تمہاری ذاتی خوبیوں کا بھی اعتراف ہے لیکن تم نے اپنی قوم میں تفریق اور مخالفت کے جو بیج بو دیئے ہیں اور ان خاندانوں میں جو اب تک ہنسی خوشی سے زندگی بسر کرتے تھے' افتراق اور نزع پیدا ہو گیا ہے۔ تم ہمارے دیوتاؤں اور دیویوں کی مذمت کرتے اور ہمارے بزرگوں کو کافر قرار دیتے ہو۔ اب ہم تمہارے سامنے ایک تجویز پیش کرتے ہیں۔ اگر اسے قبول کر لو تو بڑے فائدے میں رہو گے۔

آپؐ دریافت فرماتے ہیں کہ وہ کیا تجویز ہے۔

''اگر تمہارا مقصد اس جھمیلے سے دولت جمع کرنا ہے تو ہم تمہیں اتنا ساز و سامان اور روپیہ دے دیں گے کہ قوم میں اور کسی کے پاس اتنا نہ ہو گا۔ اگر تمہیں عزت اور رتبہ کی خواہش ہے تو ہم تم کو آج ہی اپنا سردار منتخب کرتے اور تمہاری اطاعت کا حلف اٹھانے کے لیے تیار ہیں۔ اگر تمہیں سلطنت چاہیے تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ بنا لیں گے اور اگر عورت کی تمنا ہے تو ہماری حسین سے حسین لڑکی تمہارے لیے حاضر ہے اور اس سب

کے عوض ہم تم سے صرف اتنی خواہش رکھتے ہیں کہ ہمارے معبودوں کو بُرا کہنے اور ہمارے آباؤ اجداد کے مذہب کی تعریض سے باز آ جاؤ۔"

"ابو الولید' کیا تمہیں صرف اتنی ہی بات کہنی تھی یا ابھی کچھ اور بھی کہنا باقی ہے۔" قریش کا نمائندہ کہتا ہے "نہیں اور کچھ نہیں۔ مگر کیا یہ کافی نہیں ہے۔"

حضورؐ جواب دیتے ہیں "مجھے اپنے واسطے نہ دولت درکار ہے' نہ سرداری' نہ بادشاہت' نہ مجھے عورتوں کی خواہش ہے۔ مجھے تو اللہ نے یہ کام سونپا ہے کہ لوگوں کو تنبیہ کروں اور خوف دلاؤں ۔ مجھے تو صرف اس کا پیغام پہنچا دینا ہے اگر تم اسے تسلیم کر لو تو اس دنیا میں بھی اچھے رہو گے اور آخرت میں بھی فلاح پاؤ گے اور اگر نہ مانو گے تو اللہ ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کر دے گا۔"

اس جواب سے عتبہ مایوس ہو جاتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے پاس واپس چلا جاتا ہے۔ مصیبت کے اس دور میں محمدؐ (ﷺ) کی اخلاقی فتح اور کامیابی کا راز آپ کی انتہائی دیانتداری اور سچائی ہے۔ آپ کا دعویٰ صرف اس قدر ہے کہ خدا کے رسول ہیں۔ اور رسول ہونے کے ماسواہ باقی ہر صورت میں گوشت پوست کے بنے ہوئے ایک انسان۔ آپ نے نہ تو خدا سے کوئی رشتہ جوڑا ہے' نہ آپ کسی دیوتا کے اوتار ہونے کے مدعی ہیں۔ نہ آپ اس بات کے طالب ہیں کہ کوئی شخص ان میں وہ صفات تلاش کرتا پھرے۔ جو مافوق الفطرت ہوں۔ نہ آپ کسی دنیاوی طاقت و اقتدار کے متلاشی ہیں۔ آپ تو صرف اس بات پر قانع ہیں کہ خدا نے جو وحی آپ پر نازل کی ہے وہ دوسروں تک پہنچا دیں۔ آپ کو اگر کسی بات پر فخر ہے بھی تو صرف اتنا کہ خدا تعالیٰ نے آپ کو اپنا پیغمبر بنا کر عزت افزائی فرمائی ہے۔

لوگ اس بات کے عادی ہو چکے ہیں کہ پیغمبروں سے معجزات طلب کریں۔ کہا جاتا ہے کہ یسوع ناصری نے ہر طرح کے معجزات دکھائے حتیٰ کہ تخلیق کے مسلمہ قوانین کو بھی زیر و زبر کر کے مردوں کو جگایا' سمندر پر چہل قدمی کی' گناہوں کو دھو ڈالا اور روٹی کو گوشت اور شراب کو خون بنا کر دکھا دیا۔ معمولی سے معمولی ولی اللہ اور راہبوں نے بھی کم

از کم بیماریوں سے شفا بخش صحیح پیشن گوئیاں کیں۔ بانجھ عورتوں کو صاحب اولاد کر دکھایا۔ ان کی بددعاؤں نے بادشاہوں کا تختہ الٹ دیا اور سلطنتوں کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ پھینکا۔

لیکن ان کے برعکس محمدؐ (ﷺ) کا دعویٰ اس سلسلہ میں یہ ہے کہ آپ پر جو قرآن نازل ہو رہا ہے اس جیسی فصیح و بلیغ کتاب کے مقابلہ میں کوئی دوسری کتاب لے آؤ۔ کتاب تو امر دیگر ہے ایک سورۃ ہی پیش کر دو۔ پھر آپ خود اس کے مصنف ہونے کا دعویٰ نہیں کرتے اگر وہ صرف اتنا ہی کر لیتے تو لوگ آپ کو دنیا کا سب سے بڑا شاعر تو ضرور ہی تسلیم کر لیتے۔

معجزہ طلب کرنے والوں اور کفار کے لیے آپ کا سیدھا سادھا سا جواب ہے کہ اگر تمام روئے زمین کے انسان اور کائنات کی جملہ ارواح اپنی انتہائی کوشش کر لیں اور ایک دوسرے کی مدد پر بھی آ جائیں۔ تب بھی قرآن جیسی کتاب تصنیف کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ آپ فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے مجھ کو معجزات دکھانے کے واسطے مبعوث نہیں فرمایا۔ مجھے تو کتاب اور حکمت سکھانے کا فرض سونپا گیا ہے۔ آپ دریافت فرماتے ہیں ''کیا میں بجز ایک فانی انسان اور پیغمبر کے کچھ اور ہوں؟'' اور پھر خود ہی جواب دیتے ہیں ''اگر دنیا میں فرشتے بستے ہوتے تو اللہ آسمان سے ایک فرشتے ہی کو پیغمبر بنا کر بھیجتا۔ ہم نے محمد کو بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔'' جو لوگ آپ کو مافوق البشر سمجھتے ہیں ان کے سامنے آپ صاف و صریح آیات پڑھ کر سناتے ہیں اور اس سلسلہ میں واضح طور پر اعلان فرماتے ہیں کہ خدائی طاقتیں میرے قبضہ میں نہیں ہیں۔ نہ مجھے قوانین قدرت کا علم ہے۔ نہ مجھے فرشتہ ہونے کا دعویٰ ہے۔ آپ بار بار اس بات کا بھی اعادہ فرماتے رہتے ہیں کہ مجھے خدا تعالیٰ کی مرضی کے بغیر خود اپنے نفع نقصان کا بھی اختیار حاصل نہیں ہے۔

بعض اوقات آپ سے کہا جاتا ہے کہ ہم اس وقت تک آپ پر ایمان نہیں لائیں گے۔ جب تک آپ زمین سے بہتے ہوئے چشمے جاری نہ کر دیں۔ یا کھجوروں کا ایک پھلتا پھولتا باغ نہ اگا دیں۔ جس میں بافراط پانی کی نہریں جاری ہوں۔ یا آسمان

سے کوئی ٹکڑا توڑ کر دکھائیں۔ یا پھر سونے کا ایک محل تعمیر کر دیں۔ جس پر چڑھ کر آپ آسمان پر پہنچیں اور وہاں سے ایک کتاب لائیں جسے ہم پڑھ سکیں۔ ان لوگوں کے جواب میں جو خدا کی ہستی کو ان نشانیوں سے پہچاننا چاہتے ہیں۔ آپ اُس کی کل کائنات کو بطور جواب پیش کرتے ہیں۔" انسان' حیوانات' دن رات کا تسلسل' فضائے بسیط میں کرّوں کی گردش' اس کی بے شمار نعمتیں مثلاً باغات' چشمے' پہاڑ' قرمزی شفق اور تاروں بھرا آسمان اور فرماتے ہیں کہ کیا یہ سب چیزیں خالق مطلق کے وجود کی نشانیاں نہیں۔

﴿11﴾

بعض اوقات انسانیت معصیت کا پردہ بن جاتی ہے۔ کیا محمدؐ (ﷺ) کو درحقیقت اپنی انسانی اقدار کا احساس ہے یا آپ کو اس پر کوئی تقاضہ ہے کہ آپ کے متبعین نے آپ کو پیغمبر تسلیم کر لیا ہے اور آپ کا بے انتہا ادب و احترام کرتے ہیں۔ کیا جب سے آپ نے قرآن کے احکام سنانے شروع کیے ہیں آپ معمولی انسان سے بڑھ کر کچھ اور ہو گئے ہیں۔ کیا آپ کا رتبہ انسانوں سے بلند تر ہو گیا ہے۔ اور آپ خدا کے نائب بن گئے ہیں؟

صرف ایک مثال سے واضح ہو جائے گا کہ آپ بشریت کے دائرے سے متجاوز نہیں ہوئے ہیں اور باوجود پیغمبر ہونے کے ہم ہی جیسے ایک انسان ہیں۔

ایک روز آپ اہل مکہ کے مقتدر لوگوں کی ایک جماعت کو بتا رہے تھے کہ اسلام کیا ہے اور اس کے بنیادی اصول کیا ہیں۔ کہ اسی وقت ایک اندھا شخص بھی آ گیا۔ کوئی بات اس کے کان میں نہیں پڑتی یا وہ ٹھیک طور پر سمجھ نہ سکا۔ اور اس نے درمیان میں حضور کو ٹوک دیا۔ اس سے آپ کی پیشانی پر بل آ گیا اور یہ دیکھ کر لوگوں نے اسے خاموش کر دیا۔ آپ پھر پند و نصائح میں مصروف ہو گئے۔

واقعہ بالکل معمولی تھا۔ اور آپ کو غصہ آنا بھی فطری امر تھا۔ لیکن خدا تعالیٰ بڑا عدیل ہے اور اس کے دربار میں پیغمبر کو بھی غیر معمولی آزادیاں حاصل نہیں۔ اس پر سورہ عبس میں فوراً ہی تنبیہ کی گئی۔

”پیغمبر کی پیشانی پر بل آئے اور آپ نے منہ پھیر لیا کیونکہ ایک نابینا شخص نے کلام کے دوران مداخلت کی۔ جب کہ آپ ایسے لوگوں سے خطاب کر رہے تھے۔ جنہیں آپ کی کوئی حاجت نہ تھی اور آ گیا تھا ایک ایسا شخص جو خدا سے ڈرتا تھا اور آپ تک رسائی کی کوشش کر رہا تھا اور آپ نے اس سے بے اعتنائی فرمائی۔“

کیا یہ حضورؐ کے اپنے دل کی آواز تھی؟ کیا یہ اظہار ندامت تھا یا اس سے بھی فزوں تر کوئی چیز تھی۔ یہ تو معلوم ہی ہے کہ آپ کو کمزوروں اور غریبوں سے کتنی الفت تھی۔ ممکن ہے کہ آپ کو خود ہی اس عدم توجہی پر تاسف ہوا ہو۔ پھر یہ تنبیہ وقتی نہیں رہی بلکہ دائمی ہے کیونکہ اس سے خدائے عدیل کے انصاف کا رخ صاف طور پر نظر آتا ہے۔ اس وحی کے اظہار سے محمدؐ (ﷺ) کی دیانتداری کا اندازہ ہوتا ہے۔ کیونکہ آپ پر یہ تنقیدی الفاظ تا قیامت زندہ رہیں گے۔ خدا تعالیٰ کی رضا کے سامنے بخوشی سر جھکا دینا آپ کی زندگی کا بنیادی اصول ہے۔ اور اس واقعہ سے آپ کو کوئی اہانت نہیں ہوئی بلکہ لوگوں کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ خدائے قدوس کی مرضی کے آگے آپ اپنی کوئی حیثیت نہیں سمجھتے۔

ایک دوسرا موقع وہ بھی پیش آتا ہے۔ جب کہ قریش کے درمیان ایک واقعہ مابہ النزاع بن گیا۔ آنحضرت ﷺ دیکھتے ہیں کہ آپ کی مخالفت بہت سخت ہو گئی ہے اور وطن کا ایک ایک فرد آپ کے خلاف ہتھیار اٹھانے پر آمادہ نظر آتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ افواہ بھی گرم ہے کہ آپ نے اہل قریش کو ایک وحی سنائی ہے جس میں ان کے تین سب سے بڑے دیوتاؤں یعنی لات' منات اور عزیٰ کا نام باعزت طریقہ پر لیا گیا ہے۔ اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ کے دربار میں ان کو شفاعت کے مواقع حاصل ہیں۔ اس پر اہل قریش بے حد خوش ہیں۔ اور انہوں نے محمدؐ (ﷺ) کے اللہ کو سجدہ کر کے آپ کی عبادت میں شرکت کی ہے۔ اس پورے عرصہ میں آپ کے اور ان کے درمیان اختلاف اللہ کی ہستی پر نہیں بلکہ بتوں کے متعلق رہا ہے۔ قریش چاہتے ہیں کہ آپ کمتر درجہ پر ہی سہی۔ لیکن ان کے معبودوں کو خدائی میں شریک فرمالیں۔ اب

اس مفروضہ واقعہ کے بعد قریش پھر متحد ہو گئے ہیں۔ اور محمدؐ (ﷺ) ان سب کے پیشوا بن گئے ہیں اور سارا قبیلہ ان پر فخر کرتا اور ان کے سامنے سر جھکاتا ہے۔

لیکن قریش کی یہ خوش فہمی زیادہ عرصہ قائم نہیں رہتی۔ محمدؐ (ﷺ) کو جلد ہی علم ہو جاتا ہے کہ شیطان نے ان کے گرد ایک جال تن دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مغالطہ بڑا خوش آیند ہے۔ اس سے آپ کو عزت' شہرت' عظمت سب کچھ حاصل ہو سکتی ہے لیکن دیکھنا ہے کہ جب آپ کو اس صورتحال کا علم ہوتا ہے تو کیا آپ اس سے چشم پوشی یا اعراض فرماتے ہیں؟ کیا کسی مفاہمت کا لین دین کا سودا ہوتا ہے' کیا آپ حق بات سے گریز فرماتے ہیں؟ کیا اہل مکہ کی اطاعت شعاری آپ کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی؟ کیا آپ کو اس کا احساس نہیں کہ اس خوش فہمی کی تردید خود آپ کی شہرت پر بھی اثر انداز ہو سکتی ہے' کیا اس سے قریش کی مفاہمت ختم نہ ہو جائے گی اور اس کے ساتھ ہی آپ کے اور بنو ہاشم کے خلاف تعذیر و تادیب میں اضافہ نہ ہو جائے گا؟

لیکن خواہ امکانات کچھ بھی ہوں' نتائج کچھ بھی نکلیں' محمدؐ (ﷺ) کو اس امر کے اعلان سے کوئی مصلحت روک نہیں سکتی کہ کعبہ اصنام کا' خدائے وحدہٗ لاشریک سے مطلق کوئی تعلق نہیں اور جو کچھ قریش کہہ رہے ہیں وہ سب شیطان کا کارنامہ ہے۔ آپ فرماتے ہیں "یہ سب نام ہیں' محض نام' جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے گھڑے ہیں اور اس کے واسطے انسان کے پاس کوئی شہادت یا سند موجود نہیں ہے۔"

محمدؐ (ﷺ) کی زبان سے بتوں کی تعریف میں کوئی فقرہ نکلنا بہت مشکوک ہے۔ لیکن بفرض محال ان کو درست تسلیم کر بھی لیا جائے۔ تب بھی فوری طور پر اس کا انکار اور تردید آپ کے کردار کی عظمت کو کم کر دینے کی بجائے دوبالا کر دیتا ہے۔

اس اعلان کے بعد کہ چاند کی بیٹیاں یعنی اصنام کعبہ محض وہم و گمان کی تخلیق ہیں۔ مسلمانوں کی تعذیب و ایذا رسانی کی مہم ازسرنو بڑی تیزی سے شروع ہو جاتی ہے۔

آگے ایک اور سال بھی فریقین کے درمیان مخاصمت جاری رہتی ہے۔ لیکن کامیابی کسی ایک کو بھی حاصل نہیں ہوتی۔ بنو ہاشم وادیٔ شعب میں محصور ہیں۔ پیغمبر ﷺ

اور آپ کے صحابہ کا شمار بھی انہیں لوگوں میں ہے۔ اس طرف جانے والی تمام سڑکوں کی کڑی نگرانی ہوتی ہے اور اگر چند ہمدردوں کی مدد شامل نہ ہوتی تو یہ سب کے سب بھوکے مر گئے ہوتے۔ کیونکہ ان کو صرف حرمت کے دنوں ہی میں باہر نکلنے کی آزادی حاصل ہوتی تھی۔

مہاجرین حبش برابر دعا کرتے رہتے ہیں کہ مکہ بتوں کے وجود سے پاک ہو جائے۔ اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی دعا باب اجابت تک پہنچ گئی ہے۔ کیونکہ وہاں ایک افواہ گشت کرنے لگی ہے کہ اہل مکہ نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اس کو سن کر 33 پناہ گزینوں کا ایک قافلہ واپس لوٹ آتا ہے۔ لیکن سمندر پار کر کے ساحل پر قدم رکھتے ہی انہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ خبر غلط تھی اور مکہ پر بدستور مشرکوں کا قبضہ ہے۔

لیکن اسی زمانہ میں ایک بالکل ہی غیر متوقع صورت ایسی پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے افتراق معطل ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ یہ کہ جس کاغذ پر مقاطعہ کی تحریر لکھی ہوئی کعبہ میں آویزاں تھی۔ اسے دیمک نے چاٹ لیا ہے۔ معاندین کہتے ہیں کہ یہ محمدؐ (ﷺ) کی کارستانی ہے۔ لیکن اہل ایمان کا عقیدہ ہے کہ یہ سب منجانب اللہ ہے۔ اس واقعہ کا اثر بہت دور رس ہوتا ہے۔ محمدؐ (ﷺ) ابوطالب سے کہتے ہیں ''چچا جان قریش کے فیصلہ پر اللہ نے ایک کیڑے کو مسلط کر دیا ہے۔ جس نے ان تمام ناانصافیوں اور زیادتیوں کو ملیا میٹ کر کے رکھ دیا ہے جو انہوں نے ہمارے حق میں روا رکھی تھیں۔ اس تحریر میں اب صرف اللہ کا نام ہی باقی رہ گیا ہے۔'' یہ سن کر ابوطالب سرداران قریش کے پاس جاتے اور کہتے ہیں ''اگر جو کچھ محمدؐ (ﷺ) نے مجھے بتایا ہے وہ صحیح ہے تو آپ انتقام کی اس صورتحال سے باز آ جائیں اور اگر وہ غلط بیانی کر رہے ہیں اور جو کچھ انہوں نے اس تحریر کے متعلق مجھ سے کہا ہے جھوٹ ہے تو میں انہیں آپ کے حوالہ کر دینے کے لیے تیار ہوں۔ پھر آپ کا جو جی چاہے ان کے ساتھ سلوک کیجئے۔''

اکابرین اس پر راضی ہو جاتے' اور کعبہ کی طرف دوڑتے ہیں۔ ایک مجمع اکٹھا ہو جاتا ہے۔ سب دیکھتے ہیں کہ ہر بات محمدؐ (ﷺ) کے قول کو سچا ثابت کر رہی ہے۔

کاغذ اس حد تک کرم خوردہ ہو چکا ہے کہ بجز اللہ کے ایک لفظ بھی باقی نہیں رہا۔ ابوطالب بے انتہا خوش ہوتے ہیں۔ جلاوطنی کا حکم خود بخود منسوخ ہو جاتا ہے۔ قلعہ کے دروازے پر بنو ہاشم کے رشتہ دار' دوست احباب جمع ہوتے' انہیں مبارکباد دیتے اور خوشی خوشی گھر لے آتے ہیں۔ جو لوگ محمدؐ (ﷺ) یا آپ کے ساتھیوں سے کسی طرح بھی منسلک ہیں' بہت پُرمسرت نظر آ رہے ہیں۔

لیکن بدقسمتی سے بنو ہاشم کی یہ شادکامی دیرپا ثابت نہیں ہوتی۔ کیونکہ جلد ہی ابوطالب جو اپنی مدت حیات پوری کر چکے ہیں۔ سخت علیل ہو جاتے ہیں۔ اور سب کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ مرض جان لیوا ہے۔ وہ مسلمان تو نہیں ہوئے لیکن بہرحال محمدؐ (ﷺ) کے کفالتی باپ ہیں اور انہوں نے آپ کی پیغمبری کا تحفظ بھی کیا ہے۔ اگر محمدؐ (ﷺ) کسی تذلیل' اہانت یا خطرہ سے محفوظ رہے ہیں تو اس کی وجہ ابوطالب کی سرپرستی ہے۔ اگر قریش نے اپنے دین کی مدافعت میں ہتھیار اٹھانے سے گریز کیا ہے تو اس کا باعث بھی یہی ابوطالب ہیں۔ پھر خود آنحضرتؐ کے حق میں وہ باپ سے زیادہ شفیق ثابت ہوئے ہیں۔ گو آپ انہیں اپنے دین میں شامل ہونے اور آباؤ اجداد کی صنم پرستی سے منہ موڑنے پر آمادہ نہیں کر سکے مگر ساتھ ہی یہ بات بھی ہے کہ ان کی نظروں میں محمدؐ ہمیشہ ایک باوقعت شخصیت رہے ہیں۔ ابوطالب اور اہل خاندان کو محمدؐ (ﷺ) کے کردار پر غائر نظر ڈالنے اور آپ کے مقاصد کو سمجھنے کے زیادہ مواقع حاصل رہے ہیں۔ ان کے نزدیک بعض اوقات آپ زیادہ خودسر دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی کبھی رات کی عبادتوں میں حد سے گزر جاتے ہیں۔ لیکن بعینہٖ آپ کی دیانتداری' خلوص اور انکساری میں کسی کو کلام نہیں۔ اس لیے جب بالکل آخری وقت میں ابوطالب کو دعوت اسلام دیتے ہیں تو انہیں اس پر کوئی تعجب نہیں ہوتا بوڑھے سردار کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی ہے۔ دوسروں کے نزدیک محمدؐ (ﷺ) اللہ کے مقرر کردہ پیغمبر ہوا کریں۔ لیکن ابو طالب کے لیے تو آپ اپنے پیارے بھائی عبداللہ کے وہی صاحبزادے ہیں جو بچپن میں ان کی گود میں کھیلا اور ان کے کاندھوں پر سواری کیا کرتے تھے۔

وہ فرماتے ہیں ”محمدؐ! میں تمہاری خواہش بڑی خوشی سے پورا کرتا۔ مگر میں یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ قریش کے لوگ میرے بعد کہتے پھریں کہ دیکھو کتنا بودا تھا کہ موت کے خوف سے مسلمان ہو گیا۔“

اس کے فوراً ہی بعد ابوطالب کے لب بند ہو جاتے اور آنکھیں پتھرا جاتی ہیں۔ لیکن چلتے چلتے انہوں نے اپنے کردار کی بلندی اور استقامت کا ایک اور واضح ثبوت پیش کر دیا۔

اس طرح اسی برس سے بھی تجاوز عمر میں ابوطالب اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ ان کی عدیم النظیر فہم و فراست' انتہائی دیانتداری' راسخ عزم' بے مثل رواداری اور بے پناہ جرأت و شہامت پر اہل اسلام اور کافر دونوں ہی گریاں کناں ہیں۔ وہ نہایت زیرک' معاملہ فہم' بے لاگ اور عدیل اور ابنائے وطن کی محبت سے سرشار تھے۔ اس لیے اہل مکہ کی یکے بعد دیگرے دونسلوں کو ان کی ذات پر مکمل اعتماد تھا۔ اور کہنا پڑتا ہے کہ ان میں بھی سربراہ خاندان بننے کی وہ تمام صلاحیتیں موجود تھیں جن سے ان کے والد عبدالمطلب مختص تھے۔

پیغمبر ﷺ کے واسطے ان کی رحلت ایک چچا کی موت سے کچھ زیادہ ہی اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ قریش اور ان کی سازشوں اور منصوبوں کی روک تھام کے لیے اُن کی ذات بمزلہ ایک آہنی دیوار کے تھی۔ جب تک وہ زندہ رہے۔ حضورؐ کو اپنے اور اپنے قریبی دوستوں کی زندگی کے بارے میں کوئی اندیشہ نہ تھا۔ لیکن اب کہ وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ اہل اسلام کا مستقبل زیادہ تاریک نظر آنے لگا ہے۔

............﴿12﴾............

محمدؐ (ﷺ) کے دل پر ابوطالب کی وفات کا سخت صدمہ ہے۔ پچھلے ہفتے ہی کی بات ہے کہ وہ گوشت پوست کے بنے ہوئے ایک صاحب فہم و شعور انسان تھے۔ گزشتہ زمانہ کے حالات بیان کرتے اور آئندہ کے منصوبے تیار کرتے تھے۔ لیکن اب ان کا بے جان سوکھا ہوا سرد جسم کئی من خاک کے نیچے مدفون ہے۔ گرم و خشک ریت ان

کا بچھونا ہے اور بے رحم حشرات الارض ان کے ہم جلیس بنے ہوئے ہیں۔ محمدؐ اس زمانہ کو یاد کرتے ہیں جب چالیس برس سے بھی زیادہ عرصہ وہ بہ حیثیت باپ کے ان پر شفقت فرماتے رہے اور اس کے ساتھ ہی آپ کی آنکھیں پرنم ہو جاتی ہیں۔ محمدؐ (ﷺ) صرف پیغمبر ہی نہیں انسان بھی ہیں۔

اسی سال آپ کے رنج و الم میں ایک اور اضافہ ہوتا ہے۔ صرف ابوطالب ہی رخصت نہیں ہوئے بلکہ خدیجہؓ بھی داغ مفارقت دیتی نظر آتی ہیں۔ اور وحشت خیز باتیں کرنے لگی ہیں اور اس وقت کا ذکر کرتی ہیں جب وہ اس دنیا میں نہ ہوں گی اور آپ تنہا رہ جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس سے آپ کے دل کو کتنا صدمہ ہوتا ہو گا۔

صحن میں علیؓ اور عبدالکعبہ بہت متفکر انداز میں محو گفتگو ہیں۔ خدیجہؓ کا آخری وقت آ پہنچا ہے۔ فاطمہؓ سخت پریشان ہیں۔ محمدؐ کو علم ہے کہ اب وہ صرف چند گھنٹوں کی مہمان ہیں اور مفارقت کی گھڑی سر پر آ گئی ہے۔ آپ اس خیال سے سوتے بھی نہیں کہ معیت کے جو لمحات میسر ہیں وہ ضائع ہو جائیں گے۔ تاروں بھری رات میں آپ کو یہ احساس ہو رہا ہے کہ اس عالم آب و گل میں میری نہ کوئی حیثیت ہے' نہ اختیار' آسمان پر ابتدائی شب کے چاند کی کرنیں گیندی شفق سے پھسل پھسل کر زمین پر اس طرح پھیل رہی ہیں جیسے سطح سمندر پر کسی نرم و نازک پھول کی پنکھڑیاں بکھیر دی جائیں۔ ہوا کے جھونکوں کی سرسراہٹ ایسی لگتی ہے۔ جیسے کسی دردمند کے دل سے کراہ نکلتی ہو۔ حضورؐ کے قلب میں ماضی کے دور کی خوشنما یادیں ابھر رہی ہیں۔ آپ کو وہ وقت یاد آ رہا ہے جب آپ کا عالم جوانی میں خدیجہؓ سے نکاح ہوا تھا۔ اور ازدواجی زندگی کا آغاز اس طرح ہوا تھا کہ مستقبل کے تاریک لمحات کا کسی کو خیال تک نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن آج اس سنہری دور زندگی کے صرف خواب ہی نظر آتے ہیں۔ بچوں کی پیدائش پر خوشیاں' باہمی اختلاط اور الفت آمیز گفتگو' بے فکری اور فراغت۔ لیکن پھر جب مصائب کے پہاڑ سامنے آ کھڑے ہوئے' ناگفتہ بہ اذیتوں کا مقابلہ کرنا پڑا تو دونوں نے مل کر نہایت صبر و شکر سے ان تکالیف کو جھیلا۔ اس وقت بھی وہ آپ کا ہاتھ تھامے ہوئے ہیں۔ ان پر اب جھریاں پڑ

گئی ہیں۔ لیکن ان کی نرمی اور حرارت ابھی تک باقی ہے۔ آپ کی آنکھوں کو دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ حضورؐ کے لیے ان کی زندگی کتنی عزیز ہے آپ کو ان سے کتنی محبت اور اُن کے رخصت ہونے کا کتنا غم ہے۔

خدیجہؓ کی آنکھوں کے پپوٹے بھاری ہوتے معلوم ہوتے ہیں۔ دماغ کے پردے پر عجیب و غریب تصاویر منعکس ہو رہی ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ محمدؐ (ﷺ) ایک لشکر جرار لے کر مدینہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ طبل اور دمدمہ کی آوازیں آپ کی فتح کا اعلان کر رہی ہیں۔ آپ کے قدم بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں اور وہ خود دروازہ میں کھڑی سب کچھ دیکھ رہی ہیں۔ ٹھنڈی سبک ہوا ان کے بالوں سے اٹھکھیلیاں کر رہی ہے اور ہزاروں زبانوں سے اللہ اکبر کی صدا بلند ہو کر دلوں کو گرما رہی ہے۔ لیکن اب ان کی زندگی کا آخری لمحہ آ پہنچا ہے۔

تیسرا باب

''مہاجر''

زندگی سرعت کے ساتھ آگے قدم بڑھا رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا خواب کے گریز پا نظارے افق پر کسی سراب کا پیچھا کر رہے ہیں۔ دنیا کی تمام الہامی کتابوں میں ایک پیغمبر کے مبعوث ہونے کی پیش گوئی موجود ہے اور انسانی قلوب اس کو پورا ہوتے دیکھنے کے سخت منتظر ہیں۔ لیکن تاریخ کے صفحات چھان ڈالنے کے بعد بھی ہم کو ان کے صفحات میں کسی ایسی ہستی کا پتہ نہیں لگتا جو موعودہ صفات سے متصف ہو۔ اس میں ہمیں رستم و زماں جیسی صاحب قوت ہستیاں ملتی ہیں۔ نعمان و سلیمان جیسے صاحب عقل وفہم انسان بھی دکھائی دیتے ہیں۔ بہترین اخلاق و کردار کے لوگوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے۔ لیکن ان خوبیوں کا مجموعہ جن کا آسمانی کتابوں میں ذکر ہے کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ گلیلی کے ایک سادہ منش مبلغ کی موت کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کے واسطے تاریخ کے صفحات کو بہت بُری طرح مسخ کیا گیا ہے اور اس کے گرد روایات کے عظیم الشان قلعے تیار کر دیئے گئے ہیں۔ لیکن اگر ہمارا دماغ کسی ایسی شخصیت کا متلاشی ہے جس نے انسانی حیات پر قابو پا لیا ہو۔ کسی ایسے کردار کو دیکھنا چاہتا ہے جو بیک وقت ایک اعلیٰ درجہ کا فرمانروا' نبرد آزما' منصف اور مدبر ہو' جو ہر قسم کی اخلاقی اور فطری صفات کا مکمل طور پر آئینہ دار ہو' تو یاد رکھئے کہ اس قسم کا تمثیلی انسان آج تک پیدا نہیں ہوا۔ ہاں ان خصوصیات سے قریب تر ہستی اگر کوئی ہو سکتی ہے تو وہ پیغمبر صحرا حضرت محمد ﷺ کی ذات مبارکہ ہے۔

انسانی دماغ ارتقائی ہے۔ تکرار سے متنفر رہتا ہے اور چاہتا ہے کہ نت نئی صورتیں پیدا ہوں۔ اسی لیے فنون لطیفہ میں مصور کا مقصد ایجاد نہیں بلکہ تخلیق ہوتا ہے۔ وہ کسی پس منظر کی نقاشی کرتے وقت قدرت کو تمثیلی حیثیت میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور جو کچھ مادی نظروں سے دیکھتا ہے اس کی عکاسی نہیں کرتا۔ وہ دوسروں کو وہی کچھ دکھانا چاہتا ہے جو خود اس کی چشم بصیرت دیکھنا چاہتی ہے۔ تاریکی اس کے ہاں کچھ زیادہ ہی سیاہی لیے ہوئے اور اسی طرح دھوپ کی چمک معمول سے زیادہ روشن ہوتی ہے۔ اس کے دل میں رنگ کھلتے رہتے ہیں۔ وہ اپنے بنائے ہوئے انسانوں اور دن کی روشنیوں میں رموز و اشارات سے مدد لیتا ہے۔ لیکن کوئی شخص اپنے ماحول سے قطع نظر کر کے ایسا نمونہ پیش نہیں کر سکتا جو اس زمانہ کی روح یا ثقافت سے کلی طور پر مغائرت رکھتا ہو وہ کتنا ہی تخلیقی' طرفہ طبع یا آزاد منش کیوں نہ ہو اس کے تصور پر اس ماحول کی' جس میں اس نے پرورش پائی۔ جس ہوا میں اس نے سانس لی۔ یا جس سرزمین پر اب وہ زندگی کے ایام گزار رہا ہے' کچھ نہ کچھ عکاسی ضرور کرے گی۔

لیکن تخیل کا خاصہ ہے کہ وہ پرواز کرتا ہے' منجمد نہیں ہو سکتا۔ اس لیے نقاش رنگ و بو میں گم نہیں ہو جاتا۔ اس کے استعمال میں آنے والے رنگوں کی سرخیاں' سبزیاں اور نیلی پیلی جھلکیاں بے معنی نہیں ہوتیں۔ ہر ایک کی پشت پر کوئی تخیل ہوتا ہے۔ کسی خیال کا اظہار ہوتا ہے۔ انہیں قدیم رنگوں سے وہ کچھ تصاویر بناتا ہے۔ جو اس کے خیالات کی عکاس ہوتی ہیں۔ اس سے حقانیت کی تولید ہوتی ہے' جو قدرت اور تخیل کے ازدواجی تعلقات کا نچوڑ ہے' جو قدیم ابدی روح کا اور لامحدود کائنات کا ایک جزو ہوتا ہے۔ یہ کوئی خیال ہو یا معجزہ یا وحی' لیکن اس کی تکرار بار بار نہیں ہوتی۔ اور جو کوئی اس کی تحقیقات کے پیچھے سرگرداں پھرتا ہے۔ اس کو بغیر حیرت و استعجاب کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس میں وہ تمام عناصر شامل ہوتے ہیں۔ جو عام وجود میں آچکے ہیں اور ان کی نشاندہی ہوتی ہے۔ جو ابھی تک کتم عدم ہی میں ہیں۔

اور قرآن اسی طرح آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ ایک سورۃ کے بعد دوسری نازل

ہوتی رہی ہے۔ جس کی قرأت بھی معجز نما ہے۔ اور وحی بھی سرتا پا حقیقت زا۔ وہ اپنی اساس پچھلے صحیفوں پر قائم کرتا ہے۔ لیکن بذاتِ خود خدائے قدوس کا آخری پیام ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے محبت' رواداری' باہمی مفاہمت اور مخلصی کے پھول ہر طرف کھل گئے ہوں۔ اس نے قبائل کی تقسیم اور ان کے جداگانہ خداؤں کو القط کر دیا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کو رب العٰلمین کی حیثیت سے جملہ کائنات کا خالق' مالک ومختار اور پروردگار قرار دیتا ہے۔ اس میں یہ حقیقت ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے واضح کر دی گئی ہے کہ کل نظام عالم اسی کا ساختہ پرداختہ ہے۔ مکان و زماں' یا ملک ونسل اس کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ اسلام میں اللہ ساری کائنات کا خدا ہے۔ اس کو کسی قبیلہ کے بُت کی طرح سمجھنا یا کسی خاص فرقہ یا مذہب سے منسوب کر دینا غلط ہے۔ خود اس نے بھی کسی قوم یا جماعت کو منتخب کر کے اپنا منظورِ نظر نہیں بنایا۔ اس کا کسی خاص زبان یا طرزِ عمارت کی طرف بھی میلان نہیں ہے۔ نہ کوئی اسے عود ولوبان کی خوشبوؤں سے متاثر کر کے اپنا بنا سکتا ہے۔ نہ اسے غربت سے کراہیت ہوتی ہے۔ آپ جدہر کا بھی رخ کریں۔ اس کا جلوہ ہر طرف نظر آنے لگے گا۔ اسکی صفات کریمی میں رحم اور درگزر سب سے بلند و بالا ہیں۔

قرآن کی عبارات و آیات انتہائی پُرجوش اور ولولہ انگیز ہیں۔ ''تمہارا اللہ ہی تمہارا معبود ہے۔ بجز اس کے دوسرا لائق عبادت نہیں۔ ہر شے کی زندگی اسی کے حکم کی تابع ہے۔ اس لیے اُسی کی عبادت کرو۔ وہی ہر اس شے کو جو اس کی بنائی ہوئی ہے' بالیدگی عطا فرماتا ہے وہ سب کو دیکھتا ہے۔ لیکن اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ اس کی خوبیوں اور اس کے علم کی حدود دائرہ اِدراک سے باہر ہیں۔ وہ ہی اس کل کائنات کا خالق اور مالک ہے۔ وہی صبح کے اندھیرے کو چاک کرتا ہے۔ اسی نے رات کو آرام کا وقت اور سورج و چاند کو حساب تقویم کا ذریعہ بنایا ہے۔ اسی نے ستارے پیدا کیے ہیں تاکہ تم سیدھا راستہ معلوم کرسکو۔ وہی بارش برسانے کے واسطے بادل اٹھاتا ہے اور کھجوروں کے درختوں پر پھلوں کے خوشے لٹکاتا ہے۔ وہی زمین اور آسمانوں کا خالق مطلق ہے۔''

صرف ایک سورت یا ایک قطعہ وحی میں نہیں بلکہ ہزاروں آیتوں میں اس کی صفات

قدوسی، فضل و کرم، ترحم و مرحمت کا بیان ہے۔ وہی جلاتا اور مارتا ہے۔ وہی تندرستی عطا فرماتا اور صحتوں کو قائم رکھتا ہے۔ وہی مشکل کشائی کرتا اور مصیبت کے وقت کام آتا ہے۔ نیک کاموں کا ثواب اور بُرے اعمال پر عذاب دینے والا ہے۔ کسی کی طاقت نہیں کہ اس کا مقابلہ کر سکے۔ نہ کوئی عقل اس کی ذات کا احاطہ کر سکتی ہے۔ اسی نے تمام ارواح کو پیدا کیا ہے اور خود ازلی و ابدی ہے۔

قرآن میں صرف خدا تعالٰی کی حمد و ثنا ہی بیان نہیں ہو رہی۔ بلکہ وہ ایک قانون اخلاق بھی بنتا جا رہا ہے۔ جس میں ایک انسان اور دوسرے انسان کے مابین لین دین اور معاملات کی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے بھی واضح ہدایات موجود ہیں۔

"ہر شے کو بہترین طریقے پر استعمال کرو۔ جاہلوں سے دور رہو۔ دیکھو شیطان تمہیں بدی کی ترغیب نہ دینے پائے۔ صرف خدا ہی پر بھروسہ کرو۔ یتیم کے مال سے تعرض نہ کرو، عسرت کے خوف سے اپنی اولاد کو ہلاک نہ کرو۔ دوسرے کے مال پر نظر نہ رکھو جس کے پیٹ سے تم پیدا ہوئے ہو اس کی عزت کرو، زناء اور بدکاری کے قریب بھی نہ بھٹکو۔ شہوت پرستی کی نظروں سے کسی کو نہ دیکھو۔ عورتیں بجز محرم مردوں کے کسی کے سامنے اپنے بناؤ سنگھار کی نمائش نہ کریں۔ غرور و تکبر سے پرہیز کرو۔ نماز قائم کرو۔ زکوٰۃ دو، اپنے والدین کی اطاعت کرو۔ اور حسن سلوک سے پیش آؤ۔ ظاہری و باطنی ہر قسم کی معصیت سے دُور رہو۔ نہ غصہ کرو۔ نہ بے انصافی، خدا تعالٰی سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتے رہو اور بجز اس کے کسی سے حاجت روائی کی درخواست نہ کرو۔ وہ رؤف بھی ہے اور رحیم بھی۔ اسے تنہائی میں پوشیدہ طور پر پکارا کرو۔" یہ ہیں مختصر طور پر قرآن حکیم کے چند ارشادات۔ عبادات کی فضیلت کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے "کتاب کی شکل میں وحی کے ذریعہ جو کچھ آپ پر نازل کیا گیا ہے۔ اس کی تلاوت کرتے رہیے اور نماز پر قائم رہیے۔ کیونکہ نماز انسان کو بدی سے بچاتی ہے۔ اور ان باتوں سے بھی جن کے باعث وہ صراط مستقیم سے بھٹک جاتا ہے۔ خدا تعالٰی کو یاد کرتے رہنا آپ کا اہم ترین فرض ہے۔"

طول طویل پُرشکوہ وظائف یا پیچیدہ قسم کی عبادات کا کہیں حکم نہیں۔ نئے مذہب میں نمازوں کا طریقہ بہت سیدھا سادھا ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ عبادت گزار کی اخلاقی بلندی اور صفائی قلب کا ذریعہ بن جائے۔ اس سلسلہ میں آنحضرت ﷺ نے بحیثیت پیغمبر اپنے آپ کو کوئی بلند و بالا مرتبہ نہیں دیا۔ مذہبی پیشوائی کے لیے کوئی جداگانہ فرقہ نہیں بنایا۔ نہ مذہبی علوم کو کسی کی اجارہ داری قرار دیا۔ نہ کوئی ایسی انجمن یا عیسائیوں کے چرچ کی طرح کا کوئی ادارہ قائم کیا ہے جو انسان اور اس کے خدا کے درمیان ذریعہ ارتباط بن جائے۔ ہر شخص کا اپنے خالق سے براہِ راست تعلق قائم کر دیا گیا ہے۔ لیکن وہ اپنے ہی جیسے دوسرے انسان سے نہ افضل ہے نہ کم تر' خدا اور اس کی مخلوق کے درمیان بلا واسطہ لگاؤ ہے۔ اس کے دربار میں حاضری کے لیے قلبی خلوص کے لیے نہ قربانی کی حاجت ہے۔ نہ کسی رسم کی' نہ لوبان سلگانے کی ضرورت ہے۔ نہ عود و عنبر کی' نہ مسجد درکار ہے' نہ قبلہ گاہ' ریگستان کی ریت ہو' یا پہاڑ کے پتھر' کسی مواج دریا کا کنارہ ہو یا درختوں کا سایہ' اس ذاتِ باری تعالیٰ کے پیدا کردہ نیلگوں آسمان کے نیچے زمین کے کسی چپہ پر محمدؐ (ﷺ) کی اُمت سجدہ ریز ہو سکتی ہے۔ آپ نے اپنے ہاتھ پر اسلام لانے والوں کو یہی صاف سیدھی تعلیم دی ہے۔ اسی کو تسلیم کرنے سے قریش نے انکار کیا ہے اور اب تک مسلمانوں کی ایذا دہی پر قائم ہیں۔

............﴿2﴾............

اب آپ کی نبوت کا بارھواں سال شروع ہو رہا ہے۔ لیکن ابھی تک حالات میں کسی تبدیلی کا کوئی امکان پیدا نہیں ہو رہا۔ آپ کے وفادار ساتھی مختلف اطراف میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بعض نے حبشہ کے مہربان فرمانروا کے سایۂ عاطفت میں پناہ لی ہے اور بعض جانکے خوف سے نامعلوم مقامات کو چلے گئے ہیں۔ ابوطالب اور خدیجہؓ کا انتقال ہو چکا ہے۔ قریش کی مسلمانوں سے نفرت حد انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ خون کے رشتے تک بھلائے جا چکے ہیں۔ کعبہ کے اصنام اللہ سے برسر پیکار نظر آتے ہیں۔ اور انسانی تقدیروں کے خلاف سازشیں برابر جاری ہیں۔

کیا ان حالات میں حضورؐ مایوس ہونے لگے ہیں؟ کیا آپ عاجز آ کر خدا سے شکایت فرماتے ہیں کہ تو نے مجھے دشمنوں کے رحم و کرم پر کیوں چھوڑ دیا ہے؟ کیا آپ کا اپنے فرض منصبی سے اعتماد اٹھ گیا ہے؟ نہیں بالکل نہیں۔

بلکہ اس سلسلہ میں خدائے قدوس کی طرف سے اس طرح بیانگ دہل یقین دہانی ہوتی ہے "کہ اب یقیناً اہل اللہ کو نہ کوئی خوف ہو گا نہ رنج"۔ اِدھر پیغمبر ﷺ کا عقیدہ یہ ہے کہ کفار کی جانب سے کتنی ہی سخت مخالفت کیوں نہ ہو۔ حالات کتنے ہی ناسازگار ہوں فتح انجام کار اسلام کو ہو گی۔ کیونکہ خود اللہ آپ کی مدد پر ہے اور اللہ کو کوئی ہرا نہیں سکتا۔ اس زمانہ کے مسلمان بلکہ اگر آپ خود بھی ہلاک ہو جائیں۔ تب بھی فتح اسلام ہی کو ہو گی۔

قرآن کی زبان سے آپ فرماتے ہیں "اے کافرو! نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ اور نہ میں ان کی عبادت کرنے والا ہوں۔ جن کی تم عبادت کرتے ہو' نہ میں کبھی اس کی عبادت کروں گا جس کی تم عبادت کرتے ہو اور نہ تم ہی اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین۔"

اگر اعلیٰ صفاتی کا دارومدار قوت مدافعت پر ہے تو پیغمبر ﷺ اس معاملہ میں بے مثال اور عدیم النظیر ہستی ثابت ہوتے ہیں۔ حالات کتنے ہی حوصلہ شکن ہوں' کام کتنا ہی دشوار ہو' جدوجہد کتنا ہی طول کھینچ رہی ہو۔ محمدؐ برابر تبلیغ میں مصروف رہتے ہیں۔ اس میں نہ کوئی تساہل ہوتا ہے نہ کمی واقع ہوتی ہے۔ خدائے برحق پر آپ کا اعتماد غیر متزلزل ہے۔ سورج کی ہر کرن' بادل کے ہر رواں دواں ٹکڑے' حتیٰ کہ ہر گریز پا خیال بھی آپ کو خالق قدوس کی جلوہ گری دکھائی دیتی ہے۔ پہاڑ کی ہر چوٹی اپنی انگلی اٹھا کر اسی وحدہٗ لاشریک کی جانب اشارہ کرتی نظر آتی ہے۔ موت' رنج و آلام یا ناکامیاں دنیاوی نقطہ نظر سے آپ کے لیے مطلق خوف و ہراس کا باعث نہیں۔ آپ کو صرف ان اعمال کا خیال ہے جو خدا کے سامنے پیش ہوں گے اور جن کا حساب طلب کیا جائے گا۔

آپ کو اسی پر پورا پورا یقین ہے کہ خدائے قدوس نے آپ کو اپنا پیام نبی نوع انسان تک پہنچانے کے لیے مبعوث کیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں آپ کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔ دنیاوی زندگی آپ کے نزدیک حیات اخروی کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اور سب کا ماحصل خدا تعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی حاصل کرنا ہے۔ اس طرح زندگی کے نشیب و فراز سے قطع نظر کرتے ہوئے آپ اس فرض کی ادائیگی میں ہمہ تن معروف ہیں جو آپ کے ذمہ ڈالا گیا ہے۔

طائف بھی عرب کے مشہور شہروں میں سے ایک ہے۔ جو مکہ سے بیس فرسنگ کے فاصلے پر واقع ہے۔ آپ کو یہ شہر اس زمانہ سے اچھا لگتا ہے۔ جب آپ تجارت کے سلسلے میں ادھر کا سفر کرتے تھے۔ یہاں آپ نے خدیجہؓ کے سامان کی خرید و فروخت کی تھی۔ اور وہاں کے لوگ آپ کی بڑی خاطر و تواضع کیا کرتے تھے۔ ویسے بھی یہ ایک عمدہ بستی ہے۔ اس کے چاروں طرف ہرے بھرے باغات ہیں۔ دشمن کے حملہ سے اس کی مدافعت آسان ہے۔ پھر وہاں کے لوگ بہادر، محنتی اور جنگجو ہیں۔ اگر اہل مکہ نے آپ کی بات سننے سے کان بند کر لیے ہیں تو ممکن ہے کہ طائف کے باشندے اسلام کے حلقہ بگوش ہو جائیں اور آپ کو وہاں جائے پناہ مل جائے۔

اس لیے آپ اپنے وفادار خادم زیدؓ کے ساتھ وہاں پہنچتے اور ایک مجمع کے سامنے نہایت جرأت مندی سے کلامِ الٰہی کی تلاوت فرماتے ہیں۔ آپ کا مخاطب خاص طور پر عمیر کے صاجزادوں مسعود اور حبیب سے ہے۔ آپ خدا تعالیٰ کی صفات حمیدہ اور تخلیق و تکوین عالم کو بڑی خوبی سے بیان فرماتے ہیں۔ پھر بڑے اعتماد سے فرماتے ہیں "میں یعنی محمدؐ اس کا رسول ہوں۔ اور اس نے یعنی اللہ نے مجھے ہدایت کی ہے کہ اسلام کا پیام آپ لوگوں تک پہنچا دوں۔"

لیکن جو جواب آپ کو ملتا ہے وہ انتہائی حوصلہ شکن ہے۔ مجمع سے ایک کھڑا ہو کر کہتا ہے۔ "اگر خدا کا یہی منشا ہوتا کہ ہم اپنا مذہب تبدیل کر دیں تو یہ کام بغیر تمہاری امداد کے بھی ہو سکتا تھا۔"

دوسرا کہتا ہے۔ ”جہاں تک میرا تعلق ہے میں آپ کے دلائل کا ابطال نہیں کرتا۔ اگر آپ واقعی پیغمبر ہیں تو آپ اتنی عظیم شخصیت ہوئے کہ مجھ جیسے فانی انسان کو آپ سے بحث کرنے کی ہمت نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن اگر آپ کوئی نوسر باز ہیں تو آپ کو جواب دینا بھی فضول ہے۔“

پیغمبرؐ خاموشی کے ساتھ مجمع سے نکل آتے ہیں۔ لیکن طائف کے لوگ صرف اپنے تمسخر سے ہی مطمئن نہیں ہوجاتے۔ وہ آپ کے پیچھے تالیاں بجاتے اور شور مچاتے ہیں۔ ”یہاں سے نکل جاؤ‘ بھاگ جاؤ۔“ اور اس کے ساتھ ہی ایک جم غفیر اکٹھا ہو جاتا ہے اور آپ پر کنکریوں اور پتھروں کی بارش کرنے لگتا ہے۔ جن سے آپ زخمی ہو جاتے ہیں اور خون بہنے لگتا ہے حالانکہ آپ نے کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں کہا جس سے ان کے جذبات مجروح ہوتے ہوں۔

بالآخر زیدؓ اور آپ ﷺ ایک باغ میں پناہ لیتے ہیں۔ زیدؓ ان کے چہرہ سے خون پونچھتے اور زخموں پر پٹیاں باندھتے ہیں۔

آپ یہ طے کر رہے ہیں کہ مکہ کس طرح واپس پہنچیں۔ اونٹ پر سوار ہو کر جائیں یا پاپیادہ ہی سفر کریں کہ عداس نامی ایک غلام انگوروں کا ایک خوشہ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ آپ دریافت فرماتے ہیں کہ یہ کس نے بھیجا ہے۔

وہ جواب دیتا ہے ”عتبہ بن ربیعہ نے‘ وہی اس باغ کا مالک ہے اور اسے آپ پر ترس آیا ہے۔“

آپ فرماتے ہیں ”میری طرف سے اس کا شکریہ ادا کرنا۔“ اور یہ کہہ کر ہاتھ بڑھاتے ہیں اور بسم اللہ کہہ کر چند انگور منہ میں رکھ لیتے ہیں۔

عداس یہ سب کچھ دیکھتا ہے‘ پھر پوچھتا ہے کہ آپ ﷺ نے انگور کھانے سے پہلے یہ بسم اللہ کیوں پڑھی۔ آپ اسے بتاتے ہیں کہ بسم اللہ کے معنی ہیں اللہ کے نام سے شروع۔ پھر آپ اسے اسلام کے چند موٹے موٹے اصول بتاتے اور فرماتے ہیں کہ ایک سچے مسلمان کا فرض ہے۔ کہ وہ کھانے یا کسی کام کے کرنے سے قبل خدا کا نام

ضرور لے۔ کیونکہ تمام نعمتیں اسی کی عطا کردہ ہیں۔ اور ہر کامیابی اسی کے حکم سے ہوتی ہے۔

عداس جو ایک عیسائی ہے حیرت سے کہتا ہے۔ ''تب تو آپ کا مذہب ہمارے دین سے بہت ملتا جلتا ہے۔ مگر ان دونوں میں فرق کیا ہے؟''

اس فرق کو قرآن مجید میں بہت واضح کر کے بتایا گیا ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے ''کہو اللہ ایک ہے۔ وہ صمد یعنی بے نیاز ہے۔ نہ اس سے کوئی پیدا ہوا ہے۔ نہ وہ کسی سے پیدا ہوا ہے اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے۔ اور یہ بہت بڑا فرق ہے۔ اس کا عداس پر بڑا اثر ہوتا ہے اور وہ فوراً اسلام قبول کر لیتا ہے۔

محمد ﷺ جب وہاں سے روانہ ہوتے ہیں تو طائف کی خاک اپنے قدموں سے جھاڑ دیتے ہیں۔ آپ کے دل پر ایک بوجھ ہے اور آپ خدا سے لو لگا کر فرماتے ہیں۔ ''یا اللہ اس تذلیل سے میری بیچارگی مجھ پر عیاں ہو گئی ہے۔ میری سعی کے ناکارہ ہونے کا تجھے اندازہ ہو گیا ہے اور جو تنفران کو میری ذات سے پیدا ہوا ہے وہ بھی تجھ پر آشکار ہو چکا ہے لیکن جب تک مجھے تیرا تحفظ حاصل ہے اور میں کوئی ایسا کام نہیں کرتا جو تیری ناخوشی یا غضب کا باعث ہو۔ مجھے کسی کی پرواہ نہیں۔ تیرا رحم و کرم بے حد بے حساب ہے تو ہی تمام کمزوروں کا سہارا اور ملجا و ماویٰ ہے۔ میری یہی دعا ہے کہ تیرا عذاب مجھ پر کبھی نازل نہ ہو۔''

آپ کے یہ الفاظ بڑے معنی خیز ہیں۔ آپ کی زبان پر کوئی لفظِ شکایت نہیں آتی۔ آپ اب بھی اپنے فرض کی انجام دہی پر تیار ہیں۔ آپ کو کسی قسم کی مایوسی نہیں ہوئی۔ صرف اس پر اظہار افسوس فرماتے ہیں کہ دوسروں سے اپنی بات نہیں منوا سکتے۔ ان معاملات میں آپ نہ کسی مفاہمت پر آمادہ ہیں۔ نہ آپ کے عزم راسخ میں کوئی کمی آئی ہے۔ آپ کی صرف اتنی خواہش و تمنا ہے کہ آپ کا آقا و مالک ہمیشہ آپ سے خوش اور راضی رہے۔

............﴿3﴾............

محمد ﷺ مکہ واپس تشریف لے آئے ہیں۔ القدر کا مہینہ ہے۔ آپ کا جوش و

خروش بدستور قائم ہے۔ موسم حج کی دعوتیں جاری ہیں۔ مکہ میں ہر طرف چہل پہل ہے۔ بازاروں میں لباسوں کی رنگا رنگی دکھائی دے رہی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی یادگار منانے کے واسطے ہر قسم کے لوگ دور و نزدیک سے آ کر جمع ہوتے ہیں۔ ان میں یہودی بھی ہیں۔ بت پرست بھی اور عیسائی بھی۔ حاجیوں کے ساتھ بہت سے تاجر' شاعر' مغنی عورتوں اور مردوں کے طائفے بھی آ گئے ہیں۔ جن میں وہ زنان بازاری بھی شامل ہیں جو روپہلی دیناروں کے عوض اپنا جسم فروخت کرتی ہیں۔ یہ ایک ملی جلی آبادی ہے۔ جس کے کان ہر چیز سننے کے شیدائی ہیں۔ ہر طرح کے نیم حکیم سادھو سنیاسی' شعبدہ باز اور فقیر فقراء اپنے اپنے طور پر پیسہ کما رہے ہیں۔ کسی غیر معروف دین کی تبلیغ کے واسطے بھی نقصان کا کوئی اندیشہ نہیں اور فائدہ کا بہرحال امکان ہے۔ اس لیے پیغمبر ﷺ اس موقع سے پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ سڑکوں' گذرگاہوں' بازاروں غرضیکہ ہر جگہ آپ گھومتے پھرتے' مجمع کو اکٹھا کرتے اور بآواز بلند کعبہ کے مصنوعی خداؤں کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔ آپ عرب کے مختلف قبائل کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں ''معزز گھرانوں کے فرزندو' میں خدا تعالیٰ کا رسول ہوں۔ وہ حکم دیتا ہے کہ ''میرے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ اور ہر اس ہستی کو جسے تم اس کے ساتھ شریک عبادت کرتے ہو' دل سے نکال ڈالو۔ میرے اوپر جو وحی آتی ہے اس پر ایمان لاؤ اور اسے خدا تعالیٰ کا سچا کلام سمجھو۔''

اہل مکہ تو آپ کو بخوبی جانتے ہیں۔ اس لیے آپ کی باتوں کو ہنس کر ٹال دیتے ہیں۔ وہ یہ سب باتیں پہلے بھی سن چکے ہیں۔ اب ان کے دلوں پر مہر لگ چکی ہے۔ لیکن جو لوگ شہر میں اجنبی ہیں۔ ان کے دل آپ کی آواز کے سحر سے متاثر ہونے لگتے ہیں وہ آپ کی سیاہ آنکھوں میں آگ کی چمک اور رحم کے آنسو دیکھ کر ٹھٹک جاتے ہیں۔ بہت سے لوگ اس بات کی قسم کھانے کے لیے تیار ہیں کہ خواہ وہ کوئی بھی ہوں۔ یا ان کے عقائد کچھ بھی کیوں نہ ہوں لیکن اپنی باتوں میں مخلص ضرور ہیں۔ وہ آپ کو ایسا شخص پاتے ہیں۔ جس پر دنیاوی طمع یا لالچ کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا۔ جو اپنے شکوک

و شبہات کی گتھیوں کو پیچیدہ تاویلوں سے نہیں سلجھاتا اور جو زندگانی کی حقیقت اور اشیاء کی ماہیت سے کماحقہٗ آگاہ ہے۔ آپ کے پیغام میں لوگوں کو الوہیت کی شان نظر آتی ہے۔

گیارہ برس تک محمد ﷺ اپنے قلب کی گہرائیوں سے عجیب و غریب لَے سناتے رہے ہیں۔ لیکن بجز معدودے چند لوگوں کے باقی سب کو اس میں غیر آہنگی' بے سرا پن اور گنجلک صدائیں ہی نظر آتی ہیں۔ اس سال پہلا اتفاق ہے کہ آپ کی آواز میں اثر پیدا ہو رہا ہے۔ پہلی بار بچے آپ کی باتیں سننے کے لیے دوڑتے ہیں۔ جب کہ متمول اور راسخ العقیدہ لوگوں کے دل بھی پگھلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اور مایوسوں کے دلوں میں اُمید کی شعاعیں جھلکنے لگتی ہیں۔ سننے والے آپ کی زبان سے مزید کلام سننے کے تمنائی ہیں اور پاس کھڑے ہوئے لوگ وہاں سے ہٹنا نہیں چاہتے۔ آپ کی باتیں دلوں کو مسخر کر رہی ہیں۔ آپ کو لوگوں کا اعتماد حاصل ہو رہا ہے۔ اب شاید دنیا کا رخ بدل جائے۔

آپ کے مواعظ کو گوش توجہ سے سننے والوں میں پیغمبر ﷺ کو ایک روز یثرب کے چھ اصحاب ملتے ہیں۔ شام کے سائے کوہ عقبہ پر چھا چکے ہیں۔ آپ دن بھر تبلیغ کے فرائض انجام دے کر تھکے ہارے واپس لوٹ رہے ہیں کہ دھندلکے میں چھ سفید پوش شکلیں سایہ کی طرح دکھائی دیتی ہیں۔ وہ آپس میں بڑی سنجیدگی سے باتیں کر رہے ہیں۔ جب آپ ان کے پاس پہنچتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ حج کرنے کے لیے یثرب سے آئے ہیں۔ اور آپ کی تقاریر اور مواعظ سے بیحد متاثر ہوئے ہیں اور انہوں نے آپ کی آواز سن کر ہی یہ بات معلوم کر لی ہے کہ آپ کا تعلق قریش کے معزز خاندان سے ہے۔ وہ آپ کی زبان سے اس مقدس شہر' وہاں کے باشندوں اور کعبہ کے متولیوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔ آپ ان سب امور سے بخوبی واقف ہیں اور وہ بھی اپنے دل میں یہ بات بخوبی سمجھ چکے ہیں کہ آپ کسی نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔

آپ ان لوگوں کو پہلے کچھ اپنے متعلق بتاتے ہیں۔ پھر اس فرض منصبی کے

متعلق گفتگو کرتے ہیں۔ جس پر وہ منجانب اللہ مامور ہیں۔ اس کے بعد آپ اس تعذیب و تعدی کا ذکر کرتے ہیں۔ جس سے آپ کو اور آپ کے رفقاء کو سابقہ پڑ چکا ہے۔ اور یہ لوگ ان تمام باتوں کو بڑی توجہ سے سنتے رہتے ہیں۔

پیغمبر ﷺ کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ آپ کے الفاظ ان نوواردوں کے دلوں پر پوری طرح اثر پذیر ہوئے ہیں۔ اس لیے آپ کچھ دیر اور ٹھہرتے اور انہیں قرآن کی آیات سناتے ہیں۔ قبیلہ قریش کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے ان لوگوں کا یہ توقع کرنا تو درست ہے کہ آپ بڑی منجھی ہوئی عربی بولتے ہیں۔ لیکن جو عربی اس وقت آپ کی زبان پر جاری ہے اس کی تو کیفیت ہی جداگانہ ہے۔ ایسی شیریں زبان تو کبھی ان کے سننے ہی میں نہیں آئی۔ اچھا تو یہی وہ شخص ہیں جن کے حالات دمشق اور بیت المقدس جانے والے قافلوں کے لوگ سرگوشیوں میں بیان کرتے رہتے ہیں۔ یہی پیغمبر آخرالزمان محمدؐ ہیں جو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی جانشینی کے دعویدار ہیں۔

اس وقت کا یثرب دو قبیلوں اوس اور خزرج میں بٹا ہوا ہے۔ اور یہ جو چھ اشخاص آنحضرت سے قرآن شریف سن رہے ہوں۔ موخذ الذکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن کا قرب و جوار کے یہودی قبائل سے دوستانہ ہے۔ انہوں نے اکثر ان اسرائیلی رفقاء سے سنا ہے کہ ایک مسیحا کا عنقریب ظہور ہونے والا ہے۔ دراصل یہود تین پیغمبروں کے منتظر ہیں۔ مسیح کے عالیجاہ کی دوبارہ بعثت کے' اور ایک تیسرے پیغمبر کے جو حضرت موسیٰ" کی مثل ہوں گے۔ حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ نمودار ہو چکے ہیں۔ لیکن ایک تو شاہی دربار کی شہوت رانیوں کی بھینٹ چڑھ گئے اور دوسرے کو چوروں کی مانند مصلوب کر دیا گیا۔ اس لیے اہل یثرب کا گمان ہے کہ یہ وہی تیسرے پیغمبر ہیں جن کے یہودی منتظر ہیں۔ اور حضرت موسیٰ" کی یہ پیشن گوئی کہ "میں تمہاری طرح ان کے بھائی بندوں میں سے ایک پیغمبر پیدا کروں گا اور اس کے منہ سے اپنے الفاظ کہلواؤں گا۔" پوری ہو گئی ہے یا حضرت موسیٰ" کی بجائے حضرت عیسیٰؑ کی سفارش مقبول ہو گئی ہو۔ کیونکہ انہوں نے فرمایا تھا کہ "اگر تم مجھ سے محبت کرو گے اور میرے احکام پر عمل پیرا رہو گے تو میں اپنے آسمانی

باپ سے درخواست کروں گا کہ وہ تمہیں ایک دوسرا مسیحا عطا فرما دے۔" یہ بات تو مسلمہ ہے کہ کسی ایک فرد واحد نے بھی ان کے احکامات کی تعمیل نہیں کی لیکن ممکن ہے کہ اس کے باوجود خدا نے دوسرے مسیح کو مبعوث کر دیا ہو۔

بہر نوع محمد ﷺ موعودہ نجات دہندہ ہوں یا نہ ہوں۔ یثرب سے آنے والوں کو دو باتوں کا تو بالکل پختہ یقین ہو چکا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ان کے ملک میں ایک ایسے آقا کی سخت ضرورت ہے جو ان کو انہیں ایک جھنڈے تلے اکٹھا کر دے' جو صاحب جرأت و ہمت ہو' عزم کا پکا اور دل کا صاف ہو۔ تا کہ وہ ان تمام اخلاقی خرابیوں کا قلع قمع کر دے۔ جنہوں نے ان کے معاشرہ کو بدنام کر رکھا ہے۔ دوسرے انہیں اس کا بھی یقین ہو چکا ہے کہ جس شخص کی تلاش تھی وہ مل گیا ہے۔ مکہ کے رہنے والے محمد ﷺ میں وہ تمام صفات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اس لیے اب انہیں اس بات کی جلدی ہے کہ یثرب پہنچ کر لوگوں کو خوشخبری سنائیں کہ محمدؐ مبعوث ہو چکے ہیں اور اسلام کا پیام لوگوں تک پہنچا رہے ہیں۔

﴿4﴾

خاتون خدیجہؓ کی وفات ابھی تک محمد ﷺ کے واسطے سوہان روح بنی ہوئی ہے۔ پچیس برس آپ نے نہایت خوش وخرمی سے تاہل زندگی بسر کی۔ اکثر ایسے مرد اور عورتیں ہیں جنہیں شادی راس نہیں آتی۔ لیکن آپ اس معاملہ میں بڑے خوش قسمت ثابت ہوئے۔ اور جسمانی و روحانی دونوں حیثیتوں سے آپ کو مکمل سکون حاصل رہا۔ آپ فطرتاً کم آمیز واقع ہوئے ہیں۔ اور اب تو تنہائی کھلنے لگی ہے۔ تبلیغ اور تجزیہ نفسی کے بعد جب آپ تھکے ہارے گھر واپس تشریف لاتے ہیں تو خدیجہؓ آپ کا خیر مقدم کرنے اور تسکین و دلاسا دینے کے واسطے موجود نہیں ہوتیں' بچے دوڑ کر آپ سے لپٹ جاتے ہیں۔ اب وہ اتنے صاف ستھرے نظر نہیں آتے۔ وہ اپنی تکالیف اور مشکلات بیان کرتے ہیں۔ جو کبھی پہلے آپ کے کانوں تک نہیں پہنچی تھیں۔ اب ان کی وہ شفیق والدہ زندہ نہیں ہیں۔ ادھر کفار آپ کی تعذیب اور ایذا رسانی پر تلے ہوئے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ آپ کو عبدالکعبہؓ اور

بہادر عمرؓ جیسے دوست میسر ہیں۔ لیکن دوستوں کی معیت بیوی کی خدمات کا کسی صورت میں بھی بدل نہیں ہو سکتیں۔

اپنے صحابہ کے لیے محمد ﷺ محض پیغمبر ہی نہیں بلکہ ان کے آقا' ان کی زندگی کے مالک بھی ہیں۔ انہوں نے آپ سے وفاداری ہی کی قسم نہیں کھائی بلکہ اپنے دل بھی تحفۃً نذر کر دیئے ہیں اور انہیں بھی آپ کے اس نقصان عظیم کا پورا احساس ہے انہیں علم ہے کہ خدیجہؓ آپ کی زندگی میں کیا حیثیت رکھتی تھیں۔ انہیں اس کا بھی اندازہ ہے کہ آپ کی خوشی اور سکون قلبی کا اسلام کی تحریک پر بہت کچھ اثر پڑتا ہے' یہ لوگ آپ کو حقیقی معنوں میں انسان سمجھتے ہیں۔ لیکن دوسروں کی طرح جذباتی نہیں بلکہ صاحب عزم و ہمت' جرأت و شہامت۔ خواتین کو آپ میں وہ تمام صفات نظر آتی ہیں جو کوئی عورت مرد میں دیکھنا پسند کرتی ہے بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ہی ہیں جن کا خود ان کو بھی علم نہیں ہوتا۔ اس لیے یہ لوگ آپ کو مشورہ دیتے ہیں کہ دوسری شادی کر لیجئے۔ لیکن کس سے؟ بہت سی حسین و جمیل عورتوں کی نظریں اسلام کے اس رہنما پر پڑ رہی ہیں۔ ایک باوفا نوجوان مسلمان کی بیوہ سودہؓ ہیں۔ جن کا حال ہی میں حبشہ کی سرزمین پر انتقال ہو گیا ہے اور اب وہ بے سہارا رہ گئی ہیں۔ ان کے شوہر کسی زمانہ میں صاحب حیثیت تھے۔ لیکن جب دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تو مال و دولت نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ دوسری ابوبکر کی صغیر سن لڑکی عائشہؓ ہیں اور وہ خود آنحضرت ﷺ کے بچپن سے یار و وفادار ہیں۔ بلاشبہ اگر حضور کو اسلام کا دماغ کہا جائے تو ابوبکر اس کے دل ہوں گے۔ قول و فعل دونوں حیثیتوں سے وہ ایک تمثیلی مسلمان نظر آتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ عائشہؓ کی مناکحت کے ذریعہ دونوں گھرانوں میں تعلقات اور مستحکم ہو جائیں۔ انہوں نے پیغمبر ﷺ کے لیے اپنی دولت اور خود اپنے آپ کو وقف کر دیا ہے انہوں نے آپ کی خاطر اپنے دنیوی عہدوں اور مراتب کو بھی تج دیا ہے۔ ان کو اپنی لڑکی عائشہؓ میں اس کی ماں کا حسن اور قبیلہ کی ذہانت بین طور پر نظر آتی ہے اور ان کی خواہش ہے کہ حضورؐ اس اعتماد اور دوستی کے عوض جو اُن کو حاصل ہے اس نایاب تحفہ کو قبول فرما لیں۔

لیکن عائشہؓ ابھی زندگی کے پیچیدہ امور سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے بہت کمسن ہے۔ ان کی عمر اس وقت دس برس کی ہے۔ اور انہیں عائلی زندگی میں داخل ہونے کے لیے مزید پانچ برس درکار ہوں گے۔ لیکن ابوبکر کو اصرار ہے کہ شادی ابھی ہو جائے۔ چنانچہ پیغمبر اسلام محمد ﷺ اور عائشہؓ کی رسم نکاح ادا ہو جاتی ہے جس پر مسلمانوں کو بڑی خوشی ہے۔ اب اس رشتہ داری کے نتیجہ میں ان کو ایک اور نمایاں حیثیت حاصل ہوجاتی ہے اور لوگ انہیں ابوبکر یعنی ''اونٹ کا بچہ'' کے لقب سے یاد کرنے لگتے ہیں۔

عائشہؓ کو ابھی چند سال تک ہم برائے نام ہی آپ کی زوجہ کہہ سکتے ہیں۔ لیکن سودہؓ کا مسئلہ حل ہو چکا ہے اور مسلمان خوش ہیں کہ آپ نے ان سے شادی کر لی ہے۔ جس گھر میں وہ بیاہ کر آئی ہیں۔ اس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہاں ہر قسم کی آرائش کے سامان موجود ہیں۔ آج بھی حالت یہ ہے کہ قریش کی ایذا رسانی کے باعث آپ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن وہ جو چال بھی آپ کے خلاف چلتے ہیں۔ حضور ﷺ اپنی ذہانت سے اس کا تدارک کر لیتے ہیں۔ آپ کی ذاتی ضروریات بہت کم ہیں۔ غذا میں جَو کی روٹی اور پانی' کبھی کبھار گوشت اور اکثر و بیشتر دودھ ہوتا ہے۔ آپؐ اپنے جوتے خود گانٹھ لیتے اور کپڑوں میں اپنے ہاتھ سے پیوند لگا لیتے ہیں۔ البتہ آپ کا دماغ مختلف گتھیوں کو سلجھانے میں معروف رہتا ہے۔ راتیں زیادہ تر عبادت میں صرف ہوتی ہیں۔ قرآن خود اس کی گواہی دے رہا ہے کہ آپؐ دو تہائی رات نماز میں گزار دیتے ہیں۔ باقی اوقات میں آپ ان امور پر غور فرماتے رہتے ہیں کہ انسانی زندگی کے حقیقی مسائل کیا ہیں اور انہیں کس طرح حل کیا جا سکتا ہے۔

معراج :

اس دوران میں آپ کو ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آتا ہے۔ ایک شب آپ کوہ صفا اور مروہ کی درمیانی وادی میں جو مکہ سے ملحق واقع ہے۔ آرام پذیر ہیں کہ یکایک جبریل امین آ کر آپ کو بیدار کرتے ہیں۔ ان کے ہمراہ ایک سیاہی مائل سفید راہوار ہے۔ جس پر وہ آپ کو سوار ہونے کی ہدایت کرتے ہیں۔ اس گھوڑے میں جس کا

نام براق ہے وہ تمام صفات موجود ہیں جو علم الاصنام میں اڑن کھٹولوں یا آسمانی رتھوں کو حاصل تھیں اور آپ پلک جھپکتے مکہ معظمہ سے یروشلم کے دروازہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں آپ مسجد اقصیٰ میں داخل ہوتے ہیں۔ جہاں حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ آپ کے منتظر ہیں۔ آپ نماز میں ان کی امامت فرماتے ہیں۔ اس کے بعد حضورؐ پھر سوار ہو جاتے ہیں۔ اور براق فضا میں پرواز کرتا ہوا آپ کو پہلے آسمان تک پہنچا دیتا ہے۔ یہاں جبریل امین دستک دیتے ہیں تو اندر سے آواز آتی ہے۔

''جبریلؑ! تمہارے ساتھ کون ہیں؟''

وہ جواب دیتے ہیں ''محمد ﷺ۔''

پھر دریافت ہوتا ہے۔ ''کیا انہیں اجازت نامہ مل چکا ہے۔''

''ہاں' ان کو اجازت ہے۔''

''تب میں آپ کا خیر مقدم کرتا ہوں۔''

اس کے بعد دروازہ یکا یک کھل جاتا ہے۔

سب سے پہلے آپؐ کو جو انسان نظر آتا ہے ان سے حضرت جبریلؑ یہ کہہ کر تعارف کراتے ہیں کہ یہ آپ کے ابو الآبا آدمؑ ہیں۔

حضرت آدمؑ فرماتے ہیں کہ دنیا میں آپ ﷺ نے جو کارنامہ سرانجام دیا ہے اس سے تمام آسمانی مخلوق بہت خوش ہے۔ آپ میری تمام اولاد میں افضل ترین فرزند اور پیغمبروں میں اشرف الدنیا ہیں۔ اسی طرح محمد ﷺ ساتویں آسمانوں کی سیر کرتے اور مختلف انبیائے سلف مثلاً حضرت موسیٰ' حضرت ابراہیم' حضرت مسیح وغیرہ ہم سے داد تحسین وصول کرتے ایک بڑی عالیشان اور وسیع مسجد تک پہنچ جاتے ہیں۔ جو سرخ مونگے سے تعمیر ہوئی ہے اور جہاں ستر ہزار فرشتے رات دن عبادت الٰہی میں مصروف رہتے ہیں۔ یہاں سے آگے بڑھ کر آپ نور کے ایک بے پایاں سمندر کو عبور فرماتے ہیں۔ اور بالآخر خدائے قدوس کے سامنے بالمشافہ حاضر ہوتے ہیں۔ اس وقت آپ کے قلب کی یہ کیفیت ہے کہ اس کے شق ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔ بارگاہِ خداوندی

سے حکم ہوتا ہے کہ آپ دن رات میں پچاس نمازیں ادا کیا کریں اور بنی نوع انسان کو بھی یہی حکم دیں۔ لیکن واپسی پر آپ کی ملاقات حضرت موسیٰؑ سے ہوتی ہے اور وہ فرماتے ہیں کہ آپ باری تعالیٰ کے حضور میں عرض کریں کہ یہ تعداد بہت زیادہ ہے اور انسان اتنی عبادت کا متحمل نہ ہو سکے گا۔ اسے کم کرائیے۔ محمد ﷺ واپس جاتے ہیں اور چالیس نمازیں فرض کرا لیتے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ پھر وہی بات کرتے ہیں اور آپ کو لوٹا دیتے ہیں۔ اسی طرح دو تین چکر ہوتے ہیں اور بالآخر پانچ وقت کی نماز فرض ہو جاتی ہے۔

معراج کا واقعہ مسلمانوں کے درمیان مابہ النزاع بن جاتا ہے۔ جو زیادہ عقیدت مند ہیں ان کو اس میں بہت سے حقائق پنہاں نظر آتے ہیں۔ بالخصوص اس سفر میں پنج وقتہ نماز کا فرض ہونا بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ چند لوگوں کا خیال ہے کہ معراج جسمانی تھی اور آپ بہ نفسِ نفیس آسمانوں پر تشریف لے گئے تھے اور بعض اسے خواب کا درجہ دینے پر بھی تیار نہیں۔ حضورؐ کے دشمنوں کو گندہ ذہنی اور آپ کو بدنام کرنے کا اچھا موقع ہاتھ آ گیا ہے وہ مسلمانوں سے کہتے ہیں ''تم دیکھتے ہو کہ وہ خدا سے ملاقات کر آئے ہیں۔ اب تم لوگ ان کی نظروں میں کیا حیثیت رکھتے ہو۔ تم سے تو اب وہ بات بھی نہ کریں گے۔''

دوسرا کہتا ہے ''مجھے تو ان کا یہ گھوڑا پسند آیا ہے۔ اگر مجھے مل جائے تو صبح کا ناشتہ یہاں کروں، دوپہر کا کھانا مشتری میں جا کر کھاؤں اور رات کا جوزا میں۔''

تیسرا مسخرا یوں مذاق کرتا ہے ''میں تو آسمانوں پر جانا ہرگز پسند نہ کروں گا۔ ذرا خیال تو کرو۔ ستر ہزار فرشتوں کی آوازیں دن رات سنتے رہنے سے کان کے پردے نہ پھٹ جائیں گے۔''

قرآن چونکہ اس واقعہ کا ذکر کرتا ہے اس لیے اہل اسلام کے دلوں میں تو معراج کے متعلق کوئی شک و شبہ نہیں۔ لیکن اس کی اصل حقیقت اور اہمیت کیا ہے؟

مسلمانوں کو پہلی مرتبہ ایک ایسے بیان سے واسطہ پڑتا ہے جو مابہ النزاع بن

گیا ہے۔ خود پیغمبر ﷺ نے اس کی کوئی تشریح نہیں کی ہے۔ نہ اسے کوئی زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ لیکن آپ کے صحابہ میں اس کی نوعیت پر سخت اختلاف ہے۔ عقل جذبات سے اور جذبات عقل سے دست و گریباں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اسلام کو ایک دھچکا سا لگا ہے اور یہ عجیب خواب چند ہفتوں کے اندر وہ سب کچھ کر دکھاتا ہے جو قریش کی تیرہ سالہ جدوجہد بھی نہیں کر پاتی۔ لیکن ابوبکرؓ اس کی حمایت میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور مناقشہ فوراً ہی ختم ہو جاتا ہے۔

مکہ میں تو معراج کے متعلق چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ لیکن یثرب کے وہ چھ مسلمان وہاں پہنچ کر زور و شور سے اسلام کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ انہوں نے جو بیج اپنے وطن کی زرخیز زمین میں بویا ہے وہ نشوونما پا رہا ہے۔ چنانچہ اگلے حج کے موقع پر چند نو مسلم یثرب سے مکہ جاتے ہیں تاکہ حضورؐ کے ہاتھ پر بیعت کریں۔ اس مرتبہ بھی وہ عقبہ ہی میں ملتے ہیں جہاں ایک سال قبل پہلے چھ یثربی دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ لیکن اس مرتبہ ان کی تعداد پہلے کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔ وہ حضورؐ سے وعدہ کرتے ہیں کہ اپنی عبادت میں اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو شریک نہ کریں گے۔ نہ چوری کریں گے نہ بدکاری' نہ زنا کے قریب پھٹکیں گے۔ اس کے علاوہ بدگوئی سے بھی تائب ہوئے اور اولاد کو ہلاک نہ کرنے کا بھی وعدہ کرتے ہیں۔ یہ بھی قول دیتے ہیں کہ آئندہ سے حضورؐ کی ہدایات پر کاربند رہیں گے اور اسلام سے کبھی منحرف نہ ہوں گے۔

پیغمبر ﷺ مصعبؓ بن عمیر کو ان نومسلموں کے ساتھ یثرب بھیجتے ہیں تاکہ وہاں کے لوگوں کو قرآن اور نئے مذہب کی بنیادی باتیں سکھائیں۔ یہ صحابی بہت پُرجوش کارکن ثابت ہوتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ لوگ حلقۂ اسلام میں داخل ہو جائیں۔

ان کو یثرب زیادہ دن نہیں ہوتے کہ شہر کے ارباب حل و عقد میں سے اسعید اُن کے پاس آتے اور دریافت کرتے ہیں کہ آپ کے یہاں آنے کا کیا مقصد ہے۔ کیا آپ ہماری فوج کے اعداد و شمار جمع کر رہے ہیں؟ میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ اگر جان

عزیز ہے تو فوراً واپس تشریف لے جایئے۔"

مصعبؓ بڑے اطمینان سے کہتے ہیں کہ بیٹھ جایئے اور میری بات سن لیجئے۔ اس کے بعد وہ اُسید سے اسلام اور آنحضرت ﷺ کی تبلیغ کے متعلق گفتگو کرتے اور قرآن پڑھ کر سناتے ہیں جس کا ان پر اتنا گہرا اثر ہوتا ہے کہ وہ فوراً اسلام قبول کر لیتے ہیں۔

اب ایک سے دو مبلغ ہو جاتے ہیں اور ان کی متفقہ کوشش یہ ہے کہ قبیلہ اوس کے سردار سعد بن معاذ کو کسی طرح اہل اسلام کے زمرہ میں شامل کر لیا جائے۔ چنانچہ مصعبؓ ان کے نام ایک ترغیب آمیز خط اس مضمون کا لکھتے ہیں۔"جناب والا! جو بات میں آپ کو لکھ رہا ہوں وہ اگر آپ کے دل کو لگتی ہے تو اس کو قبول فرما لیجئے اور اگر ناپسند ہو تو مجھے فوراً ٹوک دیجئے۔" مصعبؓ کو علم ہے کہ سعدؓ ایک شریف النفس، منصف مزاج شخص ہیں۔ اور معاشرہ میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں ان سے سخت بیزار ہیں۔ اس لیے وہ قرآن سے ایسی عبارتیں چھانٹتے ہیں۔ جو اثر انداز ہو سکیں۔ اور انہیں اسلام کی طرف راغب کر دیں۔ چنانچہ توقع کے بموجب وہ فوراً ہی ایمان لے آتے ہیں۔

صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اس زمانے کے مسلمانوں کی طرح انہوں نے بھی تبلیغ کا کام شروع کر دیا ہے۔ اور اب حالت یہ ہو گئی ہے کہ جس طرح ان کو ترغیب دی گئی تھی اسی طرح وہ اب دوسروں کو نئے مذہب کی دعوت دیتے پھرتے ہیں۔ خود اسلام لانے کے بعد وہ قبیلہ کے جرگے میں اس سوال کو چھیڑتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ وہ کس طرح مختلف شکوک وشبہات میں مبتلا تھے۔ لیکن اسلام کی تعلیم نے ان سب کو کس طرح رفع کر دیا۔ پھر قرآن کے متعلق فرماتے ہیں کہ وہ کتنی عجیب وغریب کتاب ہے۔ وہ مکہ کے مبلغ مصعبؓ سے اپنی بحث کا بھی تذکرہ کرتے ہیں جنہوں نے ان کے ہر اعتراض کا معقول و مسکت جواب دے کر ثابت کر دیا کہ اسلام میں ہر دشواری کا حل موجود ہے۔ پیغمبر ﷺ کے متعلق وہ لوگوں کو بتاتے ہیں کہ ان میں فخر وغرور کا شائبہ تک نہیں۔ نہ وہ کسی قیادت کے خواہاں ہیں۔ بلکہ انہوں نے تو اس مذہبی فریضہ کی ادائگی کے مقابلے میں بادشاہت

کی پیشکش کو بھی ٹھکرا دیا ہے۔ ان کو نہ کوئی خوف اس سے باز رکھ سکتا ہے نہ لالچ۔ کسی قسم کی کوئی تحریص ان کے قدم کو ڈگمگا نہیں سکی۔ اس کے بعد وہ لوگوں کو یہ بھی بتاتے ہیں کہ موجودہ سیاسی اور معاشرتی جمود سے نکلنے کے لیے انہیں اس وقت مسلمہ قابلیت کے انسان کی سخت ضرورت ہے اور اس مقصد کے واسطے محمد ﷺ سے بہتر رہنما ملنا ناممکن ہے۔

وہ بڑے زوردار الفاظ میں کہتے ہیں کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم کو نجات کے طریقوں پر غور کرنا چاہیے۔ حضرت موسیٰؑ سے حضرت عیسیٰؑ تک ہر پیغمبر نے ایک نبی کے آنے کی بشارت دی ہے جو تمام بھٹکے ہوئے گمراہ انسانوں کو اپنے گرد جمع کر لیں گے۔ بھائیو اور بزرگو! میں محمد ﷺ کی ذات میں ان صفات حمیدہ اور علامتوں کو دیکھ رہا ہوں جن کی تمام انبیائے سابقہ نے خبر دی ہے۔ اب ہمارا ایک ہی فرض رہ جاتا ہے کہ بڑھ کر ان کا دامن تھام لیں۔ اور نہ صرف یہ کہ خود مسلمان ہو جائیں بلکہ ان کو یہاں آنے کی دعوت دیں اور انہیں اپنا راہبر و راہنما بنا لیں۔''

سعدؓ کے اس جوش اور ولولہ کا دوسروں پر فوری اثر ہوتا ہے۔ ان کی تقریر سے لوگوں میں نئی امیدیں جنم لینے لگتی ہیں۔ نیا مذہب یثرب میں سیلاب کی طرح بڑھنے لگتا ہے۔ یہودی' عیسائی' بت پرست' صابی' مجوسی' زردشتی' عالی' عالم' نوجوان' بچے' بوڑھے اور امیر و غریب سب ہی اس دھارے کے ساتھ بہنے لگتے ہیں۔ یوں سمجھئے جیسے آندھی کے ساتھ آگ کے شعلے ہوں اور وہ آناً فاناً سارے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیں۔

اسلام کی وہ شمع جو آج سے چودہ سال قبل ایک تاریک رات میں غار حرا کے اندر روشن ہوئی تھی اب اہل یثرب کے نازک دلوں میں شعلہ بھڑکا رہی ہے۔ اس لو کو جب اہل مکہ شمال سے بھڑکتے ہوئے دیکھتے ہیں تو انہیں احساس ہوتا ہے کہ اسلام کے مقابلے میں ان کی تمام کوششیں ناکامیاب ہو گئی ہیں۔ لیکن اب سب کچھ بعد از وقت ہے۔ کیونکہ اس شمع نے دنیا میں ایک آگ بھڑکا دی ہے۔

5

جولائی کی ایک تاروں بھری رات ہے۔ آسمان پر ہلکا سا بے رونق چاند نیند کی

جھپکیاں لے رہا ہے۔ گرم ہوا ر تیلی پہاڑیوں کو تھپکیاں دے رہی ہے۔ ہلکے نیلے آسمان پر حور صحرائی کی آنکھوں کے مانند ٹمٹماتے رہے ہیں۔ دارالندوہ میں مجلس شوریٰ منعقدہ ہے فوق البھڑک لباسوں اور صیقل شدہ تلواروں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ قریش کے تمام اکابر موجود ہیں۔ ان کے چہروں کی سنجیدگی سے ہویدا ہے کہ کوئی بڑا اہم مسئلہ زیر بحث ہے۔ سب لوگ اپنی فہم و فراست کے مطابق رائے زنی کر رہے ہیں۔ ان میں کعبہ کے کلید بردار عثمان بن طلحہ' امیر عساکر ابوسفیان بن حرب' امیر مالیات حارث بن قیس بھی شامل ہے۔ وقت تو ایسا ہے کہ اہل مکہ سب کے سب خواب راحت میں مصروف ہیں۔ لیکن موقع کی نزاکت نے اکابرین کی آنکھوں کی نیند حرام کر دی ہے۔

مکہ کے جاسوسوں نے حضورﷺ کو کڑی نظروں میں رکھا ہے۔ وہ آپ کی نقل و حرکت اور تدابیر سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کو یثرب میں پیش آنے والے واقعات کا بھی علم ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ مصعبؓ نے وہاں کیا کارگزاریاں کیں اور سعدؓ نے کیسے جھنڈے گاڑے۔ اوس کے سردار کی کاروائیاں' پہلی بیعت عقبہ اور اس کے بعد دوسری خفیہ بیعت اور اہل یثرب کا آپ کو مدعو کرنا' سب ان کے علم میں آچکا ہے' انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ عباس نے قبیلہ سے غداری کر کے رشتہ داری کو ترجیح دی ہے اور محمدﷺ کی جماعت میں شریک ہو گئے ہیں۔ یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ مسلمان مکہ چھوڑ کر برابر یثرب کی طرف ہجرت کیے چلے جا رہے ہیں۔ اور ان میں حضورﷺ کے قریبی دوست بھی شامل ہیں۔ اور اہل خاندان بھی' جاسوسوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ اس وقت محمدﷺ مکہ میں بالکل تنہا ہیں۔ صرف علیؓ اور ابوبکرؓ ان کے ساتھیوں میں باقی رہ گئے ہیں۔ اور اب وہ بھی زیادہ عرصہ قیام نہ کریں گے۔

ابوسفیان اور ابوجہل (جس کا اصل نام ابوالحکم بن ہاشم ہے) اور ابولہب اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اب وقت ضائع کرنے کا موقع نہیں۔ محمدﷺ ان کے درمیان کبھی ایسے نہتے اور بے دست و پا نہ تھے جیسے اس وقت ہیں۔ ان کے بااثر رشتہ دار سب رخصت ہو چکے ہیں۔ ساتھی ہجرت کر گئے ہیں اور اب کوئی ان کا پناہ دہندہ بھی باقی نہیں

رہا۔ ہم لوگوں میں ان کی غیر ہردلعزیزی مسلم ہے۔ اور اس وقت ان کی موت سب ہی کی خوشی اور اطمینان کا باعث ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اگر وہ اطمینان سے جان بچا کر یثرب پہنچ گئے تو ایک زبردست مستقر ان کے ہاتھ میں آجائے گا۔ وہاں کے لوگ انہیں اپنا مذہبی پیشوا تسلیم کر لینے کے علاوہ ان کی دنیاوی سیادت کو بھی تسلیم کر لیں گے اور مکہ کے لیے ایک مستقل خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ اس وقت ان کا اس طرح یک و تنہا بے یارو مددگار رہ جانا ہمارے نزدیک مشیت ایزدی سے کم حیثیت نہیں رکھتا۔

اہل قریش آپ کے قتل پر تو متفق الرائے ہیں لیکن ٹیڑھا سوال یہ ہے کہ جلاد کے فرائض کون انجام دے' کیونکہ عرب میں خون کے بدلے خون کی پرانی روایت چلی آرہی ہے۔ کوئی ایک متنفس بھی بنی ہاشم کے قبیلہ سے خونی دشمنی مول لینے پر تیار نہیں۔ آج ابوجہل کا دماغ کچھ غیر معمولی طور پر بیدار ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میری عقل ایک نیا راستہ دکھا رہی ہے۔ یہ سن کر ہر شخص اس کی طرف کان لگا دیتا ہے۔ وہ کہنا شروع کرتا ہے۔ "اس جھوٹے پیغمبر (نعوذ باللہ) کی موت ہم سب کے لیے یکساں اہمیت رکھتی ہے۔ اس لیے میری تجویز ہے کہ ہم میں سے ہر قبیلہ کا ایک جنگجو اس کار خیر کے واسطے سامنے آئے اور یہ پوری جماعت ایک دم ان پر جھپٹ پڑے اور ان کا قیمہ کر دے۔ اس طرح کسی ایک قبیلہ کو قتل کا مرتکب گردانا مشکل ہو جائے گا۔ اور بنو ہاشم کس کس سے انتقام لیتے پھریں گے۔ یہ تمام اہل قریش کا فیصلہ ہوگا اور سب ہی اس کے ذمہ دار ہوں گے۔ اس لیے اگر وہ ہم سے خون بہا طلب کریں گے تو ہم سب مل کر اسے ادا کریں گے۔"

اس تجویز پر ہر طرف سے مرحبا! مرحبا! کی صدائیں بلند ہوتی ہیں اور ابوجہل کی فہم و فراست پر لوگ عش عش کرنے لگتے ہیں۔

تجویز کو بروئے کار لانے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ مجمع میں سے ہر نوجوان جنگجو اپنے آپ کو اس خدمت کے لیے پیش کر دیتا ہے کہ ہم اپنے شہر کو اس مصیبت سے

جس میں وہ مبتلا ہو گیا ہے' چھٹکارا دلانے کے لیے حاضر ہیں۔

نوجوان کے کام عقل نہیں بلکہ جذبات کے تابع ہوا کرتے ہیں۔ اس لیے انہیں میں سے ایک جماعت منتخب کر لی جاتی ہے۔ اور فوراً ہی یہ لوگ ابوجہل کی سرکردگی میں اس مکان کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ جس میں حضور ﷺ قیام پذیر ہیں۔ رات بالکل تاریک ہے' صرف چند ستارے کہیں کہیں ٹمٹماتے نظر آتے ہیں۔ مکان تک پہنچنے کے تمام راستوں پر پہرہ بٹھا دیا جاتا ہے اور قرب و جوار کے گھروں کی چھتوں پر نظر رکھی جاتی ہے۔

صبح کی دھندلی قرمزی روشنی میں یہ لوگ دیکھتے ہیں کہ محمد ﷺ چارپائی پر محوِ خواب ہیں۔ پائتی پر آپ کی ہری قبا بے ترتیبی سے پڑی ہوئی ہے۔ ابوجہل کا دل خوشی سے جستیں کر رہا ہے۔ اب اس کو اپنی بتائی ہوئی ترکیب میں پوری کامیابی ہوتی نظر آ رہی ہے۔ اب دیوتاؤں کا انتقام نزدیک آ چکا ہے۔ وقت تیزی سے گزر رہا ہے۔ آفتاب کے طلوع ہونے میں کچھ عرصہ باقی ہے اور صرف پہاڑیوں کے اوپر چند ہلکے بادلوں نے ہی اپنا رنگ تبدیل کیا ہے۔

ابوجہل کو جلدی ہے۔ وہ ساتھیوں سے کہتا ہے ''ہمیں کافی دیر ہو گئی ہے سورج نکلنے سے قبل ہی ہم کو چاہیے کہ مکہ کو اس مصیبت سے ہمیشہ کے لیے نجات دلا دیں۔ اب دیر نہ کرو۔''

اس پر تلواریں نیاموں سے باہر نکل آتی ہیں۔ ایک دم یورش ہوتی ہے۔ مکان کا دروازہ توڑ دیا جاتا ہے۔ غیض و غضب میں بھرے ہوئے' خون کے پیاسے بھیڑیے چارپائی کو گھیر لیتے اور سبز عبا کو اٹھا کر ایک طرف پھینک دیتے ہیں۔ یکایک پلنگ پر سونے والا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہے۔ اور حملہ آور یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ کہ وہ تو حضرت علیؓ ہیں جن کی آنکھوں میں اب تک نیند کے سائے تیر رہے ہیں۔ علیؓ اس طرح جیسے انہیں کسی بات کا علم ہی نہیں دریافت کرتے ہیں ''کیا معاملہ ہے؟ آپ لوگ کیا چاہتے ہیں۔'' وہ لوگ بڑی رعونت سے جواب دیتے ہیں ''تمہیں معلوم ہے کہ ہم کو کس

کی تلاش ہے۔ بتاؤ محمد ﷺ کہاں ہیں؟

علیؓ بھی نہایت تلخی سے کہتے ہیں "خود ڈھونڈ لو مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟" ابوجہل دھاڑتا ہے "گھر کا کونہ کونہ دیکھ ڈالو۔ اور اگر نہ ملیں تو یثرب کو جانے والی سڑک پر پہرہ بٹھا دو' اگر ہمیں سو میل بھی تعاقب میں جانا پڑے تب بھی کوئی وادی' کوئی پہاڑی نہ چھوڑیں گے۔ جہاں انہیں تلاش نہ کیا جائے۔"

جب قریش کو علم ہوتا ہے کہ ان کی آخری چال بھی ناکامیاب رہی اور ان کا شکار بچ کر نکل گیا تو اپنی بوٹیاں نوچنے لگتے ہیں۔ دارالندوہ کی طرف سے اعلان ہوتا ہے کہ جو کوئی محمد ﷺ کو زندہ یا مردہ پیش کرے گا۔ اسے سو اونٹ انعام میں دیئے جائیں گے۔ ابوجہل کے آدمی یثرب کی طرف دوڑتے ہیں۔ ابوسفیان اپنی فوج کے سپاہی آپ کی تلاش میں بھیجتا ہے اور سارا مکہ اس جستجو میں شریک ہو جاتا ہیا

"محمد ﷺ! محمد ﷺ! کہاں ہیں؟" ہر شخص ایک دوسرے سے یہی سوال کر رہا ہے۔ علیؓ مسکراتے ہوئے اپنا سامان سمیٹتے اور ایک اونٹ پر سوار ہو کر یثرب کی طرف کوچ کر دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنی جان پر کھیل کر آقا کی جان بچا لی ہے۔ اب جو وہ جا رہے ہیں تو بازاروں میں لوگ ان پر آوازے کستے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں انہیں قتل کر دو۔ لیکن اس وقت ہر شخص کی توجہ امیر اسلام کی طرف ہے۔ انتقام دراصل ان سے لینا ہے اس لیے ماتحتوں کی کوئی زیادہ پرواہ نہیں کرتا اور وہ اطمینان سے چلے جاتے ہیں۔

محمد ﷺ! محمد ﷺ! کہاں ہیں' ہر شخص اسی موضوع پر بحث کر رہا ہے۔ لیکن اسماء کھانا لیے ہوئے کھیتوں میں سے گزر رہی ہیں۔ اور ان کی باتیں سن کر دل ہی دل میں مسکراتی جاتی ہیں۔ وہ اتنی صغیر سن ہیں کہ لوگ ان کی طرف دھیان بھی نہیں دیتے۔ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے والد ابوبکر کہاں ہیں۔ اسی لیے ان کی آنکھوں میں راز کی چمک نظر آتی ہے۔ لیکن چہرہ کو سنجیدہ بنائے ہوئے ہیں۔ اسماء کی عمر اس وقت آٹھ سال کی ہے لیکن وہ مکہ کی موجودہ سیاست سے بخوبی واقف ہیں۔

کھیتوں میں عمیر بن فہیرہ بکریوں کا ایک ریوڑ ہنکاتے ہوئے ملتے ہیں۔ وہ

دوڑ کر ان کے پاس پہنچتی اور ان کا ہاتھ اپنی ننھی منی انگلیوں میں لیتی ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ یہ بچی کون ہے اور کدھر جا رہی ہے۔ رات کی سیاہی پر ہلال کی روشنی اپنا پرتو ڈال رہی ہے۔ عمیر باقی بکریوں کو ایک جگہ بند کر کے ایک کو اپنے ساتھ لے لیتے ہیں اور دونوں پہاڑیوں اور دروں کے درمیان ایک سنسان راستہ پر چلتے ہوئے ثور نامی غار تک پہنچ جاتے ہیں۔ اسماء پیچھے مڑ کر دیکھتی ہیں کہ کوئی تعاقب تو نہیں کر رہا۔ عمیر کہتے ہیں۔ ''اطمینان رکھو' پیچھے کوئی نہیں۔'' اور وہ آنکھ جھپکتے غار میں داخل ہو جاتی ہیں۔ جہاں حضرت ابوبکرؓ انہیں چھاتی سے لگا لیتے ہیں اور وہ ان کے ہاتھ چومنے لگتی ہیں۔

عمیر حضرت ابوبکرؓ سے دریافت کرتے ہیں ''ادھر کوئی آیا تو نہیں تھا'' اور جواب کے واسطے ان کی نظریں حضور ﷺ کی طرف پھر جاتی ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ فرماتے ہیں ''کچھ لوگ یہاں تک پہنچ گئے تھے۔ اور ہمارے پکڑے جانے میں کوئی کسر نہ رہ گئی تھی۔ قریش کے بھیجے ہوئے چند آدمی دوپہر کے تھوڑی دیر بعد غار کے دروازہ تک آ گئے۔ ان کی آوازیں کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ دراصل وہ دوسری جانب تھے اور تعجب ہے کہ انہوں نے ادھر آنے کا خیال نہیں کیا' معلوم نہیں کیا بات ہوئی۔ مجھے تو ایسا لگتا تھا کہ آخری وقت آ پہنچا ہے اور میں نے حضورؐ سے عرض کیا کہ ہم صرف دو ہیں۔ اس پوری جماعت کا مقابلہ کس طرح کر سکیں گے۔ لیکن آپ نے ارشاد فرمایا کہ ہم دو نہیں تین ہیں۔ اللہ بھی ہمارے ساتھ ہے۔'' اس پر پیغمبر صاحب خوش ہو کر فرماتے ہیں ''تم نے دیکھ ہی لیا کہ اللہ نے کس طرح ہماری مدد کی اور دشمنوں کو ہمارے راستے سے ہٹا دیا۔

حضرت ابوبکرؓ کو اس پر قدرے ندامت ہوتی ہے کہ انہیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے تھی۔

بکری ان مہاجرین کی اپنے دودھ سے تواضع کر چکی ہے۔ اسماء اور عمیر تھوڑی دیر ٹھہر کر چلے جاتے ہیں۔ اس کے بعد رات بسر کرنے کی تیاری شروع ہوتی ہے۔ ابوبکرؓ ایک پتھر پر سر رکھ کر سونے کو لیٹ جاتے ہیں اور محمد ﷺ نماز میں مصروف ہو جاتے

ہیں۔

کتنی ہی دشواریاں اور مصیبتوں کا سامنا ہو' محمد ﷺ کو اس ہستی پر مکمل ایقان ہے۔ جو کل کائنات کا حقیقی مالک ہے اور جس کے دست قدرت میں تقدیروں کا الٹ پھیر ہے۔ چنانچہ آپ اس کی عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔ قریش جو کچھ اچھا بُرا کر سکتے تھے سب کچھ کر چکے۔ پہلے انہوں نے آپ کے معدودے چند ساتھیوں کو مجبور کر دیا کہ وہ ہجرت کر کے حبش چلے جائیں۔ پھر جو بچ رہے۔ ان کو اتنا تنگ کیا کہ وہ مکہ سے نکل کر دوسرے شہروں میں جا بسے۔ اور اب خود آپ کو بھی وطن سے نکالا جا رہا ہے۔ اس وقت بھی جب کہ محمد ﷺ اپنے خدا کے سامنے سربسجود ہیں لوگ ان کو چپہ چپہ پر تلاش کرتے پھر رہے ہیں کہ اگر کہیں مل جائیں تو بیدریغ فنا کے گھاٹ اتار دیں۔ اس کے لیے انہوں نے ایک گرانقدر انعام مقرر کر رکھا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کی بات پر جس طرح حضور ﷺ نے خدا کو درمیان میں ڈالا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو اپنے پروردگار کی اعانت پر کس قدر اعتماد ہے۔ جس زمانہ میں حالات انتہائی ناساعد تھے۔ اس وقت بھی آپ کی اس عقیدت میں ذرہ برابر فرق نہیں آتا۔ نہ آپ کو کسی قسم کا شک وشبہ پیدا ہوتا ہے۔ دشمنوں نے آپ سے سب ہی کچھ چھین لیا ہے لیکن آپ کو مطلق ہراس نہیں ہے اور خدا تعالیٰ کی ذات پر آپ کو جو ایقان ہے اس میں شمہ برابر کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔

تین سال قبل آپ پر یہ وحی نازل ہوئی تھی۔ ''اے محمد ﷺ! ان کی باتوں سے آپ دلگیر نہ ہوں۔ کیونکہ تمام طاقتیں صرف اللہ ہی کو حاصل ہیں۔ وہ تمام باتوں کو سننے اور تمام امور کو جاننے والا ہے۔ آپ اپنا فرض مستقل مزاجی اور منصفانہ طور پر ادا کیے جائیے۔ اگر اللہ آپ کو کسی قسم کا نقصان پہنچانا چاہے تو سوائے اس کے کوئی آپ کو اس سے محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ اور اگر وہ آپ کو کسی نعمت سے سرفراز فرمانا چاہے تو کسی کی طاقت نہیں کہ اس کو روک سکے۔ آپ تو اس پر جو کچھ آپ پر وحی کیا گیا ہے' کاربند رہیے اور اس وقت تک صبر و انتظار کیجیے جب اللہ فیصلہ فرما دے۔ اور اللہ بہترین فیصلہ

کرنے والا ہے۔"

انتظار کی گھڑیاں آپ کے پیمانہ صبر کو لبریز نہیں کر سکتیں۔ کیونکہ آپ کو وحی کے ذریعہ اطلاع دے دی گئی ہے کہ ہم بھی انتظار کر رہے ہیں۔ آپ اپنے رب کی عبادت میں معروف رہیے اور اسی پر بھروسہ کیجئے۔ کیونکہ یہ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔" ایک اور وحی میں بتایا گیا ہے "یقیناً آپ سے پہلے بھی پیغمبروں کے ساتھ بہت تمسخر کیا گیا ہے اور ہم نے ان کفار کو بہت ڈھیل دی۔ لیکن بالآخر ہم نے ان کو اپنی گرفت میں لے لیا اور ہماری تعزیر بڑی سخت ہوتی ہے۔" اس لیے ان تمام مصائب کے دوران میں آپ کو یہ طمانیت و اطمینان حاصل ہے کہ "اللہ نے اپنے پیغمبر سے جو وعدہ کیا ہے وہ ضرور پورا ہو گا کیونکہ اللہ بڑا طاقتور ہے" آپ کو یہ بھی ہدایت کی گئی ہے کہ "اے محمد ﷺ! آپ صبر سے کام لیں۔ وہ صبر جو اللہ کی رضا کے واسطے ہو، جو سلوک وہ آپ کے ساتھ کر رہے ہیں۔ اس پر دل تنگ نہ ہوں۔"

مکی دور کے اختتام تک ہم دیکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ جس طرح ابتدا میں خدائے وحدہٗ لاشریک کی حمد و ثنا بیان فرماتے رہتے تھے بالکل اسی طرح اطمینان قلبی کے ساتھ اب بھی اس کی تعریف و توصیف میں منہمک رہتے ہیں۔ "تمام حمد و ثنا اس پروردگار عالم کے واسطے مخصوص ہے جس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا۔ جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو یا پوشیدہ رکھتے ہو وہ ان سب سے کلی طور پر واقف ہے۔ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ دن اور رات اسی کے قبضہ اقتدار میں ہیں۔ آپ سے پہلے بھی پیغمبروں کا ابطال کیا گیا تھا۔ لیکن انہوں نے ہر قسم کی مصیبتوں اور مخالفتوں کے مقابلے میں صبر کیا۔ حتیٰ کہ ہماری مدد ان تک پہنچ گئی۔ آپ کو معلوم ہے کہ قریش آپ کی جان کے درپے ہیں اور آپ کے احباب و اصحاب اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں۔ لیکن آپ کے تیقن میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ مکہ میں جو آخری وحی نازل ہوئی اس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں "جو لوگ ایمان لائے وہی کامیاب ہیں۔" اس سورۃ کے آخری الفاظ بھی کچھ کم اہمیت کے حامل نہیں جن میں فرمایا گیا ہے "اس وقت بھی جب کہ بجز ابوبکرؓ عمیر یا ننھی اسماء کے آپ بالکل بے

یار و مددگار ہیں اور مقابل میں کفار قریش کی تمام شیطانی طاقتیں بالمقابل ہیں اور وہ آپ کی تلاش میں سرگرداں پھر رہے ہیں۔ آپ کو مستقبل کے بارے میں کوئی تشویش نہیں۔ حضور ﷺ کو اطمینان ہے کہ آپ اللہ کو مستقبل کے بارے میں کوئی تشویش نہیں۔ حضور ﷺ کو اطمینان ہے کہ آپ اللہ کے کلام کی اشاعت فرما رہے ہیں اور اگر اس سلسلہ میں قتل بھی ہو جائیں تو اللہ خود ہی اس کے لیے کوئی دوسرا انتظام فرما لے گا۔ ممکن ہے کہ کوئی شخص اس کو مقدرات کی سردمہری اور رضاجوئی پر معمول کرے۔ لیکن تقدیری معاملات پر کلی اعتماد بھی تو جرأت و شہامت ہی کا نام ہے اور اب جو آپ محو عبادت ہیں تو خدائے قدوس کی طرف سے یہ جواب ملتا ہے ''جس ذات بے ہمتا نے تم کو یہ قرآن حکیم عطا فرمایا ہے۔ وہ یقیناً تمھیں واپس لائے گی۔''

رات کے آخری لمحوں میں بھی عادت کے مطابق محمد ﷺ تہجد کی نماز ادا کرتے ہیں۔ آپ کی زندگی میں یہ رات بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ابوسفیان کے آدمی ابھی تک قرب و جوار کی پہاڑیوں میں گھوم رہے ہیں۔ اور نیچے وادی میں اہل مکہ محو خواب ہیں۔ محمد ﷺ اپنی ان شکستہ اُمیدوں کی طرف نظر کرتے ہیں جو اب تک آپ کی جائے پیدائش سے وابستہ رہی تھیں۔ جس شہر میں آپ پلے بڑے۔ جہاں آپ نے اپنی زندگی کے بہترین دن گزارے' جہاں آپ کے عزیز و اقرباء آباد ہیں۔ آپ کوہ عرفات اور غار حرا کی جانب دیکھتے ہیں۔ جہاں آپ گھوما کرتے اور عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ یا گھر میں بیٹھ کر پہاڑیوں کے اوپر سورج کی کرنوں کے رقص کرنے کا نظارہ کیا کرتے تھے۔ اب وہی شہر ہے جہاں سے آپ کو نکالا جا رہا ہے اور آپ اس کے قرب میں ایک غار کے اندر مفرور کی حیثیت سے مقیم ہیں۔ اُدھر شمال میں یثرب ہے۔ جو اب آپ کی اُمیدوں کا مرکز ہے۔ اور حضور ﷺ کو یقین ہے کہ اگر آپ وہاں تک بخیریت پہنچ گئے تو ایک شاندار مستقبل آپ کے قدم چومے گا۔ پندرہ برس تک دین کی تبلیغ میں جو کوششیں ہوئیں ان کے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہو سکے۔ اب بالآخر ان کی کامیابی کا وقت آپہنچا ہے۔ تیس برس قبل آپ سے بہت سی اُمیدیں وابستہ کی گئی تھیں لیکن اب ان کے پورا

ہونے کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔ دل آپ کا اب بھی یہی چاہتا ہے کہ آپ کو مدینہ کی بجائے مکہ میں کامیابی حاصل ہوتی۔ لیکن انسان کی ہر خواہش تو پوری نہیں ہو سکتی۔

کعبہ آپ کے لیے چشم بصیرت ہے اور وہ اشارہ کر رہا ہے کہ اللہ ایک دن ایسا ضرور لائے گا جب آپ اپنے وطن مکہ کو واپس تشریف لے آئیں گے۔

چوتھا باب

"مُصلح"

یثرب میں ہلچل مچی ہوئی ہے۔ ریگستان کو عبور کرتی ہوئی یہ خبر کسی طرح یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ محمد ﷺ مکہ سے روانہ ہو چکے ہیں اور مدینہ کی طرف عازم سفر ہیں۔ مکہ کے شہسوار اگر محمد ﷺ کی تلاش میں کونہ کونہ چھان رہے ہیں تو مدینہ کے سوار بھی افق پر آپ کی سواری آتے دکھائی دینے کے منتظر ہیں۔ یعنی مکہ اور یثرب دونوں اس وقت آپ کے طالب ہیں۔ اور دونوں شہروں میں آپ کے متعلق انتہائی جوش و خروش نظر آتا ہے۔ شہر کے لوگ دیہات تک جاتے اور ایک دوسرے سے دریافت کرتے ہیں "تم میں سے کسی نے آپ ﷺ کو دیکھا ہے؟"

جب محمد ﷺ اور ابوبکرؓ غار ثور سے سمندر کی جانب بڑھتے ہیں تو قسمت کے ترازو کے دونوں پلڑے ہموار دکھائی دیتے ہیں۔ ایک میں موت ہے اور دوسرے میں سلطنت۔ ایک یا دو مواقع ایسے بھی آتے ہیں کہ بچ نکلنے کی اُمید موہوم ہو جاتی ہے۔ سراقہ بن مالک جو عرب کا بہترین شہسوار گردانا جاتا ہے' سنتا ہے کہ حضور ﷺ مع ابوبکرؓ کے سمندر کے کنارے مجہول راستے پر سفر فرما رہے ہیں تو وہ اپنے گھوڑے کو مہمیز دیتا اور تعاقب میں روانہ ہو جاتا ہے اور اتنی تیزی سے پیچھا کرتا ہے کہ اس کے ہمراہی بھی اس کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ وہ ان دونوں کو دور ہی سے پہچان لیتا ہے۔ ادھر ابوبکرؓ بھی اس کے نیزے کی چمک دیکھ کر چلا اٹھتے ہیں "یا رسول اللہ ﷺ! دشمن سر پر آ گیا۔" لیکن آپ بڑی بے جگری سے فرماتے ہیں "ابوبکرؓ! ڈرو نہیں! اللہ ہمارے ساتھ ہے۔" اور پھر

اس کی طرف متوجہ ہو کر کہتے ہیں "اچھا تم ہو سراقہ!"

یکا یک سراقہ کا گھوڑا الف ہو جاتا ہے۔ اس کے قدم ریت میں پھسلتے ہیں اور سوار زمین پر گر کر پٹخیاں کھانے لگتا ہے۔ قریشی بھوچکا رہ جاتا ہے۔ اس نے معجزات کا حال سنا ہے اور یہ معمولی سا واقعہ اس کے نزدیک معجزہ کی شکل اختیار کر کے بڑی اہمیت کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔ سراقہ کہتا ہے کہ "صرف اللہ ہی آپ کو ایسی حالت میں نجات دلا سکتا ہے اور مجھے یقین آ گیا ہے کہ اللہ آپ کی پشت پناہی کر رہا ہے اور آپ اس کے مقبول نبی ہیں۔ اس بنا پر میں مسلمان ہوتا ہوں اور درخواست کرتا ہوں کہ خدا کے حضور میں میرے لیے دعا فرمائیں۔"

تھوڑی دیر کے بعد جب اس کے ساتھی وہاں پہنچتے ہیں تو یہ دیکھ کر ششدر رہ جاتے ہیں کہ ان کے سردار نے باغی قوم محمد ﷺ کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں۔ حضور ﷺ اپنے اونٹ سے اتر کر سراقہ کو سینے سے لگا لیتے ہیں اور اسے بھائی کہہ کر مخاطب ہوتے ہیں "میرے بھائی ایک وہ وقت آنے والا ہے جب خسرو پرویز کے سنہری کنگن تمہارے ہاتھوں میں پہنائے جائیں گے۔"

آخر حضور ﷺ قبا پہنچ جاتے ہیں۔ جو یثرب سے ایک گھنٹہ کی مسافت پر چھوٹی سی بستی ہے۔ یہاں اکثر زراعت پیشہ لوگ آباد ہیں۔ جن میں عمرو بن عوف سب سے زیادہ ممتاز سمجھے جاتے ہیں۔ قمری مہینے کی بارھویں تاریخ اور ہجرت کا آٹھواں دن ہے۔ آپ نے پانچ دن سفر میں گزارے ہیں اور تین روز غار ثور میں تکالیف و صعوبت' تعذیب وا بتلا' اخراج و مقاطعہ اب ماضی کی داستانیں بن چکی ہیں۔ کتاب اسلام کا ایک نیا باب کھل چکا ہے اور تاریخ ہجرت کے نام سے ایک نیا سفر شروع کر رہی ہے۔

آنحضرت ﷺ چند روز عمرو بن عوف کے ہاں قیام کرتے ہیں۔ لیکن کیا آپ کے لیے آرام ممکن ہے؟ کیا کسی روشنی کا جھاڑ جھنکاڑ میں پوشیدہ رہنا' یا کسی ہردلعزیز شخصیت کا اپنے پرستاروں سے چھپا رہنا ممکن ہے؟ اہالیان یثرب کو آپ کا پتہ لگا لینے میں کچھ دیر نہیں لگتی۔ عمرو کے مکان پر ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے ہیں۔ ہر شخص طالب

دیدار ہے۔ میلوں تک خبر گشت کر رہی ہے کہ یثرب کے نئے راہنما تشریف لے آئے ہیں۔ گردونواح میں آباد قبیلوں کے سردار آپ کو خیر مقدم کہنے اور غریب اپنی آنکھیں آپ کے دیدار سے مشرف کرنے کی غرض سے حاضر ہو گئے ہیں۔ انسانی تاریخ میں عرصہ دراز کے بعد پیغمبری اور شاہی ایک فردِ واحد میں مجتمع ہو گئی ہے۔

اب علیؓ بھی تشریف لے آئے ہیں اور ان کو ہجرت کے معاملہ میں ایک خاص حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ پیغمبر ﷺ کو اس امر میں بڑا تذبذب تھا کہ جو امانتیں اہل مکہ نے آپ کے پاس رکھوائی تھیں ان کو واپس دیئے بغیر آپ کس طرح شہر کو خیرباد کہیں۔ لیکن علیؓ نے اس کام کا ذمہ لیا اور زور دیا کہ چونکہ آپ کی زندگی خطرہ میں ہے۔ اس لیے آپ ﷺ کو فوراً تشریف لے جانا چاہیے۔ تین دن تک آپ یہی کام کرتے رہے لیکن اس معاملہ میں نہ قریش نے کوئی مزاحمت کی نہ انہیں کوئی خطرہ لاحق ہوا۔ ان کی اسی جرأت و ہمت کے دوست دشمن سب ہی معترف ہیں اور اسی کی وجہ سے آپ کو صحابہ کرام میں سب سے زیادہ شریف النفس اور مخلص سمجھا جاتا ہے۔ اگر وہ آنحضرت ﷺ کے صلبی فرزند ہوتے تب بھی اس سے زیادہ اطاعت شعاری اور فرمانبرداری ممکن نہ ہوتی۔

محمد ﷺ کی المدینہ میں آمد (کیونکہ یثرب کو مدینتہ النبی یا پیغمبر کا شہر کہا جانے لگا اور پھر یہ نام مختصر ہو کر مدینہ رہ گیا۔) اسی طرح ہوئی جیسی توقع تھی۔ صبح بڑی شاندار ہے۔ موسم اعتدال پذیر ہے۔ تمام شہر خوشیاں منا رہا ہے اور ہر شخص اس فکر میں ہے کہ اس خوشی و مسرت میں کس طرح اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی خیال ذہنوں میں گردش کر رہا ہے کہ اگر کسی سے آپ ﷺ کی شان میں ادنیٰ سی گستاخی ہو جاتی ہے تو اہل مدینہ اس کو اپنی اہانت سمجھیں گے۔ بلکہ قریش نے حضور ﷺ کے خلاف جو سازش کی تھی اسے بھی مدینہ کے لوگ اسی نظر سے دیکھتے ہیں۔ آپ ﷺ کا اپنے متعاقبین سے بچ کر نکل آنا ان کے نزدیک اس بات کی دلیل ہے کہ خود خداوند قدوس نے مدینہ کو آپ کے قیام کی سعادت بخشی ہے۔ ہر گھر کو آراستہ کیا گیا ہے ہر عورت بہترین لباس میں ملبوس ہے۔ بچے خوشی سے دیوانہ ہو کر گلیوں میں دوڑتے پھرتے ہیں۔ سڑکوں پر خوشیاں

منانے والی مختلف جماعتوں کے ٹھٹ لگے ہوئے ہیں اور آپ ﷺ جلوس کی شکل میں شہر کے اندر داخل ہو رہے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کوئی زبردست فاتح کسی زبردست اقلیم کی تسخیر کے بعد وطن واپس لوٹا ہے۔ اس جلوس پر تو شاید رومن شہنشاہ بھی' جن کی شان و شوکت ضرب المثل ہے' حسد کرنے لگتے۔ کیونکہ اس وقت جس جوش و خروش کا مظاہرہ ہو رہا ہے وہ لوگوں کے دلوں کی آواز ہے نہ افسروں کی کارپردازی اور حسن انتظام۔

ہر طرف سے مہمانداری کے لیے اصرار ہو رہا ہے۔ مقامی آبادی میں سعدؓ کا جو مرتبہ اور اعزاز ہے اسے دیکھتے ہوئے وہ اپنے آپ کو میزبان بننے کا مستحق سمجھتے ہیں۔ مصعبؓ ہیں جو اپنے ہردلعزیز رہنما اور پیغمبر پر اپنے گھر کے دروازے کھول کر بے حد خوش ہوں گے۔ ایک طرف عمیرؓ ہیں اور دوسری طرف ابوایوب انصاریؓ جو آپ کی خدمت کو اپنی انتہائی سعادت تصور کریں گے۔ یا خود حضرت عثمانؓ موجود ہیں جو حضور ﷺ کی دختر حضرت رقیہؓ کے شوہر اور اس لحاظ سے آپ کے قریبی رشتہ دار بھی ہیں۔ بعض لوگ آپ کے اونٹنی کی نکیل پکڑ کر اپنے مکان کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ لیکن آپ نہایت نرمی سے انہیں روکتے اور فرماتے ہیں کہ اسے اپنی مرضی پر چلنے دو' وہ خود بہت سمجھدار ہے اور اپنی منزل پہچانتی ہے۔ چنانچہ وہ چلتے چلتے عمیرؓ کے فرزندوں کی فرس گاہ کے قریب ٹھہر جاتی ہے اور آپ اُتر کر مجمع کے درمیان سے گزرتے ہوئے ابوایوب نصاریؓ کے ہاں قیام کے واسطے تشریف لے جاتے ہیں۔

حضور ﷺ کی خواہش ہے کہ شہر میں جس مقام پر آپ اترے ہیں اسے ایک خاص مذہبی حیثیت دے دی جائے۔ اس قطعہ زمین کے وارث دو خوردسال یتیم بچے ہیں۔ آپ ان کی سرپرست کو طلب فرماتے اور قیمت طے کرتے ہیں۔ بچے چونکہ صاحب حیثیت ہیں اس لیے وہ اس اراضی کو ہدیۃً پیش کرنے کے متمنی ہیں۔ لیکن آپ اس کو منظور نہیں فرماتے اور قیمت ادا فرما دیتے ہیں۔ اور یہاں اسلام کی دوسری مسجد تعمیر ہوتی ہے۔ کیونکہ پہلی کی بنیاد تو حضور ﷺ قبا میں چند روز قبل ہی رکھ چکے ہیں۔

آنحضرت ﷺ خود اس کی تعمیر میں معمولی مزدوروں کی طرح کام کرتے ہیں۔ وہ ہر طرح اس بات کا اظہار کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ان کی حیثیت معمولی انسان جیسی ہے۔ آپ کو اس طرح سرگرم عمل دیکھ کر ہر پیشہ اور ہر طبقہ کا مسلمان اس کارِ ثواب میں برابر کا شریک ہو جاتا ہے اور آہستہ آہستہ ان مخلص کارکنوں کی بدولت تعمیر کا اہم کام انجام کو پہنچ جاتا ہے۔

تقدیر نے اس انقلاب کے سعی و محنت کے دوسرے دروازے بھی کھول دیئے ہیں' جیسے جیسے اسلام کا درخت تناور ہو رہا ہے حضور ﷺ وقت کی مناسبت سے فائدہ اٹھا کر انتھک کوشش فرما رہے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ لوگ خدائے وحدہٗ لاشریک کے راستہ پر گامزن ہو جائیں۔ اتنی زبردست کامیابی آپ میں شمہ برابر بھی تو احساس غرور و تفاخر پیدا نہیں کر سکی۔ نہ آپ پر طاقت و اقتدار کا کوئی اثر ہوا ہے۔ آپ اب بھی ویسے ہی منکسر المزاج اور ہمدرد ہیں۔، نہ آپ کسی سے اپنی رائے منوانے کے لیے اصرار کرتے ہیں۔ نہ خود کو کسی سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ ہر چھوٹے بڑے سے ملتے اور حسب دستور خوش خلقی سے پیش آتے ہیں۔ اپنے تمام کام خود ہی سرانجام دیتے ہیں۔ کپڑوں کی مرمت کرتے' گھر میں جھاڑ دیتے' بازار سے سودا سلف لانے یا اونٹوں کو دانہ پانی دینے میں کوئی عار نہیں سمجھتے۔ ایک فرمانروا کے لیے یہ بات عجیب سی لگتی ہے۔ لیکن اس سے لوگوں میں آپ کی عزت دوبالا ہو گئی ہے۔

اسلام کی ترقی اب بھی آپ کی زندگی کا اوّلین مقصد ہے اور بڑی سے بڑی خوشی یا کامیابی بھی آپ کے خیالات کا رُخ کسی دوسری جانب نہیں پھیر سکتی۔ اب آپ اس دھن میں لگے ہیں کہ اپنے پیروؤں کے مختلف مصالح کو ایک نقطہ پر مرکوز فرما دیں۔ قدیمی بغض و عناد کو مٹا کر مسلمانوں میں اخوت اور بھائی چارہ کی روح پھونک دیں۔ معاشرتی خرابیوں کا سدباب کیا جائے۔ اور بُت پرستی کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا جائے۔ اور انہیں باتوں پر آپ اپنا وقت' محنت اور مساعی صرف کر رہے ہیں۔ آپ نے اپنے زمانے کے معاشرتی نظام کی خامیوں کا پوری طرح جائزہ لے لیا ہے اور اب آپ کو اس

بات کا موقع حاصل ہوا ہے کہ اپنی رائے کو قانونی حیثیت دے کر اس کا اجراء فرمائیں اور عملی طور پر اس کا نفاذ ہو کر معاشرہ کی روزمرہ زندگی میں اصلاح ہو جائے۔

﴿2﴾

آنحضرت ﷺ نے مدینہ تشریف لا کر چند مہینوں کے اندر ہی جو اصلاحات نافذ فرمائیں وہ قدرے تفصیل طلب ہیں۔

مسجد کی تعمیر کا مرحلہ مکمل ہو جانے کے بعد حضور ﷺ کی توجہ جس دوسرے سوال کی طرف منعطف ہوئی وہ بھی کچھ کم اہم نہیں۔ یعنی مکہ سے آنے والے مہاجرین کی مدینہ میں حیثیت جو باوجود اہل یثرب کی عدیم النظیر مہمان نوازی کے بہرحال اس شہر میں اجنبی ہی ہیں۔ مہاجرین مکہ پہلے اسلام قبول کرنے کے باعث' نیز اس وجہ سے کہ انہوں نے اسلام کے نام پر سب کچھ تج دیا ہے۔ سابق الاولون کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں اور اس بناء پر وہ اپنی فوقیت کا اظہار کرتے ہیں۔ اہل مدینہ جن کا لقب اب انصار ہو گیا ہے۔ اپنے آپ کو اس لحاظ سے برتر سمجھتے ہیں کہ اگر ان کی بروقت امداد شامل حال نہ ہوتی تو حضور ﷺ کو نہ کوئی قوت حاصل ہوتی نہ اقتدار۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ فریقین میں سے جو لوگ کچھ جوشیلے ہیں ان میں اس پر مباحثہ اور گرما گرمی بھی ہونے لگتی ہے۔ جب یہ معاملہ حضور ﷺ کے سامنے آتا ہے تو آپ بڑی آسانی سے اس کا حل تلاش کر لیتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ اسلام اونچ نیچ کی تمیز نہیں کرتا۔ تمام مسلمان بھائیوں کی طرح برابر ہیں۔ اس لیے آپ ہر مہاجر کو ایک انصار کا بھائی بنا دیتے ہیں۔ یہ ایک ایسا فیصلہ ہے جس کی مثال دنیا کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔ آپ دونوں کو نصیحت فرماتے ہیں کہ ایک دوسرے کو حقیقی بھائی کی طرح سمجھیں۔ اس طرح ہر مہاجر کو گھر' سامان' جائیداد اور روپیہ میں نصف حصہ مل جاتا ہے۔ بادی النظر میں یہ گمان ہو گا کہ اس طرح انصار کے دلوں میں ان سے کدورت پیدا ہو گئی ہو گی۔ لیکن معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ اس پر بہت خوش ہیں۔ روپیہ کے معاملہ میں بھی ان کو کوئی خسارہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ مہاجرین تجارت پیشہ لوگ ہیں اور انصار کی زرعی اور باغبانی پیداوار کو بہتر

طریقہ اور حتی الامکان زیادہ منافع پر فروخت کرتے ہیں۔ اس طرح مدینہ میں ایک نئے قسم کا معاشرہ جنم لیتا ہے جس میں تقسیم عمل متناسب ہے اور محنت سے حاصل کردہ سرمایہ معقول طریقے پر تقسیم ہوتا ہے۔ مخدوم بننے کے لیے پہلے خدمت گزار بننا ضروری ہے۔ عمدہ معاشرہ کی بنیادی شرط یہ ہے کہ خود غرضی کو روکا جائے۔ انفرادی کوششوں کی ہمت افزائی کی جائے اور سب لوگوں میں مشترکہ ایثار و قربانی کی روح پھونک دی جائے۔ مدینہ میں جو اب معاشرہ قائم ہو رہا ہے۔ اس میں ان تمام اصولوں کو سمو لیا گیا ہے۔ کیونکہ اس کے متعلق حضورؐ کا وہی خیال ہے۔ جو خدا تعالیٰ کے متعلق ہے۔ محمد ﷺ کا خدا جیسا کہ سب دیکھ چکے ہیں کسی ایک قبیلہ کا دیوتا نہیں ہے۔ وہ نہ ابراہیمؑ کا خدا ہے نہ یعقوبؑ کا' وہ تو رب العٰلمین ہے۔ وہ تمام دنیا جہاں اور بنی نوع انسان کا' خواہ وہ اسے تسلیم کریں یا نہ کریں۔ اللہ بھی ہے اور خالق بھی' رب بھی ہے رازق بھی۔ اس لیے جو معاشرہ اسلام نے قائم کیا۔ اسکے دروازے ہر شخص پر کھلے ہوئے ہیں۔ اور اس میں رنگ' نسل یا دولت و ثروت کی کوئی تمیز نہیں۔ وہ تو ایک بھائی چارہ ہے۔ ایک اعلیٰ درجہ کی اخوت ہے۔ بالکل ایسی ہی جس کی ''ابن اللہ'' حضرت مسیحؑ نے نشاندہی کی تھی اور اب ابن الصحرا (آنحضرت ﷺ) اسے عملاً قائم کر رہے ہیں۔

محمد ﷺ اپنے صحابہ کے معاملات میں خواہ کتنے ہی منتظم اور منصرم کیوں نہ ہوں لیکن سوال یہ ہے کہ جو لوگ آپ کے معتقد نہیں ان کے بارے میں آپ کا کیا رویہ ہے؟ کیا یہودیوں اور عیسائیوں سے بھی ویسا ہی انصاف اور اسی قسم کی رواداری کا سلوک فرماتے ہیں؟

آج سے چند سال قبل کی بات ہے جب آپ نے کفار مکہ سے فرمایا تھا کہ آپ ان خداؤں کی پرستش نہیں کریں گے جن کی وہ پوجا کرتے ہیں اور نہ وہ لوگ آپ کے خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ اور اللہ فیصلہ کر کے دونوں کو جداگانہ اجر دے گا۔ قسمت کے پانسہ کی یکا یک تبدیلی کے بعد بھی دنیاوی معاملات میں آپ کی رائے تبدیل نہیں ہوئی۔ باوجود اس کے کہ آپ کو سرزمین عرب سے شرک اور بت پرستی کا قلع قمع کر دینے

کی فکر کے علاوہ دوسرے اہم فرائض بھی سرانجام دینے پڑتے ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر آپ کی حیثیت پیغمبر ہی کی ہے۔ طاقت کے حصول نے آپ کے خیالات میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی۔ آپ کی آواز پر لبیک کہیں یا الامان' اسلام قبول کریں یا رد کریں۔ اگر وہ مسلمان ہو جائیں تو فبہا اگر نہ ہوں تو اللہ خود ان سے نپٹ لے گا۔ محمد ﷺ کو تو صرف ان ہدایات پر عمل پیرا ہونا ہے جو بذریعہ وحی آپ کو ملتی رہتی ہیں۔

شہر کے لوگوں میں ایک اہم طبقہ اہل یہود کا بھی ہے۔ جنہوں نے نئے پیغمبر کی آمد پر مبارکباد اور خیر مقدم میں حصہ تو ضرور لیا ہے لیکن زیادہ جوش و خروش کا اظہار نہیں کیا۔ ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ جب سے قوت و اقتدار نے ان سے کنارہ کشی اختیار کی ہے وہ برابر افق پر نظریں گاڑے ہوئے ہیں کہ کب ایک نئے پیغمبر مبعوث ہوں اور انہیں دودھ اور شہد کی سرزمین (ارض فلسطین) میں لے جا کر دوبارہ آباد کریں۔ حضرت موسیٰ ؑ کے بعد وقتاً فوقتاً نبی آتے رہے لیکن انہوں نے سب کو اشتباہ کی ہی نظر سے دیکھا۔ جب تک محمد ﷺ مکہ میں تھے یہود نیم دلی ہی سے سہی لیکن بہرحال خیال کرتے تھے کہ مسیح موعود تشریف لے آئے ہیں۔ لیکن اب انہوں نے اپنی رائے تبدیل کر دی ہے۔ اب انہیں محمد ﷺ پر بھی اتنا ہی شک و شبہ ہے جتنا یسوع مسیح پر تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ کیونکہ آپ تو ایک معمولی سا دربان اور سردار قبیلہ میں کوئی فرق روا نہیں رکھتے۔ ان کے مذہبی اصول یہودیوں کے اس متکبرانہ عقیدہ کو تسلیم نہیں کرتے کہ وہ خدا کی چہیتی اور برگزیدہ قوم ہیں۔ آنحضرت ﷺ بہت جلد ان کے اس خوف و ہراس کا اندازہ فرما لیتے اور فوراً ہی ان کے خدشات کو دور کرنے کی کوشش فرماتے ہیں۔ مذہبی امور کے متعلق وہ جو کچھ آزادی چاہتے ہیں سب منظور کر لی جاتی ہے۔ بلکہ مزید مراعات سے بھی ان کو نوازا جاتا ہے اور اس کے جواب میں ان سے صرف اتنی ہی خواہش کی جاتی ہے کہ مدینہ اور اہل مدینہ کے وفادار رہیں۔ چنانچہ ایک دستاویز تیار ہوتی ہے جس کے مطالعہ سے حضور کی بلندیٔ فکر و نظر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ محمد ﷺ کی جانب سے ایک معاہدہ ہے مسلمانوں

(جن میں اہل قریش اور اہل یثرب دونوں شریک ہیں) اور ان لوگوں کے درمیان جو تعاون کرنے پر تیار ہیں خواہ ان کا تعلق کسی نسل یا فرقہ سے ہو۔ وہ سب مل کر ایک قوم کہلائیں گے۔ پھر تمام شرائط گنانے کے بعد معاہدہ میں تحریر کیا گیا ہے کہ اعلان جنگ اور معاہدہ صلح تمام مسلمانوں کے لیے لازم ہو گا۔ کسی ایک فرد واحد کو بھی یہ حق حاصل نہ ہو گا کہ دین کے دشمنوں سے صلح کرے یا ان کے خلاف اعلان جنگ کرے۔ جو یہودی ہمارے ساتھ شریک ہوں گے وہ ہر قسم کی اہانت و تعذیب سے محفوظ و مامون رہیں گے۔ انہیں مسلمانوں کے ساتھ مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔ یہودی یا اور لوگ جو مدینہ میں آباد ہیں سب ایک قوم سمجھے جائیں گے۔ اور انہیں اپنے مذہب اور عقائد میں پوری آزادی حاصل ہو گی۔ مجرموں کے ساتھ کوئی رعایت نہ ہو گی۔ ان کا تعاقب کیا جائے گا اور سزا دی جائے گی۔ اگر یثرب پر حملہ ہو گا تو یہود اس کی مدافعت میں مسلمانوں کی امداد کریں گے۔ اہل اسلام اور اہل یہود دونوں کے حلیفوں سے تعرض نہ کیا جائے گا۔ جو شخص بھی کسی جرم، ناانصافی یا بدعنوانی کا مرتکب ہو گا اس کو ہر مسلمان نفرت کی نظر سے دیکھے گا۔ خواہ وہ اس کا قریبی رشتہ دار کیوں نہ ہو۔ آخر میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ جو لوگ اس معاہدہ میں شریک ہیں ان کے تمام باہمی جھگڑوں کے فیصلہ کے واسطے حضورؐ کے سامنے پیش ہوا کریں گے۔

جب شرائط کا اطلاق عیسائیوں اور آتش پرستوں پر بھی ہونے لگا تو یوں سمجھنا چاہیے کہ جس نرمی اور رواداری کی اساس اس معاہدہ میں رکھی گئی تھی اس کی تکمیل ہو گئی۔ اوّل الذکر جو مراعات آپ ﷺ نے فرمائیں ان کی تفصیل ہمیں ان الفاظ میں ملتی ہے۔ "نجران اور گردو نواح کے عیسائیوں کو خدا اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے ان کے جان و مال اور دین کا تحفظ حاصل ہو گا۔ ان کے مذہب یا اس کے متعلق رسوم سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا۔ جو حقوق و مراعات ان کو اس وقت حاصل ہیں۔ وہ بعینہٖ قائم رہیں گی۔ صلیب یا مقدس مورتیوں کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ نہ ان پر کوئی سختی ہو گی نہ انہیں کسی پر سختی کرنے کا حق ہو گا۔ البتہ زمانہ جاہلیت میں قتل کے بدلے انتقام کا

جو دستور رائج تھا وہ منسوخ کیا جاتا ہے۔" آتش پرستوں کے ایک مبلغ کو جو پروانہ آپ کی طرف سے عطا ہوا اس کا مضمون بھی کچھ اسی قسم کا ہے۔ "محمد ﷺ کی طرف سے فرخ بن شخصان اس کے اہل خاندان اور احلاف کے نام' قطع نظر اس کے کہ ان میں سے کوئی دائرۂ اسلام میں شامل ہو۔ یا اپنے آباؤ اجداد کے مذہب پر قائم رہے اس خط کے ذریعے ان سب کے جان و مال اور اس تمام اراضی کا جو میدان میں واقع ہو یا وادیوں میں کلی تحفظ دیا جاتا ہے۔ ان کے ساتھ نہ کوئی ناانصافی ہو گی نہ ظلم' اور جو کوئی میرا یہ خط پڑھے اس پر لازمی ہو گا کہ ان شرائط کا پوری طرح اہتمام کرے۔ ان کے آتش کدے اور اس سے متعلق جائیداد کلیتہً انہیں کے قبضہ میں رہے گی۔ اور ان کے مذہب یا معاشرہ کے متعلق کسی قسم کی کوئی دست اندازی جائز نہ ہو گی۔

آنحضرت ﷺ نے دوسرے مذہب کے لوگوں سے جس قسم کی رواداری کا سلوک کیا اس کا سمجھنا کچھ مشکل نہیں۔ قرآن شریف کے صفحات پر نظر ڈال لی جائے۔ آپ کو سو سے بھی زیادہ ایسے مقامات ملیں گے جہاں خدا تعالی نے وحی کے ذریعہ سے یہ بات واضح کر دی ہے کہ نجات صرف مسلمانوں ہی تک محدود نہیں۔ ایک حالیہ سورۃ میں ارشاد باری تعالی ہے "ہم نے ہر ایک کو ایک دین اور ایک طریق عطا کیا ہے۔" اگر خدا تعالی کی مشیت ہوتی تو تمام دنیا ایک ہی قوم ہوتی۔ لیکن اس کی مرضی دوسری ہی تھی۔ قرآن اس سے بھی آگے بڑھ کر کہتا ہے "جو کوئی بھی خدا پر ایمان لاتا اور نیک عمل کرتا ہے خواہ وہ اہل کتاب ہوں (یعنی مسلمان' یہودی' عیسائی) یا صابی اس کے لیے اجر ہے کیونکہ مذہب میں کوئی جبر و اکراہ نہیں ہے۔" صراط مستقیم' گمراہی سے بالکل جداگانہ راستہ ہے جو شخص بھی معبود ان باطل کو ٹھکراتا اور اللہ پر یقین کامل رکھتا ہے اس نے درحقیقت ایسی مضبوط رسی کو پکڑ لیا ہے جو ٹوٹ نہیں سکتی۔ کیونکہ اللہ سمیع و علیم ہے۔ دوسرے پیغمبروں اور رہنماؤں کی مدافعت میں جو طریق عمل آپ نے اختیار فرمایا وہ بذات خود آپ کی مثال رواداری پر دلالت کرتا ہے۔ خود اپنے متعلق تو آپ ایک عام انسان ہونے سے زیادہ کسی اونچے مرتبے کا دعویٰ نہیں کرتے۔ لیکن انبیائے ماسلف کے متعلق آپ کے

خیالات بہت بلند ہیں۔آپ ان سب کو برگزیدہ اور معصوم قرار دیتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کی راست گفتاری اور بے باکی' حضرت یوسفؑ کی عصمت' حضرت لوطؑ کے اعلیٰ کردار پر آپ کی مہر تصدیق ثبت ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کو آپ روح اللہ تسلیم فرماتے اور بجز خدا تعالیٰ سے رشتہ داری کے ان کے تمام معجزات کو برحق مانتے ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ تمام پیغمبروں پر ایمان لانا بھی مذہب اسلام کا ایک جزو لاینفک ہے۔

﴿3﴾

اس کے علاوہ دوسرے امور میں بھی آنحضرت ﷺ بڑی اہم تبدیلیاں فرما رہے ہیں۔ یہودیوں سے جو معاہدہ ہوا ہے۔ اس کے آخری الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ قتل کے ذریعہ اور باہمی جھگڑوں کو تلوار کی وساطت سے طے کرنا منع ہو گیا ہے۔ اب وہ تمام معاملات جو نوک شمشیر سے حل ہوا کرتے تھے تصفیہ کے واسطے حضورؐ کی خدمت میں پیش ہوا کریں گے۔ تلوار کے استعمال کو بہت محدود کر دیا گیا ہے۔ لیکن اس کی بالکل ممانعت بھی نہیں کی گئی ہے۔ پیغمبر ﷺ کو علم ہے کہ اس سے انصاف اور حقیقت شناسی کا کام نہیں لیا جا سکتا۔ لیکن پھر بھی ایسے مواقع پیش آجاتے ہیں۔ جب اسے بے نیام کرنے کی ضرورت لاحق ہو جاتی ہے۔ مثلاً جہاں آزادی وحریت پامال ہوتی نظر آئے یا حق و انصاف مذاق بن کر رہ جائیں یا پھر کسی کرایہ کے ٹٹو کو اقتدار کی گدی پر بٹھا دیا جائے۔ مسلمان کو اس عبادت گاہ کے تحفظ میں بھی تلوار اٹھانے کی اجازت دی گئی ہے جو خدا کے نام پر وقف ہو۔ قطع نظر اس کے کہ اس کا تعلق کسی مذہب یا فرقہ سے ہے۔ پھر حفاظت خود اختیاری میں بھی اس کا استعمال جائز و مباح ہے۔ خواہ حملہ آور یہودی' عیسائی یا مسلمان ہی کیوں نہ ہو' لیکن تلوار کے ذریعے مذہب کی تبلیغ کو نہ قرآن نے جائز قرار دیا ہے۔ نہ پیغمبر صاحب نے ہی اس کی اجازت دی ہے۔ اس لیے اسلامی فقہ بھی اس کو ناجائز قرار دیتا ہے۔ اسی طرح جارحانہ جنگ وجدل بھی ممنوع ہے۔

جواء اور شراب کے حق میں بھی پیغمبر صاحب کسی قسم کی رواداری نہیں برتتے اور ان کو شیطانی اور طاغوتی افعال قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں کو کھانے پینے کی

چیزوں میں سوٗر، مردار یا کسی ایسے جانور کا گوشت کھانے سے منع کیا ہے جس پر اللہ کے سوائے کسی اور کا نام لیا گیا ہو یا جو گلا گھونٹ کر مارا گیا ہو۔ یا مر گیا ہو، جو گر کر مرا ہو، مضروب ہو یا درندہ اسے اپنی خوراک بنا چکا ہو۔

مسلمانوں کے لیے جس زندگی کا نقشہ آپؐ نے پیش کیا ہے۔ اس میں ترک دنیا یا رہبانیت کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ آپ کے نزدیک نجات مسلسل روزے رکھنے، فاقہ کشی کرنے، جسمانی تکالیف اٹھانے، خاردار بستروں پر لیٹنے، تجرد کی زندگی بسر کرنے یا ترک لذات سے حاصل نہیں ہوتی۔ جس میں غذا لباس یا خواہش نفسانی کو مطلقاً نظر انداز کر دیا جائے۔ اسلام کے نزدیک انسان کو اپنی زندگی اس طرح گزارنی چاہیے جس طرح اللہ نے اسے بنایا ہے۔ خدا نے دیکھنے کے لیے اس کو آنکھیں، ذائقہ چکھنے کے لیے زبان، سونگھنے کے لیے ناک، سننے کے واسطے کانوں کے علاوہ قوت احساس بھی عطا فرمائی ہے۔ اس میں جذبات بھی ہیں اور جوش و ولولہ بھی۔ اس کے حصہ میں عقل و دانش بھی آئی ہے۔ فہم و فراست بھی اور خواہشات بھی۔ اس کو بھی دوسری مخلوق ہی کی طرح تکوین کے سانچہ میں ڈھالا گیا ہے۔ اس لیے وہ بھی اپنی افزائش نسل کا متمنی رہتا ہے۔ کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اگر خالق مطلق اسے ایسی مافوق الفطرت ہستی بنانا چاہتا جس میں نہ جنسی خواہشات ہوں، نہ جذبات نہ حسن و خوبصورتی کی پرکھ تو پھر وہ ایسی غلط قسم کی مخلوق پیدا ہی کیوں کرتا۔ قدرت نے اس کے جسم میں جو طاقتیں مجتمع کر دی ہیں وہ تو ہر نوع اپنا کام شروع کریں گی ہی۔ دیو قامت گلیشیر بھی پہاڑی چشموں کی روانی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ تیز و تند ہوائیں پہاڑوں کا منہ پھیر دیتی ہیں۔ دنیا کے ہر چپہ پر ہر شے میں ایسے عوامل کارفرما ہیں جن پر قابو پانا انسانی طاقت سے بالاتر ہے جب انسان کوئی ایسا کام کرتا ہے جس کے لیے وہ تخلیق نہیں کیا گیا اور پھر اس میں ناکامیاب ہوتا ہے تو وہ اسے اپنی جسمانی کمی، کمزوری، کوتاہی یا دوسرے الفاظ میں گناہ گاری سے تعبیر کرنے لگتا ہے اور پھر طرح طرح سے اس داغ کو اپنے دامن سے چھڑانے کی کوشش کرتا ہے۔ کہیں تو وہ کسی مقدس دریا میں جا کر اشنان کرتا ہے اور کبھی

پادری کے آگے گھٹنے ٹیک کر اپنی خطاؤں کا اعتراف کرنے لگتا ہے' کبھی وہ یاترا کرنے کے لیے نکل کھڑا ہوتا ہے اور کبھی آئندہ سال کے واسطے تقدیس کا کوئی پروگرام بنا لیتا ہے۔ اس معاملہ میں وہ کچھ زیادہ قصور وار بھی نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ وہ دنیاوی معاملات میں اتنا ملوث ہو گیا ہے کہ اس نے اپنی اخروی فلاح و بہبود کی ذمہ داریاں ماہرین دینیات یا مذہب کے ٹھیکیداروں کے ہاتھ میں دے دی ہیں۔ اور ان لوگوں کو بھی بہرحال زندہ رہنا اور روٹی کمانا ہے۔ اب گناہوں کی فہرست جتنی طولانی ہو گی اتنی ہی ان کی جیبیں پُر ہوں گی۔ اس لیے گناہوں کی بھرمار ضروری ہو گئی۔ پھر یہ بات بھی نہیں ہے کہ پادریوں کے طبقے یا خانقاہوں میں کوئی دوسرا اخلاقی معیار قائم ہے۔ یہاں بھی وہ ایسی راتیں گزارتے ہیں جو ان جیسی مقدس ہستیوں کے لیے زیبا اور مناسب نہیں۔ اتنی زیادہ پی جاتے ہیں جو کسی صورت سے بھی مناسب نہیں۔ جہاں ضرورت ہوتی ہے وہاں صدق و سچائی کا بھی گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ بلا شادی کے بچے پیدا ہو جاتے ہیں۔ موقع موقع سے جواء بھی کھیل لیتے ہیں۔ لیکن ان سب کے باوجود خدا کے نام کی تسبیح ضرور پڑھتے رہتے ہیں۔ محمد ﷺ کے سامنے احبار اور رہبان کی زندہ مثالیں موجود ہیں۔ اس لیے آپ اپنے ہاں پروہتوں یا پادری قسم کے مذہبی طبقوں کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتے اور انسانی بداخلاقی کی ساری ذمہ داری انہیں کے سر ڈالتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے نہ صرف خدا کو معطل کر کے مصنوعی معبدوں کو اس کی جگہ بٹھا دیا ہے بلکہ انسانی ضمیروں کو بھی طمع و لالچ کے بندھنوں میں جکڑ رکھا ہے۔

اس لیے محمد ﷺ کی کوشش یہ ہے کہ خدا اور انسان دونوں کی صحیح حیثیت متعین کر دیں۔ خدا کو واحد و قدوس بتا کر اور انسان کو اس سانچے میں ڈھال کر جس میں خالق کائنات اس کو ڈھالنا چاہتا ہے۔ خدا اور بندے کا براہِ راست تعلق قائم ہو چکا ہے اور گو آپ خود کسی فردِ واحد کی شفاعت کرنے کی حامی نہیں بھرتے لیکن بندوں کو بلا قید زمان و مکان براہِ راست خدا سے منسلک کر دیتے ہیں۔ اسلام نے گناہوں کی فہرست کو بھی مختصر کر دیا ہے۔ پھر توبہ کے واسطے نہ کسی جسمانی ریاضت کی حاجت ہے۔ نہ انسانی

صلاحیتوں کو بالائے طاق رکھنے کی۔ آنحضرت ﷺ صرف نذیر ہی نہیں بشیر بھی ہیں۔ آپ فرماتے ہیں "خدا کی دی ہوئی نعمتوں میں سے کھاؤ پیو اور اللہ کا شکر ادا کرو۔" لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ارشاد ہوتا ہے "اے ایمان والو! تم اپنی کمائی سے بہترین حصہ خدا کی راہ میں خرچ کرو اور جو کچھ تم کو زمین سے حاصل ہوتا ہے۔ اس میں سے بھی خیرات کیا کرو۔" یہ ہے مختصر طور پر اس زندگی کا خاکہ جو ایک مسلمان کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ اس لیے بجز اُن معدودے چند چیزوں کے جو حرام کر دی گئی ہیں۔ اہل اسلام کو حق حاصل ہے کہ خوش و خرم زندگی بسر کریں اور خدا تعالیٰ نے جو بیکراں نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔ ان میں سے دل بھر کر کھائی پئیں۔ ان آزادیوں کے نتیجے ہی میں اس کے اندر علوم و فنون، سائنس اور ادب کی اعلیٰ صلاحیتیں اجاگر ہوتی ہیں جو اس کو ودیعت کی گئی ہیں۔ وہی اسے ایک با اخلاق انسان بناتی اور جسمانی وجاہت عطا کرتی ہیں۔ وہ جو کچھ کماتا ہے اس میں سے خرچ کرنے پر بھی تیار رہتا ہے۔ جس کو دیکھ کر دوسرے بھی یہی سبق سیکھتے ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ اپنی زندگی ہنسی خوشی گزار دیتا ہے۔ کیونکہ اسے اپنی دنیاوی زندگی سے بہترین پھول چن لینے کا موقع ملتا رہتا ہے۔ اس لیے اسلام کے متعلق یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ انسان کا خلیقی اور فطری مذہب ہے۔

............﴿4﴾............

اس وسیع المشربی کی جھلک ہم کو اسلام کے تجارتی اور کاروباری قوانین میں بھی نظر آتی ہے۔ عرب بالعموم خانہ بدوشانہ زندگی بسر کرتے اور اونٹ، بھیڑ، بکری یا گھوڑے پال کر روزی کماتے ہیں۔ لیکن بعض قبائل کا مستقل پیشہ تجارت ہے اور وہ کاروانوں کے ساتھ مشرق و مغرب کے سفر کرتے رہتے ہیں۔ قرآن نے ابھی تک تجارت کی اباحت کا صرف ضمناً ذکر کیا ہے لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ اس کے متعلق بعض اہم نکات کو شک و شبہ سے پاک و صاف کر دیا جائے اس لیے تجارت کو سال کے ہر حصے خصوصاً ایام حج میں بھی جائز قرار دے دیا گیا ہے لیکن تجارتی مقاصد کو نماز کے مقابلے میں ثانوی حیثیت دی گئی ہے۔

باہمی معاہدات کی پابندی پر قرآن میں بڑا زور دیا گیا ہے۔ "متقی وہ لوگ ہیں جو اپنے وعدوں کو پورا کرتے اور امانتوں کے معاملہ میں احتیاط برتتے ہیں۔ اگر فریقین کو ایک دوسرے پر اعتماد ہو تو فبہا' لیکن اگر ان میں سے ایک زبانی معاہدے کو قابل اطمینان نہیں سمجھتا تو ایک کاتب کا انتظام کیا جائے۔ جو قابل اعتماد گروہوں کی موجودگی میں شرائط کو ضبط تحریر میں لے آئے۔ لیکن جو طریقہ بھی عمل میں لایا جائے شرائط کی پابندی بہرصورت لازمی ہوگی۔ دراصل ہونا بھی یہی چاہیے کیونکہ باہمی معاہدات میں ظلم و زیادتی یا زبردستی کو کوئی دخل نہیں۔ ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرے۔ اور جو چاہے پیشہ اختیار کرے۔ جس طرح اسلام لانے پر کوئی پابندی عاید نہیں کی گئی۔ اسی طرح خرید و فروخت میں بھی کسی طرح کے جبر کو دخل نہیں۔ لیکن جب کوئی شخص اسلام لاتا ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ قرآن اور آنحضرت ﷺ نے زندگی کے جو اصول مقرر کیے ہیں وہ ان سب کو تسلیم کرتا اور اللہ سے اس کے بتائے ہوئے قوانین پر عمل کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔ اسی طرح اگر وہ کسی دوسرے سے معاہدہ کرتا ہے تو اس پر کاربند ہونا لازمی ہو جاتا ہے۔ دونوں صورتوں میں ضابطہ اخلاق اس کا متمنی ہے کہ ہر انسان اپنے کیئے ہوئے وعدوں کو پورا کرے۔

اسلام میں داخل ہوتے وقت خدا تعالٰی سے جو عہد و میثاق کیا جاتا ہے۔ وہ بہرنوع زبانی ہی ہوتا ہے اور اس کے لیے کوئی خاص رسم ادا کرنی نہیں پڑتی' ہر بات کا انحصار اس کی خلوص نیت پر ہوتا ہے۔ لیکن دو انسانوں کے درمیان تحریر پر زور دیا گیا ہے۔ اہل اسلام کو حکم دیا گیا ہے کہ ہر صورت میں "عہد و پیمان پر قائم رہو۔" اسی طرح وزن اور ناپ تول کے جھوٹے پیمانوں پر بھی حضور ﷺ نے سخت نفرین کا اظہار فرمایا ہے۔ مومنوں کو حکم ہے کہ ترازو کو صحیح رکھیں اور جھکتا تولیں اور جو شخص ایسا نہیں کرتا اس پر لعنت کی گئی ہے۔ ناپ تول پر اس شد و مد کے ساتھ حکم دینے کا بھی یہی مطلب ہے کہ اپنے معاہدوں کے پابند رہو۔

حضور ﷺ نے جہاں ایفائے عہد اور وعدوں کی پابندی پر اتنا زور دیا ہے

وہیں سود کی بھی بڑے سخت الفاظ میں مذمت فرمائی ہے۔ دنیا میں کوئی شیر' کوئی بھیڑیا' کوئی دشمن اتنا خطرناک نہیں جتنا ایک سود خور قرض خوار ہوتا ہے۔ اس کے لیے جنت و دوزخ کے درمیان اعراف میں بھی کوئی جگہ نہیں۔ اس کی جگہ تو مخصوص ہو چکی۔ اسے ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہنا اور آگ میں جلنا ہوگا۔

اسلامی قانون ایک مقام پر انتہائی نرم ہو جاتا ہے۔ یعنی جہاں مظلوموں' ضرورتمندوں اور تہی دستوں کے حق میں خیرات و صدقات ادا کرنے کا سوال اٹھتا ہے۔ آمدنی میں سے اُن کا حصہ نکالنے اور زیادہ سے زیادہ ان کی مدد کرنے کا بار بار حکم فرمایا گیاہے۔ اس کے ساتھ ہی دوسروں کو بالخصوص یتیموں اور بیواؤں کے جائیداد کے تحفظ پر بھی بہت زور دیا گیا ہے۔ مقروضوں کے حق میں بھی احکامات بہت واضح ہیں۔ جب کوئی قرض لے تو اسے چاہیے کہ وہ تمام شرائط خود لکھوائے اور کاتب کو ہدایت ہے کہ وہ ان کو بڑی احتیاط اور دیانتداری سے لکھے' دوسرے معاہدات کی طرح اس میں بھی لازمی ہے کہ ادائیگی کے لیے جو وقت مقرر کیا گیا ہے اس کی سختی سے پابندی کرے لیکن اگر وقت مقررہ پر اس کے پاس موجود نہ ہو تو کیا کیا جائے؟ اس صورت میں قرض خواہ سے کہا گیا ہے کہ اس وقت تک انتظار کرے جب تک مقروض ادائیگی کے قابل نہ ہو جائے یا اس رقم کو خیرات کے طور پر بالکل ہی معاف کر دے اور اس دوسری صورت کو زیادہ بہتر قرار دیا گیا ہے۔ یہ قوانین ان اصولوں سے بالکل مختلف ہیں جن کا دوسری قوموں میں رواج ہے۔ قرآن مجید قرضہ کی عدم ادائیگی پر کوئی سزا مقرر نہیں کرتا جب کہ اس کے مقابلہ میں روما کا قانون نادھندگی کو اتنا سخت جرم قرار دیتا ہے کہ اس کی پاداش میں مقروض کو پھانسی تک دی جا سکتی ہے یا یہودیوں کے نزدیک اس کو غلام بنایا جا سکتا ہے۔ ان سب کے مقابلے میں حمورابی قوانین کچھ زیادہ نرم ہیں۔ کیونکہ ان میں صرف اتنی سزا مقرر ہے کہ شخص مذکور اپنی بیوی اور اولاد کو تین سال کے واسطے قرض خوار کی خدمت میں دے دے۔ حضرت مسیح چونکہ پچھلے پیغمبروں کے نافذ کردہ قوانین کو دوبارہ نافذ کرنے کی خاطر مبعوث ہوئے اس لیے انہوں نے مقروض کو قید کیے جانے کا قانون برقرار رکھا۔ اور

اس سلسلہ میں انہوں نے مقروض کو اس طرح نصیحت فرمائی ہے ''اپنے مدعی مخالف سے جلد فیصلہ کر لو مبادا وہ تمہیں منصف کے حوالے کر دے اور منصف تمہیں افسروں کے حوالے کر دے۔ جو تم کو جیل بھیج دے اور میں تمہیں صاف صاف بتاتا ہوں کہ پھر تم اس وقت تک رہا نہ کیے جاؤ گے جب تک کوڑی کوڑی ادا نہ کر دو۔''

یہ تمام اصلاحات اپنی جگہ بہت اہم ہیں۔ لیکن انقلابی تبدیلیاں تو دراصل اب شروع ہونے والی ہیں۔ یعنی اسلامی معاشرے میں عورتوں کے متعلق قوانین کا آغاز' آنحضرت ﷺ نے بخوبی دیکھ لیا ہے کہ عربوں میں عورت کی حیثیت کسی منقولہ جائیداد سے زیادہ نہیں' وہ اپنے باپ یا شوہر کی ملکیت ہے۔ باپ کے مرنے پر اس کی بیوائیں باقی سازو سامان کے ساتھ لڑکے کو وراثت میں ملتی ہیں اور اسے اختیار ہے کہ ان سے جو چاہے سلوک کرے۔ بعض قبائل بالخصوص قریش اور کندہ میں دختر کشی عام ہے۔ یہودیوں میں لڑکی کی حالت اس سے کچھ بہتر ہے باپ کو اختیار ہے کہ اسے بطور کنیز کسی کے ہاتھ فروخت کر دے بلکہ اگر باپ فوت ہو جائے تو بھائی بھی اس کے ساتھ یہی سلوک کر سکتا ہے لیکن اگر وہ حسین اور جاذب نظر ہے تب تو یوں سمجھئے کہ وہ ایک گوہر بے بہا کی حیثیت رکھتی ہے اور اس سے بہت کچھ فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ عیسائیت نے عورت کے ازلی گناہ کو آج تک نہیں بخشا ہے۔ اگر وہ سانپ کے بہکانے میں نہ آتی تو انسان آج بھی باغ عدن میں برہنہ تن دندناتا پھرتا۔ دل کھول کر گاجریں اور ساگ کھاتا اور صحت و تندرستی کا مجسمہ بنا رہتا۔ اس لیے عیسائیوں کے نزدیک عورت آج بھی شیطان کا دروازہ سمجھی جاتی ہے۔ قیاصرہ روما کی عیاشیوں' بابل کی بدکاریوں اور ٹرائے کی تباہ کاریوں کا سارا الزام اسی کے سر ہے۔ کلیسا کے ارباب حل و عقد ابھی تک اس پس و پیش میں مبتلا ہیں کہ اسے جنت میں داخلہ کی اجازت مل بھی سکے گی یا نہیں۔ متی' مرقس' لوقا اور یوحنا اس باب میں بالکل خاموش ہیں کہ آقا (مسیح) کا ان کے بارے میں کیا خیال تھا۔ ایران' روم' ایتھنز' اسکندریہ اور تمام جزیرہ نمائے عرب میں تعدد ازدواج ایک عام رسم کے طور پر رائج ہے۔ عیسائی' یہودی' ایرانی' ژند اور بت پرست کثرت ازدواج

میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے پر تلے ہوئے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں کہ ہمارا حرم بڑا وسیع اور منتخب ہے۔

اس سلسلہ میں آنحضرت ﷺ نے جو اصلاحات نافذ فرمائیں وہ بہت اہم اور دُور رس ہیں' عورت کے ابتدائی گناہ کو تو روایات پر مبنی قرار دے کر مسترد کر دیا گیا ہے۔ اسلام کے نزدیک ہر بچہ معصوم ہوتا ہے۔ اس میں لڑکے اور لڑکیاں یکساں ہیں۔ اب یہ ضروری نہیں رہا کہ عورت کو شیطانی مخلوق گردانا جائے یا جس طرح بچھو کے بچے کو پیدا ہوتے ہی ہلاک کر دیا جائے۔ اسی طرح نوزائیدہ لڑکی کا بھی گلا گھونٹ دیا جائے۔ اب یہ خیال بھی باطل ہو گیا ہے کہ عورت تو مرد کے واسطے بنائی گئی ہے لیکن مرد عورت کے واسطے مختص نہیں ہے۔ قرآن کی رُو سے عورت مرد کی بقیہ نصف ہے۔ اور دونوں کی تخلیق ایک ہی مادہ سے ہوئی ہے۔ ان یہود کے جواب میں جو اپنی مستورات سے کہتے ہیں کہ تمہارے مطالبات صرف اپنے شوہروں کی شہوانی تسکین تک محدود ہیں اور وہ تمہارے اوپر حکمرانی کرے گا۔ اس کے برعکس اسلام کہتا ہے کہ عورت تمہارے گھر کی مالکہ ہے اور اسے بھی وہی حقوق حاصل ہیں جو مرد کو ہیں۔ جو کچھ اس سے متوقع ہے اسی کی وہ بھی توقع رکھتی ہے۔ قرآن نے نکاح اور طلاق کے جو قوانین وضع کیے ہیں۔ ان میں دونوں اصول یکساں کارفرما ہیں۔ شادی زن و شوہر کے درمیان ایک معاہدہ ہے۔ جس میں فریقین کی حیثیت غور و خوض' ایجاب و قبول اور نکاح سب کچھ شامل ہے۔ جو شخص کسی عورت سے شادی کرتا ہے اسے عمر اور عقل کے لحاظ سے اس قابل ہونا چاہیے کہ وہ معاہدہ کر سکے۔ اس صورت میں عورت میں بھی اتنی سمجھ ہونی چاہیے کہ وہ اسے منظور کرے۔ اور اس پر رضامند ہو جو شخص اس کے جسم کی خواہش کرے وہ اس بات کی بھی ضمانت دے کہ اگر اس کا دل بھر جائے یا اس پر پیری و ضعیفی غالب آجائے تو بیوی کی مٹی پلید نہ ہو گی۔ دوسرے معنوں میں اس کے واسطے مہر اور نان و نفقہ کا بھی انتظام کیا جائے۔ نکاح کی رسم مستند گواہوں کے سامنے ادا ہونی ضروری ہے۔ اسی طرح طلاق کا معاملہ بھی بہت آسان ہے اور اس میں خواہ مخواہ کے الجھاؤ یا پیچیدگیاں پیدا نہیں کی

گئیں۔ علیحدگی کے لیے کسی الزام یا جعلی فریب دہی کی ضرورت نہیں۔ چونکہ شادی کا معاملہ ایک معاہدہ پر مبنی ہوتا ہے۔ اس لیے اگر اس کی شرائط سے انحراف کیا جائے تو وہ منسخ ہو جاتا ہے۔ اس لیے اسلام کا نقطہ نظر منطقی بھی ہے اور قابل فہم بھی۔ لیکن طلاق سے قبل مہر کی بقیہ رقم ادا کر دینی لازمی ہے۔ ہاں اگر عورت خود طلاق لینا چاہے تو اسے مہر کی رقم معاف کرنی ہوتی ہے۔ علیحدگی کے بعد مرد اور عورت دونوں بعض شرائط کے ساتھ دوبارہ ازدواجی زندگی میں منسلک ہو سکتے ہیں۔ یا حسب پسند دوسری شادیاں کر سکتے ہیں۔ لیکن میراث چونکہ باپ کے سلسلے سے ہوتی ہے اس لیے طلاق کی صورت میں پیدا ہونے والے بچے کی ولدیت مشخص ہونا لازمی ہے اور اس صورت میں ہر قسم کے شک و شبہ سے بچنے کے واسطے لازمی رکھا گیا ہے کہ عورت تین حیض ختم ہونے سے قبل دوسری شادی نہیں کر سکتی۔ اسی طرح بیوہ عورتیں بھی عدت ختم ہونے کے بعد ہی کسی دوسرے شخص سے نکاح کر سکتی ہیں۔

اسلام نے تعدد ازدواج کو جائز قرار دیا ہے مگر اس کے لیے شرائط کا بھی تعین کر دیا ہے۔ مسلمان پہلی بیوی کے علاوہ تین اور بیویاں رکھ سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ چاروں میں عدل و انصاف قائم رکھ سکے۔ لیکن اگر وہ سمجھتا ہے کہ ایسا کرنا ممکن نہ ہو گا تو اسے صرف ایک ہی پر اکتفا کرنا چاہیے۔ اگر بیوی کو غلط رویہ اختیار کرنے کی بناء پر طلاق دی جائے تو اس صورت میں مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ چار مہینے تک اس معاملہ پر خوب غور و خوض کریں اور اس کے بعد بھی اگر وہ دیکھے کہ باہمی مناقشات کے سبب بجز طلاق کے کوئی چارہ کار نہیں تو مرد کے لیے لازم ہے کہ وہ عورت کو ہنسی خوشی کچھ دے کر رخصت کر دے۔

مسلمان کے لیے کسی مسلم یا اہل کتاب (یہودی' عیسائی) یا ایسی مسلمان عورت سے' جس کا خاوند کافر ہے۔ لیکن وہ خود دورانِ جنگ اہل اسلام سے آملی ہو' شادی جائز ہے۔ لیکن خود مسلمانون کے درمیان محرم رشتہ داروں مثلاً ماں' بہن' لڑکی' چچی' پھوپھی' بھتیجی' بھانجی' رضائی ماں یا بہن' ساس' بہو یا بہ یک وقت دو حقیقی بہنوں سے نکاح حرام

ہے۔

شادی بیاہ کے معاملات میں اتنی آزادیاں اور سہولتیں دینے کے بعد یہ بات بالکل قدرتی ہے کہ اسلام میں زنا کاری اور غیر عورت سے تعلقات قائم کرنا ناقابل معافی جرم قرار دے دیئے گئے ہیں۔ ان باتوں کو نہ انسان ہی پسند کرتا ہے نہ خدائے قدوس۔ زانی کو سوائے زانیہ کے کسی سے شادی کی اجازت نہیں ہے۔ اس طرح کوئی زانیہ بجز زانی یا مشرک کے کسی سے نکاح نہیں کر سکتی۔ اہل اسلام کو اس قسم کی مناکحت سے قطعی طور پر روک دیا گیا ہے۔ قرآن صاف صاف کہتا ہے "زانی نکاح نہ کرے مگر زانیہ یا مشرکہ کے ساتھ۔ اور زانیہ کے ساتھ نکاح نہ کرے مگر زانی یا مشرک اہل اسلام پہ حرام کر دیا گیا ہے۔"

اسلام نے عورت کو صرف اتنا ہی اختیار نہیں دیا کہ اپنا جسم کن شرائط پر کس کے قبضہ میں دے بلکہ معاشرے میں دوسری صنف یعنی مرد کے ساتھ رہنے میں اس کے درجے اور مرتبہ کی بھی تخصیص کر دی ہے۔ اب اس کی حیثیت ایک سامان کی سی نہیں رہی کہ اسے خریدا اور بیچا جا سکے۔ وہ اب گھر کی ملکہ اور اس لحاظ سے نصف اوّل ہے۔ مردوں کی جائیداد سے اسے محروم الوراثت رکھنے کی تمام شقیں اُڑا دی گئی ہیں۔ اسی طرح بیوہ عورتوں کو بھی' جنہیں اب تک شوہروں کی متروکہ املاک میں اس وجہ سے حصہ دار نہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ خود بھی ورثہ میں بیٹوں کے درمیان تقسیم ہو جاتی تھیں' حقدار قرار دے دیا گیا ہے۔ بیٹیوں کو بھی والدین کی میراث سے یہ کہہ کر محروم کر دیا جاتا تھا کہ وہ جب شادی ہونے کے بعد دوسرے کے گھر میں جاتی ہیں تو ماں باپ کے خاندان سے ان کا تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن اسلام نے ان کا بھی حق مقرر کر دیا ہے۔ لڑکوں کو بھی اس بہانے سے کہ وہ ابھی کمسن ہیں اور اپنی جائیداد کی حفاظت یا قومی مدافعت کے لیے ہتھیار اٹھانے کے قابل نہیں' اپنے ورثہ سے بے دخل نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح احکام قرآنی کے ماتحت جنس یا عمر کسی وراثت میں حائل نہیں ہو سکتی۔ بیویاں' لڑکیاں' بہنیں اور مائیں مقررہ قوانین کے مطابق حصہ دار ہوتی ہیں۔ مرد کو صرف اتنی رعایت دی گئی ہے کہ

اسے دوگنا حصہ ملتا ہے۔ اولاد خواہ بیاہتا بیوی کے بطن سے ہو یا باندی کے' اگر باپ ایک ہے تو حصہ مساوی ہوگا۔ پھر یہ بھی لازمی ہے کہ اس کی متروکہ املاک کا دو تہائی حصہ لامحالہ وارثوں کو پہنچے گا۔ چاہے وہ اپنے وصیت نامہ میں کچھ ہی کیوں نہ لکھ جائے۔ لیکن اس کا اطلاق ایک تہائی جائیداد پر ہی ہو سکتا ہے۔

ان قوانین پر اگر ایک غیر جانبدارانہ نظر ڈالی جائے تو بہ حیثیت مجموعی سب بڑے معقول نظر آتے ہیں۔ مثلاً دونوں اصناف کے حقوق متعین کر دیے گئے ہیں۔ بچوں کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے۔ بوڑھے والدین کے لیے بھی ترکہ کی شرح مقرر ہے اور اگر وصیت کنندہ کسی جائز وارث کی حق تلفی کرنا چاہے تو اس کا بھی سدباب کر دیا گیا ہے۔

یہ تمام احکامات وقتاً فوقتاً قرآن مجید کی سورتوں میں موقع کی مناسبت سے نازل ہوتے رہے ہیں۔ لیکن ان کا لب لباب ہمیں سورۃ بقرہ میں ملتا ہے جسے مختصر قرآن کہا جا سکتا ہے۔ ان معاشی معاملات کے علاوہ اس سورۃ میں اہل اسلام سے متعلق بعض دیگر امور پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ یہ خدا کا کلام ہے جو پیغمبر آخر الزمان ﷺ کے ذریعہ بنی نوع انسان تک پہنچایا جا رہا ہے۔ اس میں یہودیوں اور عیسائیوں کے اس عقیدہ کی پُرزور تردید کی گئی ہے کہ صرف وہی جنت میں داخل ہو سکیں گے قرآن کہتا ہے کہ خلد کے دروازے ان تمام لوگوں پر کھول دیے جائیں گے جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں۔ اور اپنے ہر کام کو خدا کی مرضی کے تابع کر دیں۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مشرق ہو یا مغرب سب خدا ہی کی جلوہ گری کے کرشمے ہیں اور جدھر بھی رخ کرو وہ تمہارے سامنے ہوتا ہے۔ اللہ کو کوئی ضرورت نہیں کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے۔ کیونکہ ہر شے اسی کے زیر فرمان ہے۔ مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ نیک اعمال میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے رہیں۔ سال میں ایک مہینہ روزہ رکھنے کی ضرورت پر بھی زور دیا گیا ہے اس طرح حج کے متعلق بھی احکام دیے گئے ہیں اور آخر میں خدا کے لیے جہاد کرنے پر مسلمانوں کو ابھارا گیا ہے۔

(5)

معاشی قوانین کے اجراء میں پیغمبر ﷺ کی مساعی گو بہت اہم بھی ہیں اور دُوررس نتائج کی حامل بھی۔ لیکن آپ کا کل وقت اس پر صرف نہیں ہوتا کیونکہ آپ اسلام کے مقتدا پہلے ہیں اور دنیاوی حکومت کے سربراہ بعد میں۔ نماز باجماعت میں آپ بحیثیت ایک مقتدر و معمر امام کے خدا کی وحدانیت اور قوت تخلیق کا بیان فرماتے رہتے ہیں۔ قرآن مجید کی نئی سورتوں میں بھی اللہ کی صفات حمیدہ انہیں پُرشکوہ الفاظ میں بیان ہوتی ہیں۔ جن میں قیام مکہ کے دوران ہوا کرتی تھیں۔ جس وقت آپ کو شہر مکہ چھوڑ کر ہجرت کرنا پڑ رہی تھی۔ اس وقت بھی آنحضرت ﷺ اور ان کے صحابہ جہاں تک ممکن ہوتا پوشیدہ طور پر اشاعت اسلام میں کوتاہی نہ کرتے تھے۔ نمازیں بڑی مختصر ہوا کرتی تھیں۔ کیونکہ اس کے لیے وقت اور موقع بمشکل ہی مل سکتا تھا۔ لیکن مدینہ پہنچ جانے کے بعد پنجگانہ فرض نمازوں کے علاوہ جمعہ کی ہفتہ وار نماز ادا کرنے کے لیے بھی کوئی امر مانع نہیں۔ امن و سکون بھی ہے اور فرصت بھی میسر ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہر چیز کے واسطے اصول طے کیے جائیں اور قاعدے مقرر ہوں۔

چین و اطمینان کی برکات حاصل ہو جانے کے بعد بھی نماز کے متعلق حضور ﷺ کے خیالات میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ نماز اب بھی آپ کے لیے جان و دل سے خدائے تعالیٰ کی حمد و ثناء' تعریف و توصیف' اس کی درگاہ میں عجز و انکسار کا اظہار اور خالق و مخلوق کے درمیان رابطہ کا نام ہے۔ اس کو ادا کرنے کی جگہ میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ خواہ آپ اسے چرخ زمردین کے نیچے کسی جگہ ادا کریں یا اپنے کمرہ خواب میں' اس کے لیے نہ کسی طمطراق کی ضرورت ہے نہ سنہری ریشمی جائے نماز کی' نہ پھولوں کی حاجت ہے نہ عرق گلاب یا بید مشک کی' نہ عطر و لوبان درکار ہیں نہ عود و عنبر' نہ پادری چاہیے نہ ربی' نہ پنڈت کی احتیاج ہے نہ مقدس باپ کی' ہر شخص کو اختیار ہے کہ خواہ فرد واحد نماز ادا کرے یا باجماعت۔ فرض نماز کی امامت زید' عمر' بکر کوئی بھی کر سکتا ہے۔ البتہ قرآن کے متعلق اس کا علم باقی نمازیوں کے مقابلے میں زیادہ ہونا ضروری ہے یا

پھر یہ کہ نمازی کسی فضیلت کی بناء پر خود اس سے امامت کی درخواست کریں۔ اب اس کا بھی وقت آ گیا ہے کہ جملہ نمازوں کی تفصیلات مقرر کر دی جائیں اور یہ بھی طے کر دیا جائے کہ لوگوں کو نماز کے لیے بلایا کس طرح جائے۔ اوّل الذکر کے متعلق تو کوئی دشواری نہیں ہے۔ لیکن دوسرا مسئلہ کہ مسلمانان شہر کو نماز کی اطلاع کس طرح دی جائے البتہ زیر بحث آ گیا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اہل یہود کی طرح قرنا پھونکا جائے۔ بعض اس پر مصر ہیں کہ عیسائیوں کی تقلید میں گھنٹہ بجایا جائے۔ بالآخر حضرت عمرؓ اس مسئلہ کو حل کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس سلسلہ میں ایک خواب دیکھا ہے کہ کوئی شخص ایک اونچے مینار پر کھڑا ہو کر باآواز بلند خدا کی وحدت اور عظمت کا نعرہ بلند کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نماز نیند سے بہتر ہے۔ بجز اللہ کے کوئی لائق عبادت نہیں۔ محمد ﷺ اس کے رسول ہیں۔ پھر وہ مسلمانوں کو نماز کے لیے فلاح کے راستہ پر بلاتا ہے۔ اور جس طرح اس صدا کو شروع کرتا ہے۔ اسی طرح اللہ اکبر پر ختم کر دیتا ہے۔

اس خواب نے کل مسئلہ حل کر دیا ہے۔ اس انسانی بانگ کا مقابلہ نہ کوئی باجا کر سکتا ہے نہ گھنٹہ۔ اسی وقت سے مؤذن پانچوں وقت حضرت عمرؓ کے خواب کی مطابقت میں اذان کے ذریعہ مسلمانوں کو نماز کے لیے بلاتا ہے اور لوگ مسجد میں جوق در جوق آ کر جمع ہو جاتے ہیں۔

﴿6﴾

اگر کسی کو حضور ﷺ کی بڑھتی ہوئی طاقت اور اقتدار کے متعلق تشویش ہو سکتی ہے تو وہ سادہ لوح باشندگان یثرب ہی ہو سکتے ہیں۔ جنہوں نے آپ کو مدعو کیا اور اپنا سربراہ بنایا۔ آپ ﷺ نے ان کے قدیم مراسم اور روایات کو اس طرح تہس نہس کر دیا کہ ان کے آباؤ اجداد دیکھتے تو دانتوں میں انگلیاں دے لیتے۔ اس کے برخلاف اگر کسی کو حضورؐ کی آمد پر خوشی ہونی چاہیے تھی تو وہ اہل یہود تھے۔ کیونکہ حضورؐ نے ان کے تمام پیغمبروں کو برگزیدہ نبی تسلیم کر لیا ہے۔ آپ ﷺ نے مسیح کو بھی پیغمبر کہہ کر ان کی غلطی کی اصلاح فرما دی ہے۔ اُن کو ضمیر اور اقامت دین کی مکمل آزادی عنایت فرمائی ہے۔ بلکہ

یہاں تک کیا ہے کہ ان کے مقدس شہر بیت المقدس کو مسلمانوں کے سجدہ کا رخ مقرر کیا ہے۔ لیکن کوئی رعایت' کوئی رواداری' کوئی نرمی یہودیوں کو وفاداری پر آمادہ کرنے کے لیے کافی نہیں۔ آپ کی یثرب میں تشریف آوری پر نیم دلی سے جو خیر مقدم کیا بھی گیا تھا وہ اب تلخی اور تنفر میں تبدیل ہو چکا ہے۔ فیاضی کا جواب غداری سے دیا جا رہا ہے۔ وہ اپنی اس ناکامی اور مایوسی کو چھپانے سے قاصر ہیں کہ حضور ﷺ کو آلہ کار بنا کر تمام ملک عرب کو ایک یہودی مملکت میں تبدیل کر لیں۔ اس لیے وہ اسلام کے دشمنوں کی صفوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ آپ سے جو عہد و پیمان انہوں نے ابتداء میں کیے تھے انہیں ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتے ہیں۔ اور جب ان سے دریافت کیا جاتا ہے کہ تم اسلام کو پسند کرتے ہو یا بت پرستی کو تو وہ چپکے سے دوسری طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔ ان کے شاعر اہانت آمیز اشعار میں حضور ﷺ کو بدنام کرتے ہیں اور قرآن کا بازاروں میں مذاق اڑاتے ہیں۔ یہودیوں کے سردار مخالفین اسلام بالخصوص قریش مکہ سے سازباز کرتے ہیں اور ان کی وجہ سے مدینہ غداری اور منافقت کا مستقر بن جاتا ہے۔

محمد ﷺ کی زندگی میں یہ ایک نئے قسم کا المیہ ہے۔ آپ ﷺ ابھی تک مبلغ اور پیغمبر کی حیثیت سے کام کرتے رہے ہیں۔ آپ نے ہمیشہ اللہ کی ذات پر بھروسہ کیا اور مخالفین کی طعن و تشنیع کی کبھی پرواہ نہیں کی۔ لیکن اب کہ سلطنت کی باگ دوڑ بھی آپ ہی کے ہاتھوں میں ہے۔ مدینہ کا تحفظ بھی حضور ﷺ ہی کی ذمہ داریوں میں شامل ہے اور غداریوں سے اعراض کرنا یا سازشوں پر آنکھیں بند کیے رہنا ممکن نہیں۔

ایک پرانی مثل ہے کہ "اگر تم کامیاب ہونا چاہتے ہو تو بہت اچھے بننے کی کوشش نہ کرنا۔ تقدس' احسان مندی' فراخدلی سب بہت عمدہ صفات ہیں۔ لیکن اپنی حدود کے اندر' اکثر ایسے مواقع پیش آجاتے ہیں جب ان سے تعرض کرنا مفید ہی نہیں ضروری ہو جاتا ہے۔ حضور ﷺ نے یہود کی تالیف قلوب کے لیے ان کے ساتھ جو مراعات برتیں ان پر نکتہ چینی کرنے والے لوگ موجود ہیں۔ جو کہتے ہیں کہ آپ نے ان کی وفاداری اور صوابدید پر جو اعتماد کیا تھا وہ انسانی فطرت کا علم نہ ہونے اور سیاست کے فن

سے ناواقفیت کی بنا پر تھا۔

آپ کے گردو پیش جو سازشیں ہو رہی تھیں حضورﷺ ان سے بے خبر نہ تھے۔ یہ درست ہے کہ آپ کے کردار میں اخلاق اور اُنس و محبت رچی ہوئی تھی لیکن آپ کو اس کا بھی احساس ہے کہ اگر آپ کو اس سلطنت کا تحفظ کرنا ہے جس کی باگ دوڑ آپ کے ہاتھ میں دی گئی ہے تو آپ کو دل نہیں بلکہ دماغ سے کام لینا چاہیے۔ آپ کو جادو یا معجزات پر اعتقاد نہیں۔ آپ تو ایک مزدور کی طرح اپنے ہاتھ سے کام کرنے والے' اینٹوں اور لکڑی سے مسجد بنانے والے مقنن' ناظم اور ایک ہوشیار کاریگر ہیں۔ لیکن جسمانی شہامت و لطافت کے ساتھ ساتھ آپ بے نظیر ذہانت' پیش تھی استدلال اور تحکم کی صفات سے بھی متصف ہیں۔ آپ میں جملہ عناصر مجتمع ہو گئے ہیں۔ آپ کی نشوونما ایسے ماحول میں ہوئی ہے جہاں نیچے ریگستان اور اوپر آسمان کا سایہ تھا۔ ایک وقت تھا کہ آپ زکوٰۃ' صدقات' خیرات اور نیک اعمال کے متعلق وعظ فرمایا کرتے تھے۔ آپﷺ نے ان کو فراموش تو اب بھی نہیں کیا لیکن ہر بات کا ایک موقع و محل ہوا کرتا ہے۔ اس وقت کی ضرورت کچھ اور زبانوں کی متقضی ہے۔ اب آپ جنگی مبادیات' سونا چاندی' روپیہ پیسہ' سواری و ہتھیار' سپاہ و رسد کے امور پر گفتگو فرمانے لگتے ہیں۔ آپ فن حرب اور جنگی چالوں کا علم حاصل کر رہے ہیں۔ آپ کا اندازہ ہے کہ فوج کی نفری اور سامان جنگ میں آپ کبھی بھی اپنے مخالفوں سے برتر نہ ہو سکیں گے۔ اس لیے دشمنوں پر فتح حاصل کرنے کے لیے آپ کو پوری توجہ فوجی نقل و حرکت' ارتقائی تدابیر' فنی مہارت' فراہمی اسلحہ اور محاذ جنگ کے ان گوشوں سے واقفیت جہاں سے کامیابی کے ساتھ حملہ ہو سکے' پر مرکوز ہے۔ قانون سازی اور اصلاحات نے آپ کی فہم و فراست' عقل و دانش اور قوت عمل کی صلاحیتوں کو پوری طرح اجاگر کر دیا ہے۔ جملہ امور کی کامیابی کو بالعموم قدرت کی اعانت پر معمول کیا جاتا ہے۔ یہاں بھی یہی صورت حال ہے۔ عرب کو عرصہ سے ایک ایسی ہی شخصیت کی ضرورت تھی اور وہ پیدا ہو گئی ہے۔ جسمانی طور پر سنگ و آہن اور باطل میں زرناب' حالات کی تبدیلی نے ثابت کر دیا ہے کہ آپ میں طبیعت کی نرمی اور اس کے

ساتھ قوت عمل کی گیرائی کا عجیب و غریب امتزاج ایک ایسا عجوبہ ہے۔ جو اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ جہاں قوت کی ضرورت ہو وہاں قوت کا استعمال فرماتے ہیں۔ جہاں بصیرت درکار ہے وہاں تدبر سے کام لیا جاتا ہے۔ جس کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں۔ اس کو اتنے عزم و استقلال سے اختتام تک پہنچاتے ہیں کہ دوسرے لوگوں میں بھی ویسا ہی جذبہ اور جوش پیدا ہو جاتا ہے۔

عربوں کا طریق جنگ یہ ہے کہ وہ اچانک غنیم پر ٹوٹ پڑتے ہیں' کبھی شب خون مارتے ہیں کبھی بے خبری کی حالت میں دشمن کے سر پر پہنچ جاتے ہیں۔ اس صورتحال سے نمٹنے کے لیے کہ یکا یک دشمن حملہ نہ کر دے' حضورﷺ نے جاسوس مقرر کر رکھے ہیں جو پہاڑی راستوں اور سمندر کے کنارے سفر کرنے والے قافلوں پر کڑی نظر رکھتے ہیں۔ اوپری سطح کے نیچے جو رو ئیں رواں ہیں ان سے بھی آپ پوری طرح باخبر ہیں۔ سمندر کو بظاہر ساکت دیکھ کر آپ کو کوئی دھوکا نہیں ہوتا۔ حضورﷺ کو اپنے دشمنوں کی نقل و حرکت کا پورا علم ہے ۔ قریش کو باقاعدہ اعلان جنگ کی ضرورت نہیں کیونکہ ان کے نزدیک آپ کی حیثیت ایک مفرور کی سی ہے اور جس انعام کا انہوں نے آپ کے متعلق اعلان کیا تھا وہ تاحال برقرار ہے۔ لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ حملہ بہترین مدافعت ثابت ہوتا ہے۔ اس لیے آپ کے جاسوس دشمن کی نقل و حرکت' تدابیر اور قبائل کے اتحاد سے آپ کو پوری طرح آگاہ کرتے رہتے ہیں اور آپ غنیم کے حملے سے قبل ہی میدان میں پہنچ جاتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے اکثر ایسی جماعتوں کو منتشر کر دیا ہے جن کو صرف اس غرض کے لیے بھیجا گیا تھا کہ مسلمانوں کو اطمینان سے نہ بیٹھنے دیں۔ لیکن ساتھ یہ بھی ہدایت کر دی گئی تھی کہ جنگ کا خطرہ مول لینے سے گریز کیا جائے۔

عبد اللہ بن جحش ؓ کو نو مسلموں کی ایک جماعت کے ساتھ نخلہ میں تعینات کیا گیا ہے۔ جو مکہ اور طائف کے درمیان ایک وادی ہے۔ وہ قریش کے ایک کارواں پر یکا یک حملہ کرتے اور مال غنیمت سے لدے پھندے' جنگی قیدیوں کو ہمراہ لیے مدینہ واپس لوٹتے ہیں۔ اس مہم اور آسان فتح سے مسلمانوں کی ہمتیں یکا یک بہت بلند ہو گئی

ہیں اور انہیں اپنا مستقبل بارآور ہوتا نظر آ رہا ہے۔

اس محاربہ کو زیادہ عرصہ نہیں گزرتا کہ قریش کے ایک قافلہ کی خبر ملتی ہے جو شام سے مکہ کی طرف جا رہا ہے اور جس میں ایک ہزار اونٹ سامان حرب اور بیش قیمت مال تجارت سے لدے ہوئے ساتھ ہیں۔ اس کی حفاظت کے لیے ان کا مشہور جنرل ابوسفیان ساتھ ہے۔ جیسے جیسے قافلہ مکہ کی طرف بڑھتا ہے۔ دونوں طرف سے نقل و حرکت شروع ہو جاتی ہے۔ پیغمبر ﷺ منتخب جاسوسوں کو ان پر نظر رکھنے کے لیے روانہ فرما دیتے ہیں۔ ابوسفیان کو بھی اس کا علم ہو جاتا ہے اور وہ ایک جگہ پڑاؤ ڈال کر تیز رفتار قاصدوں کو مکہ بھیجتا اور امداد طلب کرتا ہے۔ اس کی غیر موجودگی میں ابوجہل مکہ کی افواج کا امیر لشکر ہے۔ اور وہ فوراً ہی کمک لے کر روانہ ہو جاتا ہے۔

ابوسفیان کے اس قافلہ کی امداد کے لیے جو فوج جا رہی ہے اس میں مکہ کے بہترین نبرد آزما شامل ہیں۔ ایک سو سواروں اور نو سو پیادہ فوجیوں کی یہ عسکری جماعت زرہ بکتروں اور ہتھیاروں سے لیس ہے۔ اور جھنڈے لہراتی' تلواریں چمکاتی' نعرے لگاتی شمال کی طرف چلی جا رہی ہے۔ آنحضرت ﷺ کو علم ہو جاتا ہے کہ ایک بڑا لشکر ان کا مقابلہ کرنے کے لیے آ رہا ہے۔ جھڑپوں کا دور گذر چکا ہے۔ پانسہ پھینکا جا چکا ہے۔ اب اگر مدینہ کو بچانا ہے تو میدانی جنگ ناگزیر ہے۔ ابوجہل کی سرکردگی میں جو لشکر آ رہا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب قریش اس بات پر تلے ہوئے ہیں کہ میدان جنگ میں آخری فیصلہ ہو جائے۔ حضور ﷺ بھی حالات کا جائزہ لیتے ہیں۔ کیا مدینہ میں مسلمانوں کی کوئی معقول فوج بھرتی ہو سکتی ہے۔ یہودی اور عیسائی کسی قسم کی امداد دینے پر آمادہ نہیں بلکہ بعض تو اس پر یقین کیے بیٹھے ہیں کہ ابوجہل کے سوار مدینہ کی گلیوں میں دندناتے پھریں گے۔ وفاداریوں میں گھن لگ چکا ہے اور متذبذب لوگوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ عبد اللہ بن ابیٔ جو رئیس المنافقین کہلاتا ہے۔ کھلم کھلا مخالفت کر رہا ہے۔ باوجود اس اثر و رسوخ' سعی و کوشش کے پیغمبر ﷺ صرف 313 آدمیوں کو قریش کے مقابلے میں لانے پر کامیاب ہو سکے ہیں۔ آپ کے سواروں کا دستہ صرف دو گھوڑوں اور

ستر اونٹوں پر مشتمل ہے۔ تمام فوج میں صرف مہاجر و انصار ہی شریک ہیں۔ لیکن تعداد کی کمی ان کے جوش ایمانی' عزم راسخ اور الفت جہاد نے پورا کر دیا ہے۔ یہ مختصر سا گروہ تہیہ کر کے نکلا ہے کہ یا تو غازی بن کر لوٹے گا ورنہ سب کے سب راہ خدا میں شہید ہو جائیں گے۔ اور آج سے یہی اصول اسلامی جنگوں کی ایک خصوصیت بن جاتا ہے کہ جس وقت جہاد کا اعلان ہو تو بغیر یہ سوچے کہ دشمن کتنا طاقت ور ہے میدان میں کود پڑنا چاہیے۔

وقت چونکہ کم رہ گیا ہے اس لیے محمد ﷺ شہر کی حفاظت کے لیے اپنا ایک نائب مقرر کر کے اور ان تین سو تیرہ ہمراہیوں کو لے کر ساحل سمندر کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ یہاں آپ کو اطلاع ملتی ہے کہ ابوسفیان کا قافلہ بدر پہنچ رہا ہے۔ اور اہل مکہ اس کی حفاظت کے لیے آنے والے ہیں۔ لہٰذا آپ روانہ ہوتے اور نہایت سرعت اور ہوشیاری کے ساتھ وہاں پہنچ کر دونوں قافلوں کا درمیانی راستہ روک لیتے ہیں۔

جمعہ کا دن اور رمضان کی سترہ تاریخ ہے۔ قریش کو معلوم ہو جاتا ہے کہ محمد ﷺ ان پر سبقت لے گئے ہیں۔ اور انہوں نے کنوؤں کے متصل خیمے گاڑ دیئے ہیں تاکہ پینے کے پانی پر ان کا قبضہ رہے۔ ابوجہل اس پر بہت جھلایا ہوا ہے کہ اسے میدان میں اچھی جگہ نہ مل سکی۔ لیکن جب اس کے جاسوس اس اسلامی فوج کے حالات بتاتے ہیں جس سے مقابلہ ہونے والا ہے تو اس کے لبوں پر تمسخرانہ مسکراہٹ کھیلنے لگتی ہے۔ محمد ﷺ لاکھ باہمت اور شجاع سہی لیکن محض بہادری اور شجاعت ایک آزمودہ کار فوج کے مقابلے میں جو تعداد میں تین گناہ زیادہ اور اعلیٰ درجہ کے ہتھیاروں سے لیس ہے' کیا کام آ سکتی ہے۔ قریشی سردار ایک دوسرے کو ٹھوکے دیتے اور کہتے ہیں کہ آج جنگ نہیں قتل عام ہو گا۔ ایک ایک کو ذبح کر کے رکھ دیا جائے گا۔

برخلاف اس کے محمد ﷺ دشمن کی اس اکڑفوں اور یادہ گوئی کے مقابلے میں بالکل پرسکون ہیں۔ دنیا کی تاریخ میں اقوام کی فنا و بقا کا ایسا نازک موقع کم ہی دیکھنے میں آیا ہو گا۔ آپ حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ اپنی صفوں کے سامنے ادھر اُدھر گھومتے اور

لڑائی کے متعلق احکامات اور ہدایات دیتے جاتے ہیں۔ آج آپ ﷺ کے چہرہ مبارک پر دوسرا ہی رنگ ہے۔ آپ کی آنکھوں میں خواب کی سی جو کیفیت نمایاں رہتی تھی آج اس کا دور دور تک پتہ نہیں۔ ہونٹوں کی خمیدگی میں بھی بین فرق محسوس ہو رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے گویا آپ میں کوئی نئی طاقت جلوہ گر ہے۔ اس وقت آپ کی عمر 56 برس کی ہے۔ لیکن آپ پہلے سے زیادہ نوجوان اور طاقتور دکھائے دے رہے ہیں۔ دیکھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی زبردست فوجی رہنما اس لشکر کی قیادت کر رہا ہے۔ تیز نظر' سیاہ آنکھیں چپ و راست کا جائزہ لے رہی ہیں کہ ہر شخص ٹھیک اپنی جگہ پر کھڑا ہے یا نہیں۔ اور چہرہ مبارک سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے تہیہ کر رکھا ہے کہ یا تو میدانِ جنگ سے کامیاب لوٹیں گے ورنہ وہیں شہید ہو جائیں گے۔

قدرت نے بھی وقت کی نزاکت کا صحیح اندازہ کر لیا ہے' بادلوں کے بڑے بڑے دل آسمان کو ڈھانپے ہوئے ہیں۔ سورج نے منہ پر نقاب ڈال رکھی ہے اور وادی پر شمال کی سرد ہوا کا قبضہ ہے۔

قریش نے قدم آگے بڑھا دیئے ہیں اور عتبہ' شیبہ اور ولید اپنے دیوتاؤں کی عظمت کو برقرار رکھنے کی خاطر خون آشامی پر تل گئے ہیں۔ علیؓ' حمزہؓ اور عبیدہؓ ان کے مقابلے پر نکلتے ہیں۔ محمد ﷺ اللہ کی درگاہ میں سربسجود ہیں۔ ''یا اللہ! یہ بت پرست سامنے ہیں جو شان و شوکت اور غرور سے مخمور ہو کر تیرے پیغمبر ﷺ کو دروغ بافیوں اور ریاکاریوں کا مورد قرار دیتے رہے ہیں اور اب اس سے انتقام لینے آئے ہیں۔ یا اللہ اگر یہ چند حق پرست آج فنا ہو گئے تو پھر اس سرزمین پر قیامت تک کوئی متنفس تیرا نام لینے والا باقی نہ رہے گا۔ یا اللہ آسمانی افواج سے ہماری مدد فرما اور اپنا وعدہ ہمارے حق میں پورا کر۔'' یہ ایک ایسے شخص کی آواز ہے جس نے اپنی سی کوشش کر لی ہے اور اب مستقبل کو اپنے معبود حقیقی کے سپرد کر رہا ہے۔

دونوں فوجیں اپنے اپنے نبرد آزماؤں کی چابک دستی اور سپہ گری کا تماشہ دیکھ رہی ہیں۔ حمزہؓ کو صحیح معنوں میں شیر ببر کہنا درست ہے۔ علیؓ اپنی تلوار کی کاٹ اور جرأت و

شجاعت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ ولید بھی کئی معاریوں کا ہیرو ہے۔ لیکن جو مہارت آج دکھا رہا ہے ایسی کبھی پہلے دیکھنے میں نہیں آئی۔ اس کا جوش وخروش دلی آرزوؤں اور تمناؤں کا آئینہ دار ہے۔ لیکن پہلے وہی زمین پر گرتا ہے۔ غالباً ضعیف العمری کے باعث۔ لیکن جب وہ خاک وخون میں لتھڑا ہوا زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا تو اسے امید تھی کہ ایک روز اس کا لڑکا خالد اس خون کا بدلہ چکا دے گا۔ دوسرا نمبر شیبہ کا ہے۔ عتبہ کی عبیدہؓ سے بڑی سخت جنگ ہو رہی ہے۔ اس میں ان کا ایک پاؤں بھی کٹ گیا ہے لیکن وہ اب بھی عتبہ کی پے در پے ضربوں سے بچ رہے ہیں۔ اس وقت تک حمزہؓ اور حضرت علیؓ اپنے دشمنوں کو کیفر کردار تک پہنچا کر فراغت حاصل کر چکے ہیں اور فوراً ہی ان کی مدد کو پہنچ جاتے ہیں۔ عتبہ جب دیکھتا ہے کہ تین بہادر جنگجو مقابلہ پر آگئے ہیں تو مدافعانہ جنگ شروع کر دیتا ہے۔ لیکن مقابلہ پھر بھی بے خوفی سے جاری رکھتا ہے۔ تلوار کے مقابلے میں تلوار اٹھتی اور وار کے مقابلے میں وار ہوتا ہے۔ لیکن انجام کے بارے میں کسی کو شبہ نہیں۔ حمزہؓ اور علیؓ اسے تھکا کر چور کر دیتے ہیں۔ اور بالآخر وہ بھی ولید اور شیبہ کی طرح زمین پر ڈھیر ہو جاتا ہے۔ مسلمان اللہ اکبر کا فلک شگاف نعرہ لگاتے ہیں اور جوش وخروش کے ساتھ کفار مکہ پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ ساتھیوں کے منع کرتے کرتے بھی حضورؐ میدان میں آجاتے ہیں۔ آپ کا چہرہ ہشاش بشاش ہے آپ خود بھی جنگ میں شریک ہیں اور صحابہ کو بھی جوش دلا رہے ہیں۔ آپ فرماتے جاتے ہیں ''اللہ ہماری پشت پر ہے۔ اس کے فرشتے ہماری امداد پر متعین ہیں۔ مسلمانو! اس امر میں مطلق شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ آج فتح ہماری ہی ہو گی۔'' تین سو آدمی ایک ہزار سے برسر پیکار ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان کے دلوں میں شمع ایمان روشن کر رکھی ہے۔ ہر شخص کو ان مشکلات کا علم ہے جو اس کی راہ میں حائل ہیں۔ لیکن ساتھ ہی اسے یہ بھی یقین ہے کہ خدا نے اس کے ہاتھوں میں غیر معمولی طاقت دے رکھی ہے اور اسے اوّل تو فتح نصیب ہو گی ورنہ شہادت کی صورت میں جنت تو کہیں گئی ہی نہیں اور اسلام کا بول بالا ہونا بالکل یقینی ہے۔

اہل مکہ کو گمان تک نہ تھا کہ مسلمان کوئی مدافعت بھی کر سکیں گے۔ کیونکہ ان کی برتری بہر صورت مسلم تھی۔ جس مقصد کے لیے وہ جنگ کر رہے تھے وہ بھی اعلیٰ و ارفع تھا۔ اور ان کے ہتھیاروں کی کاٹ بھی بڑی زبردست تھی۔ اور ان کے جنرل بھی بڑے آزمودہ کار تھے۔ جن کے نزدیک شکست کا نام تک لینا کفر تھا۔ لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ احساس برتری' فخر و غرور کی شکل اختیار کر کے خود اپنا ہی ستیاناس کر لیتا ہے۔ چنانچہ آج بدر میں بھی ایسے ہی واقعات پیش آ رہے ہیں۔ مثلاً ابتداء ہی میں مکہ کے تین مسلم الثبوت سرداروں کی موت' مسلمانوں کا بے پناہ حملہ اور پھر ایک تیز و تند ہوا کا مقابل میں سے آ جانا' جو ان کی آنکھوں میں دھول جھونک رہی ہے۔ قریش کی ہمتیں پست ہوتی جاتی ہیں۔ ان کا سپہ سالار ابوجہل حضرت علیؓ کی تلوار کا شکار ہو چکا ہے۔ اور کئی دوسرے سرداران لشکر خاک پُرمردہ پڑے ہیں۔ آخر وہ بالکل ہی کندھا ڈال دیتے ہیں۔ صفوں میں لغزش ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ محمد ﷺ اس کمزوری کو محسوس فرما لیتے ہیں اور ایک مٹھی ریت اٹھا کر ان کی طرف پھینکتے اور فرماتے ہیں "تمہاری آنکھوں پر دھند چھا جائے۔" پھر اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو کر فرماتے ہیں "ہمت سے کام لو اور دشمن پر حملہ کر دو' فتح تمہاری ہی ہو گی۔" مسلمانوں میں ایک نئی روح پیدا ہو جاتی ہے اور وہ آخری حملہ کرنے کی تیاری کرتے ہیں۔ ہر شخص جان لڑا دیتا ہے۔ قریش پر اچانک ایک زبردست یورش ہوتی ہے۔ ان کے قدم اکھڑ جاتے ہیں اور اس طرح فتح کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

قریش کے ستر نبرد آزما میدان جنگ میں کام آ جاتے ہیں اور تقریباً اتنے ہی مسلمانوں کے ہاتھوں میں اسیر ہوتے ہیں۔ ولید' عتبہ' ابوجہل اور بعض دوسرے مشاہیر کا شمار بھی اب زندوں میں نہیں ہوتا۔ وہ سب ہی ہلاک ہو چکے ہیں۔ عباسؓ اور عقبہ اسیروں کی فہرست میں شامل ہیں۔ بڑا زبردست مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ لگتا ہے۔ ان کی طرف بھی چائیس مومنوں نے جام شہادت نوش فرمایا ہے۔ جنگ نے ثابت کر دیا ہے کہ اہل اسلام کا دعویٰ حق پرستی سچا ہے۔ علیؓ نے جن کی عمر اس وقت انیس سال ہے۔ بہادری

کا وہ ثبوت دیا ہے کہ بعض لوگ انہیں جنگ کے دیوتا مریخ کا اوتار سمجھنے لگے ہیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے ایک چھوڑ سات کفار کو ہلاک کیا ہے اور آنحضرت ﷺ نے طے فرما لیا ہے کہ اس کے انعام میں آپ اپنی سب سے عزیز بیٹی نیک باطن فاطمہؓ کو ان کے نکاح میں دے دیں گے۔ گرفتار ہونے والوں میں نضر اور عقبہ کے علاوہ حضور ﷺ کے چچا عباسؓ اور حضور ﷺ کے داماد یعنی حضرت زینبؓ کے شوہر ابوالعاص بھی شامل ہیں۔ حضرت عباسؓ کو رہا کر دیا جاتا ہے کیونکہ باوجود کٹر قریش ہونے کے انہوں نے حضور ﷺ سے ہمیشہ مہربانی اور رواداری کا سلوک کیا ہے۔ آنحضرت ﷺ کو یاد ہے کہ جب اہل یثرب آپ کو مدعو کرنے کے واسطے آئے تھے۔ تو انہوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اگر تم کو آپ پر پورا پورا اعتماد اور دین اسلام پر پورا یقین ہے۔ تب تو تم انہیں بلاؤ ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں تم لوگ ان کا ساتھ چھوڑ دو یا ان سے غداری کرو۔ تو وہ نہ اِدھر کے رہیں نہ اُدھر کے۔ ابوالعاص کو بھی اس شرط پر آزادی مل جاتی ہے کہ زینبؓ کو باپ کے پاس پہنچا دیں۔ نضر اور عقبہ جنہوں نے حضورؐ کی ایذا رسانی اور بدنامی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی اور اب بھی ان سے امید نہ تھی کہ اپنی حرکتوں سے تائب ہو جائیں گے۔ بدترین سزا کے مستوجب قرار پاتے ہیں۔ لیکن حضورؐ بے انتہا نرم خو واقع ہوئے ہیں۔ اور جب نضر کی لڑکی کو آہ و زاری اور گریہ و بکا کرتے دیکھتے ہیں تو آپ کی آنکھیں پُرنم ہو جاتی ہیں۔ اور آپ کو اس امر پر بے حد قلق ہوتا ہے کہ اس کی جاں بخشی نہیں کر سکتے۔ یہی بات آپ ﷺ کے اس حکم سے بھی ہویدا ہوتی ہے کہ آپ نے قبائل کے مروّجہ طریقوں کے بالکل برخلاف اپنے ساتھیوں کو ہدایت فرمائی ہے کہ اسیرانِ جنگ کے ساتھ مہربانی اور ہمدردی کا برتاؤ کیا جائے۔

فتح بدر اسلام کے عروج میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ قریش گذشتہ پندرہ برس سے جس مذہب کو بدنام کرتے اور جس فرقہ کو ایذا اور تکلیف پہنچاتے رہے آج اس نے ان کو دندان شکن شکست سے دوچار کر دیا ہے۔ ان کی فوج کے منتخب سردار چاہ بدر کے نزدیک مدفون ہیں۔ اہل مکہ کو اس میں نحوست کے آثار نظر آتے ہیں۔ اسلام

کے قدم مضبوط ہو گئے ہیں۔ اب اس سے بے اعتنائی نہیں برتی جا سکتی۔ اور نہ اس کے اثرات کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک زندہ حقیقت اور مستقل خطرہ بن چکا ہے۔ مسلمانوں کی نظروں میں بھی یہ فتح بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ابھی تک وہ معاشرہ میں ثانوی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن اب ان کو ایک اونچا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔ حضور ﷺ کو بھی مدینہ میں استحکام حاصل ہو گیا ہے۔ اب آپ کے مخالفین کی سازشیں چوپٹ ہو کر رہ گئی ہیں۔ اور دشمنوں کو آپ کے مقابلے میں بڑی تشویش لاحق ہو رہی ہے۔

لیکن بہ حیثیت ایک انسان کے محمد ﷺ میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ جب لڑائی چھڑی ہوئی تھی تو آپ لوہے اور فولاد کی مانند تھے۔ لیکن فتح کے بعد پھر وہی نرم خو نیک دل پیغمبر اسلام نظر آتے ہیں۔ آپ نے جنگی قیدیوں کو جو مراعات دیں اور ان کے ساتھ جس حسن سلوک کا برتاؤ کیا اس سے خود آپ کے صحابہ متحیر رہ گئے۔ پھر ایک عجیب بات یہ ہے کہ اس فتح کا سہرا آپ نہ اپنے سر باندھ رہے ہیں نہ اپنے ہمراہیوں کے۔ آپ کے نزدیک یہ سب کچھ اللہ کا کیا دھرا ہے۔ اور اس کے فضل و کرم کا نتیجہ ہے۔ آپ ﷺ کا فرمانا ہے کہ "اللہ نے ہم سے مدد کا وعدہ فرمایا تھا۔ وہ اس نے پورا کر دیا۔ جنگ میں ایک ہزار فرشتے ہماری جانب سے لڑ رہے تھے۔" پھر جب آپ کے ہمراہی مال غنیمت کے بارے میں ایک دوسرے سے جھگڑنے لگتے ہیں تو قرآن کی ایک سورۃ نازل ہوتی ہے جس میں بتایا جاتا ہے کہ بیت المال یعنی قومی خزانے کے لیے پانچواں حصہ نکال کر باقی تمام مال و اسباب' ساز و سامان مساوی طور پر جنگ میں شرکت کرنے والے صحابہ پر تقسیم کر دیا جائے۔ کیونکہ فتح اللہ کی اعانت سے حاصل ہوئی ہے۔ اور اتنے کفار جو مارے گئے ہیں ان کو مسلمانوں نے نہیں بلکہ خود اللہ نے ہلاک کیا ہے۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔﴿7﴾۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

قبل اس کے کہ ہم آنحضرت ﷺ کی قائم کردہ مدنی دولت مشترکہ میں خود حضور ﷺ کا حال بیان کریں یا قریش سے مزید نبرد آزمائی کی داستان چھیڑیں ہمیں ایک نظر گذشتہ واقعات پر ڈالنی اور آپ کی نجی زندگی کے بعض اہم واقعات کا جائزہ لینا

ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ خاتون خدیجہؓ کے انتقال کا آپ کو کتنا صدمہ اور قلق ہوا تھا۔ ہم نے حضرت ابوبکرؓ کی دختر عائشہؓ سے آپ کی مناکحت کا بھی ذکر کیا تھا۔ آپ کو یہ بھی یاد ہو گا کہ شادی کے وقت عائشہؓ بہت کمسن تھیں اور اس قابل نہ تھیں کہ زندگی کی ذمہ داریوں کو سنبھال سکیں اس لیے اس وقت تک کے لیے جب تک وہ سن بلوغ کو نہ پہنچیں' باپ ہی کے پاس رہنا طے ہوا تھا۔ جس زمانہ میں یہ رشتہ طے ہوا۔ آپ اپنی زندگی کے نازک ترین دور سے گذر رہے تھے لیکن ان چند برسوں میں بڑے اہم واقعات رونما ہو چکے ہیں۔ کہاں تو آپ کو وادیٔ شعب کی پہاڑیوں میں پناہ لینی پڑی تھی۔ کہاں آج آپ مدینہ کی اہم ترین شخصیت بن چکے ہیں۔ اس دوران میں عائشہؓ نے علم اور سمجھ بوجھ کے لحاظ سے بڑی ترقی کر لی ہے۔ اب انہیں معلوم ہو گیا ہے کہ شادی کسے کہتے ہیں۔ اس کا مقصد کیا ہے اور نتائج کیا ہوتے ہیں۔ پھر آپ کو یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ کسی ایسی بڑی شخصیت سے جو نہ صرف ان کے باپ کی دوست بلکہ مدینہ کی سردار اور اسلام کی سربراہ بھی ہے مناکحت کیا معنی رکھتی ہے۔ قدرت نے بھی آپ کو نہ صرف غیر معمولی حسن عطا کیا ہے بلکہ ذہانت میں بھی نمایاں حصہ دیا ہے اور ان خصوصیات کے ساتھ آپ پندرہ برس کی عمر میں حضورﷺ کا گھر آباد کرتی ہیں۔

بیوی کی حیثیت اختیار کرنے پر عائشہؓ کو سودہؓ سے بڑی امداد ملتی ہے اور گو وہ عمر میں اوّل الذکر سے کچھ بڑی ہیں لیکن ان کی جوانی اور اس کی کشش اب بھی باقی ہے۔

آنحضرتﷺ نے مساوات قائم رکھنے کے لیے بیویوں کے واسطے یکساں مکانات بنوائے ہیں۔ اور باری باری دونوں کے ہاں شب باش ہوتے ہیں۔ عائشہؓ بہت جلد خانگی معاملات میں اپنی اہمیت حاصل کر لیتی ہیں۔ وہ خود رائے واقع ہوئی ہیں اور پیغمبرﷺ کے درجات اور اختیارات کا انہیں بڑی حد تک احساس بھی ہے۔

ایک دن آئینہ دیکھ کر وہ حضورﷺ سے کہتی ہیں ''کیا میں ان بوڑھی خدیجہؓ سے بہتر نہیں ہوں جن کی آپ اتنی تعریف کیا کرتے ہیں؟''

ان الفاظ کو سن کر آپ کی پیشانی پر شکنیں پڑ جاتی ہیں اور آپ فرماتے ہیں

''میرے دل میں کوئی عورت خدیجہؓ کی جگہ نہیں لے سکتی۔ جب میں بے یارو مددگار تھا تو وہ مجھ سے ہمدردی کرتی تھیں اور جب تمام دنیا میری باتوں کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھ رہی تھی تو صرف وہی تھیں جنہوں نے مجھے سچا سمجھا تھا۔'' حضرت عائشہؓ نے پھر تمام عمر ان باتوں کو فراموش نہ کیا۔

جب آنحضرت ﷺ بدر سے فاتح و کامران مدینہ تشریف لائے تو جو عورتیں آپ کی سواری کو دیکھ رہی تھیں۔ ان میں حسین و نازنین حفصہؓ بھی تھیں جو اپنے باپ عمرؓ کے پہلو میں کھڑی تھیں۔ پیغمبر ﷺ جب اُدھر سے گزرے تو آپ نے ایک بیش قیمت جزدان جس میں قرآن شریف رکھا ہوا تھا ان کی سپردگی میں دے دیا تھا۔ حفصہؓ چہرہ مہرہ اور مزاج دونوں کے لحاظ سے باپ کی مثنیٰ ہیں۔ پہلے ایک ہوشیار مسلمان نوجوان کی بیوی تھیں۔ لیکن وہ بدقسمتی سے جنگ بدر میں شہید ہو گئے۔ اور حفصہؓ شباب میں بیوہ ہو گئیں۔ حضرت عمرؓ نے ان کی شادی پہلے حضرت ابوبکرؓ اور پھر حضرت عثمانؓ سے کرنے کی کوشش کی لیکن چونکہ دونوں بزرگ ساکت و صامت سمندر کے متلاشی تھے اور حفصہؓ کا حسن و مزاج کسی طوفان خیز بحرآب سے مشابہت رکھتا تھا۔ اس لیے انہوں نے بلطائف الحیل ٹال دیا۔ بالآخر حضور ﷺ ہی نے اس مسئلہ کو یوں حل کیا کہ عائشہؓ اور سودہؓ کے ساتھ ان کو بھی اپنی ازدواج میں شامل فرما لیا۔

حضور ﷺ کے گھرانے کا دوسرا مسئلہ زیدؓ کی زینبؓ سے شادی ہے۔ جو امیمہ بنت عبدالمطلب کی صاحبزادی ہیں۔ زیدؓ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کسی زمانے میں حضورؐ کے غلام تھے۔ اور آپؐ نے ان کی اطاعت شعاری اور وفاداری کے صلہ میں ان کو آزاد کر دیا تھا۔ پھر ان کی صدق دلی کے باعث انہیں اپنا متبنیٰ بیٹا بنا لیا۔ شادی سے قبل زینبؓ کو اپنے قریبی عزیز محمد ﷺ سے گونہ لگاؤ تھا۔ اور انہوں نے اپنی ماں سے درخواست بھی کی تھی کہ ان کا نکاح حضور ﷺ سے کر دیا جائے۔ زینبؓ کے بھائی کی بھی یہی خواہش تھی کہ بجائے کسی آزاد شدہ غلام کے ان کی شادی اپنی مرضی کے مطابق کی جائے۔ لیکن پیغمبر خدا ﷺ بتانا چاہتے تھے کہ اسلام میں کسی ادنیٰ حیثیت کے شخص کی

نسبت کسی صاحب حیثیت یا دولتمند خاتون کے ساتھ بھی ہو سکتی ہے۔ اس لیے پیغمبر علیہ السلام کے حکم سے زیدؓ کا نکاح قریش کے ایک بااثر خاندان میں حضرت عبدالمطلب کی نواسی سے ہو گیا۔

اسی طرح بدر کے بعد حضرت علیؓ کی شادی حضرت فاطمہ زہراؓ سے ہو جاتی ہے جو حضرت عائشہؓ کی ہم عمر اور حضورؐ کی چہیتی بیٹی ہیں۔ خدیجہؓ کے بعد جتنی محبت آپ کو ان سے رہی ہے وہ کسی دوسری عورت کے حصے میں نہیں آئی۔ ان کی مثال ایک گوہر نایاب کی سی ہے۔ جس کی جگہ حضورؐ کے صدف دل میں ہے۔ ان میں آپ کو خود اپنا عکس اور ماں کی صفات نظر آتی ہیں۔ ان کو بھی اپنی والدہ کی طرح حضورؐ پر مکمل یقین ہے۔ اور صفائی قلب میں خود آپ کی تمثیل ہیں۔ نماز کی بے انتہا پابند اور عبادت گزار ہونے کے ساتھ ساتھ ان تمام عیوب و معائب سے منزہ ہیں۔ جو ان عمر کی لڑکیوں کا وطیرہ ہوا کرتا ہے۔ ان کو اپنے سے جدا کر کے آپ حضرت علیؓ کو گویا وہ سب کچھ دے رہے ہیں جو آپ کو اس دنیا میں سب سے بڑھ کر عزیز ہے۔ اور علیؓ اس کے مستحق بھی ہیں۔ کیونکہ انہوں نے حضورؐ سے محبت و وفاداری' فرائض کی ادائیگی اور بے نظیر جرأت و شہامت کے جو ثبوت پیش کیے ہیں۔ بدر کے میدان میں دشمن کا جس پامردی سے مقابلہ کیا ہے۔ جس کو دیکھ کر دوست دشمن سب ہی کے منہ سے تعریفی کلمات نکلے۔ اس کے بعد آپ کے اس رشتہ کی موزونیت کے متعلق کوئی احتمال ہی باقی نہیں رہتا۔ یہ صحیح کہ فاطمہؓ کا شوہر بننے کی صلاحیت کسی انسان میں موجود نہیں لیکن اگر کوئی شخص ایسا مل سکتا ہے تو وہ صرف حضرت علیؓ ہی ہیں۔

قاسم کی وفات کے بعد آپؐ کے کوئی لڑکا پیدا نہیں ہوا۔ زیدؓ اور علیؓ دونوں کو آپ زرناب سمجھتے ہیں۔ لیکن کوئی متبنیٰ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو صلبی فرزند کی جگہ نہیں لے سکتا۔ یہ بھی قدرت کا ایک کرشمہ ہے کہ ہر شخص کو زندگی کے کسی نہ کسی لمحہ میں یہ خواہش ضرور ہوتی ہے کہ اس کے اپنے گوشت پوست سے بنا ہوا ایک بیٹا ہو جو خود اس کی تمثیل اور اس کی خصوصیات کا آئینہ دار ہو اور اس خواہش میں امیر غریب' ادنیٰ و اعلیٰ سب برابر

کے شریک ہیں۔ اسلام کے پیغمبر ﷺ مدینہ کے حاکم اور بدر کے فاتح محمد ﷺ بھی بہ حیثیت انسان کے اس سے مستثنیٰ نہیں۔ آپ کے بیٹیاں ہیں اور بڑی بامحبت و بامروّت اور معصوم ایسی جن پر ہر باپ کو فخر ہو لیکن آپ کا دل ایک فرزند دلبند کا متمنی ہے۔

بدر پر خوش ہونے کے لحات آپ کے حق میں بہت مختصر ثابت ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس کے فوراً ہی بعد آپ ﷺ کی صاحبزادی رقیہؓ کا انتقال ہو جاتا ہے۔ وہ بھی اپنے شوہر حضرت عثمانؓ کے ساتھ ہجرت حبشہ میں شامل تھیں۔ اور جب حالات میں تغیر واقع ہوا تو دونوں میاں بیوی مدینہ آ کر یہاں مقیم ہو گئے۔ حضورؐ کی خواہش ہے کہ حضرت عثمانؓ سے رشتہ داری برقرار رہے۔ اس لیے آپؐ اپنی دوسری صاحبزادی یعنی رقیہؓ کی چھوٹی ہمشیرہ کی شادی ان سے کر دیتے ہیں۔ اس مناکحت کے وقت کوئی خاص اہتمام نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ رقیہؓ کے انتقال پر حضورؐ اور حضرت عثمانؓ دونوں ہی غمزدہ ہیں۔

﴿8﴾

اب ہجرت کا تیسرا سال ہے۔ مسلمانوں کی ایک مختصر سی جماعت کو بدر کے مقام پر قریش کے علم سرنگوں کیے ہوئے بارہ مہینے گذر چکے ہیں۔ اسیرانِ جنگ زیادہ تر فدیہ دے کر گھروں کو واپس جا چکے ہیں۔ جو لوگ صاحب استطاعت تھے انہیں چار ہزار درہم کی ادائیگی پر آزادی مل گئی ہے۔ لیکن جو اس قابل نہیں انہیں مفت ہی چھوڑ دیا گیا ہے۔ چند لوگ لکھ پڑھ سکتے ہیں۔ اس شرط پر آزاد کر دیئے گئے ہیں کہ ہر شخص دس مسلمان بچوں کو نوشت و خواند سکھا دے۔ قیدیوں میں سے کسی کے ساتھ سختی نہیں برتی گئی۔ کیونکہ اس معاملہ میں حضور ﷺ کی ہدایات صاف اور واضح ہیں۔

مکہ واپس پہنچ کر ان لوگوں نے اس بات کی شہادت دی ہے کہ محمد ﷺ اور مسلمانوں نے ان کے ساتھ بہت عمدہ سلوک کیا اور بعض تو اس سلسلہ میں آپ کے بڑے شکر گزار ہیں اور کہتے ہیں کہ ”مدینہ کے لوگ بڑے شریف النفس ہیں خود پیدل چلے اور ہمیں سواریاں دیں۔ ہمیں گندم کی روٹی کھلائی اور خود کھجوروں پر گزارہ کیا۔“ ایک نے بیان کیا کہ کس طرح اسے حضور ﷺ کے سامنے پیش کر کے بتایا گیا کہ یہ اچھا خاصا

پڑھا لکھا اور سمجھدار شخص ہے۔ لیکن اسلام کے خلاف بڑے سخت الفاظ استعمال کرتا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے آپ سے اجازت چاہی کہ اس کے دو دانت توڑ دیئے جائیں تاکہ وہ جب کبھی منہ کھولے تو ہر شخص کو علم ہو جائے کہ اسے کس وجہ سے ایسی عبرتناک سزا ملی ہے۔ لیکن آپ نے نہایت سختی سے جواب دیا کہ "اس کو چھوڑ دو۔ آج اگر میں نے اس کا چہرہ بگاڑا تو کل کہیں خدا میرا حلیہ نہ بگاڑ دے۔"

لیکن آنے والوں سے یہ سب کچھ سن کر بھی مسلمانوں کے خلاف اہل قریش کے غصہ اور تنفر میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ ایک بے سرو سامان، متفرق چھوٹی سی جماعت کے ہاتھوں ان کا شکست کھا جانا قبائل میں سخت بے عزتی اور ننگ و عار کا باعث بن رہا ہے اور اس سے ان کی ناموری اور نیک نامی پر حرف آ گیا ہے۔ کبھی وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ ان کی یوں مٹی پلید ہو گی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انتقام کا جذبہ تیز ہوتا جا رہا ہے۔ دل کھول رہے ہیں۔ آگ سلگ رہی ہے۔ ابوسفیان کی بیوی اپنے باپ عتبہ کا انتقام لینے کا دن رات انتظار کرتی ہے اور اس کا یہ مطالبہ اتنا زور پکڑ جاتا ہے کہ ابوسفیان بہ نفس نفیس دو سو آدمی لے کر مدینہ پر دھاوا کر دیتا ہے۔ لیکن جب پیغمبر ﷺ کی فوج مقابلہ پر آتی ہے تو ہمتیں جواب دے جاتی ہیں تو وہ اپنے کھانے پینے کا سامان چھوڑ چھاڑ کر مکہ کی طرف نوک دم بھاگ جاتے ہیں۔ اس لیے اس کو غزوہ سویق (یعنی ستوؤں کی جنگ) کہتے ہیں۔ اس سے فائدہ تو کچھ نہ ہوا البتہ بدنامی کا ایک اور ٹوکرا قریش کے سروں پر رکھ دیا گیا۔

فتح ہو یا شکست محمد ﷺ دونوں صورتوں میں وہی شریف النفس، خوش اخلاق پیغمبر نظر آتے ہیں۔ جو رفاہ عام کے کاموں میں منہمک اور تنظیمی امور میں بے لاگ فیصلے صادر فرماتے ہیں۔ بعض یہود جنہوں نے مسلمانوں کو بدنام کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی اور آپ کے خلاف سنگین قسم کی سازشیں کر رہے تھے قتل کر دیئے گئے ہیں۔ چند کو جلا وطن کیا جا چکا ہے۔ انہیں میں ایک مشہور شاعر کعب بن اشرف بھی ہے۔ مدینہ سے نکل کر وہ سیدھا مکہ کا رُخ کرتا ہے اور وہاں پہنچ کر چند ہی روز میں ایک معروف شخصیت

بن جاتا ہے۔ جلاوطنی نے اس کو محمد ﷺ اور اسلام کا اور بھی سخت مخالف بنا دیا ہے۔ وہ ہجو کی شکل میں اہل اسلام کے خلاف زہر اگلتا' بدر میں مقتول اہل قریش کا مرثیہ پڑھتا اور نظم میں اہل مکہ کو حملہ کرنے اور مدینہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کی پیشن گوئیاں کرتا پھرتا ہے۔ اس کی نظمیں بڑی شہرت حاصل کر رہی ہیں۔ جس سے انتقام کے جذبات اور بھڑکتے جاتے ہیں اور جنگ کے خطرات بڑھ رہے ہیں۔

کعب کی دلی کدورت نے اس کی عقل پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ وہ مدینہ کی طرف چل پڑتا ہے تاکہ جو سردار مذبذب ہیں انہیں ورغلائے۔ لیکن یہاں اسے یکایک گرفتار کرلیا جاتا ہے۔ ایسے کھلے ہوئے مجرم کے لیے کسی بڑے مقدمہ کی ضرورت نہیں۔ اس نے جلاوطنی کے احکام کی خلاف ورزی کی ہے۔ اس نے مخالفت کے جذبات کو ہوا دی ہے اور جہاں تک ممکن ہو سکا قریش کو مسلمانوں پر حملہ کرنے کی شہ دی ہے۔ ایسے شخص کے حق میں ایک ہی فیصلہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ تلوار اس کے سر کو تن سے جدا کر دیتی ہے۔

لیکن قریش کے ہاں تیاریاں اس سے پہلے ہی مکمل ہو چکی ہیں۔ کعب کی موت تو صرف جنگ چھڑنے کا بہانہ بن گئی ہے۔ قریش کی فوجوں کا کمانڈر ابوسفیان اپنی حربی قابلیت' سوجھ بوجھ اور سخت کامی کے لیے مشہور ہے۔ اس نے خود اپنے قبیلہ کے علاوہ دوسرے پڑوسی قبائل کو بھی آمادہ جنگ کر لیا ہے۔ اس طرح وہ تین ہزار کی ایک جماعت کے ساتھ جو پوری طرح اسلحہ سے لیس ہے' بدر کا انتقام لینے چل پڑتا ہے۔ اس کے ہمراہ مکہ کے بہترین نوجوان ساتھ ہیں۔ جن میں ابوجہل کا بیٹا عکرمہ اور ولید کا لڑکا خالد بھی شامل ہے۔ سات سو سے زیادہ فوجی زرہ بکتروں میں ملبوس ہیں۔ اور دو سو سواروں کا ایک دستہ بھی ان کے ہمراہ ہے۔ عورتوں کا بھی ایک ٹولہ ہمراہ جا رہا ہے تاکہ وہ سپاہیوں کی ہمتیں بڑھاتی اور انہیں پامردی اور فتح کے حصول پر اکساتی رہیں۔

فوجیں اُحد پر ایک دوسرے کے سامنے آتی ہیں۔ قریش گویا مدینہ تک ہی پہنچ چکے ہیں۔ جبل اُحد شہر کی فصیل سے صرف ایک گھنٹہ کے راستے پر ہے۔ ابوسفیان کی فوج

نے یہاں پڑاؤ کیا ہے۔ تا کہ کچھ ستا لے اور ساتھ ہی باغات اور کھیتوں کو تباہ کر دیا جائے۔ حضور ﷺ صحابہ سے مشورہ فرما رہے ہیں۔ آپ کی رائے میں مسلمانوں کی فوج اس لشکر عظیم کے مقابلے میں بالکل ناکافی ہے اور آپ نے وجدانی طور پر خطرات کا اظہار بھی فرما دیا ہے۔ آپ نے ایک خواب دیکھا ہے جس میں گائیں قربان کی جا رہی ہیں۔ آپ کی تلوار شکستہ ہو گئی ہے۔ اور آپ زرہ بکتر پہننے کی کوشش فرما رہے ہیں۔ اس کی تعبیر آپ نے اس طرح فرمائی ہے کہ مدینہ کے اندر ہی رہ کر جنگ کرنی بہتر ہو گی۔ آپ کے دیرینہ اور تجربہ کار ہمراہی تو اس رائے سے متفق ہیں۔ لیکن نوجوان صحابی میدان جنگ میں اپنے جوہر دکھانے کے متمنی ہیں۔ کیا قریش ہمارے باغوں کو تباہ کرتے اور پکی پکائی فصلوں کو کاٹتے رہیں۔ اور ہم ٹک ٹک دیدم' دم نہ کشیدم' منہ تکتے رہیں۔ اس کے بعد ہم اہل مدینہ اپنے ہمعصروں کو کیا صورت دکھائیں گے۔ ہماری عزت نفس کیا باقی رہ جائے گی۔ نوجوان اس نکتہ پر جم جاتے ہیں اور میدان جیت لیتے ہیں۔ چنانچہ پیغمبر ﷺ مغرب کے قریب ایک ہزار کی جمعیت کے ساتھ مدینہ سے نکلتے ہیں۔ ان میں سے صرف سو کے پاس زرہ بکتر ہیں اور فوج میں سوار کوئی بھی نہیں ہے۔

رات جنگ کی تیاریوں میں صرف ہوتی ہے۔ وفادار صحابیوں میں ابوبکرؓ علیؓ اور حمزہؓ آپ کے ہمراہ ہیں۔ عبد اللہ بن ابی اپنے ساتھیوں کو لے کر نکلا ہے لیکن دشمنوں کو دیکھ کر ہمتیں جواب دے جاتی ہیں اور وہ مع اپنے تین سو سواروں کے حلف وفاداری توڑ کر واپس لوٹ جاتا ہے۔

صبح کے وقت صرف سات سو بہادر رہ جاتے ہیں۔ جن کو اپنے سے چار گنا فوج کا مقابلہ کرنا ہے۔ چند ہلکے ہلکے بادل آسمان پر اِدھر اُدھر تیر رہے ہیں۔ جن پر طلوع ہونے والے سورج کی کرنیں منعکس ہو کر تمام میدان کو ارغوانی رنگ میں غوطہ دے رہے ہیں۔ قریش کے جھنڈے میدان میں گڑے ہوئے بڑے فخر سے ہوائیں لہرا رہے ہیں۔ اہل مکہ کے خیموں اور خوابگاہوں میں گانا بجانا ہو رہا ہے۔ عورتوں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی ہیں۔ "جوانمردو! عبدالدار کے فرزندو! جان لڑا دو۔ تم ہی عورتوں کے

محافظ ہو۔ اپنی تلواروں سے دشمن کو کاٹ کر رکھ دو۔ تین ہزار آوازیں نعروں کی صورت میں اس کا جواب دیتی ہیں۔ جس سے زمین دہل جاتی اور پہاڑ گونج اٹھتے ہیں۔ ایک دفعہ عورتیں پھر تان لگاتی ہیں "ہم دختران فجر ہیں۔ ہم صبح کے تارے ہیں۔ دشمن کا بہادری سے مقابلہ کرو اور فاتح بن کر لوٹو تو ہم تمہیں عطر بیز گیسوؤں کی خوشبو اور موتی جڑے ہوئے گہنوں کے ساتھ اپنے سینے سے لگائیں گی اور تم نے پیٹھ دکھائی تو تم پر لعنت بھیجیں گی، تمہارے منہ پر تھوکیں گی اور تم سے نفرت کریں گی۔" پھر ایک ساتھ تین ہزار نعرے لگتے ہیں "ہم جیتیں گے! ہم دشمنوں کی بوٹی بوٹی اڑا دیں گے! ہم ان کے چیتھڑے بکھیر دیں گے۔"

مسلمانوں میں بھی جوش و غضب کچھ کم نہیں ہے۔ عبد اللہ بن ابی کی منافقت نے ان کے ارادوں کو اور راسخ اور عزم کو زیادہ مضبوط کر دیا ہے۔ ایک بہت بوڑھا ضعیف ہے اور فوج میں شامل ہونے کی درخواست ان الفاظ میں کرتا ہے "یا رسول اللہ! میں اب برلب گور ہوں۔ اگر مجھے اللہ کے واسطے تلوار چلانے کی اجازت مل جائے تو مجھے دین و دنیا دونوں کی برکات حاصل ہو جائیں۔" ایک بچہ پنجوں کے بل کھڑا ہو کر ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنے قد کے لحاظ سے اس کا اہل ہے کہ سپاہیوں میں بھرتی کر لیا جائے۔ یہ تو صرف دو مثالیں تھیں۔ ورنہ ہر شخص انہیں جذبات سے مملو ہے۔ بدر میں مسلمان تین کے مقابلے میں ایک تھے۔ اب چار کے مقابلے میں ایک ہیں۔ تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہر نوجوان اپنے آپ کو ایک سورما سمجھ رہا ہے۔ ہر کمزور اور ناتواں کے جسم میں نئی روح متحرک ہے۔ عرب کے جلتے تپتے سورج کی حدت سے پکے ہوئے گندم گوں جسموں میں تازہ جان پڑ گئی ہے۔ اور ان کے دل فولاد کی طرح مضبوط ہو گئے ہیں۔ وہ دشمن پر ٹوٹ پڑنے کے لیے بیتاب ہیں۔ ساتھ ہی انہیں اپنے اوپر اعتماد ہے، بلکہ شاید ضرورت سے زیادہ ہی اعتماد ہے۔

بدر کی طرح آج پیغمبر ﷺ عقب میں نہیں ہیں۔ ابتداء ہی سے آپ ﷺ نے فوجوں کی کمان شروع کر دی ہے۔ کبھی اِدھر جاتے ہیں کبھی اُدھر۔ اور فوج کے

سالاروں کو آخری ہدایات صادر فرما رہے ہیں۔ سرخ صافہ آپ کو دوسروں سے ممیز کر رہا ہے۔ لوگ آپ کو ہر طرف دیکھ رہے ہیں۔ کبھی آپؐ ان کو ہمت دلاتے ہیں۔ کبھی دشمنوں کی تعداد کے مقابلے میں خدا تعالیٰ کی امداد کے تصور سے دلوں کو مضبوط کرتے ہیں اور کبھی ثابت قدمی اور پامردی کی تلقین فرماتے ہیں۔ آپؐ نے اپنی فوج کو بڑی تدبیر و تدبر سے مختلف مقامات پر تعینات فرمایا ہے۔ آپ نے اس اونچی زمین کو جو سمندر تک چلی گئی ہے اور جس کے عقب میں اُحد کا پہاڑ واقع ہے۔ جنگ کے واسطے منتخب کیا ہے۔ اس پہاڑ کی چٹانوں نے زمین سے نکل کر سنگلاخ پتھر کی ایک مضبوط دیوار کھڑی کر دی ہے۔ وحوش و طیور تک کا اس پر گزر نہیں ہو سکتا۔ نہ اس پر کوئی جھاڑی اگتی ہے نہ کہیں سبزہ دکھائی دیتا ہے۔ ان چٹانوں کا سلسلہ بہت دور تک چلا گیا ہے اور بجز ایک درّہ کے ہر طرح محفوظ ہے۔ اس جگہ حضور ﷺ نے پچاس تیر اندازوں کو اس حکم کے ساتھ متعین کر دیا ہے کہ لڑائی خواہ کچھ ہی صورت اختیار کرے اور انجام کچھ ہی کیوں نہ ہو انہیں اپنی جگہ سے نہیں ہٹنا چاہیے۔ ان کو ہر وقت اسلام کے عقبی محاذ پر نظر رکھنی چاہیے۔ آپ نے جو ہدایات اس دستہ کو دی ہیں ان میں کسی قسم کے اشتباہ کی گنجائش نہیں۔ "خواہ کچھ بھی ہو تمہیں بہرحال اپنی جگہ پر قائم رہنا ہے۔ اگر ہم کامیاب ہوں تب بھی تمہیں یہاں سے نہیں ہٹنا اور اگر شکست ہو جائے تب بھی نہیں۔ حتیٰ کہ ہماری امداد کے واسطے بھی نہیں۔ بس دشمن کی نقل و حرکت دیکھتے رہو۔ اگر وہ عقب سے ہم پر حملہ کرنے کے لیے بڑھے تو انہیں تیروں سے چھید کر رکھ دو۔"

سب سے پہلے ابوسفیان اپنی فوج کو ایک وسیع ہلال کی شکل میں آگے بڑھاتا اور خود اس کے مرکز میں رہتا ہے۔ اس کے پیچھے مکے کے بُت ہیں اور پھر قریش اور ان کے حلیفوں کی شاندار سپاہ۔ قلب ابوسفیان کے ماتحت ہے اور میمنہ و میسرہ کی کمان عکرمہ اور خالد کے سپرد ہے۔ جن میں سے ہر ایک کے ساتھ سو سو سوار بھی ہیں۔ سب سے پیچھے عورتیں ہیں جو گلے پھاڑ پھاڑ کر اپنے مردوں کو جنگ پر اکساتی اور فتح مندی کی صورت میں پیار و محبت کے وعدے کرتی ہیں۔ مسلمانوں کے قلب پر حمزہؓ اور ان کی مدد

پر علیؓ متعین ہیں۔

قریش کا پہلا بلہ ناکارہ ثابت ہوتا ہے اور اہل اسلام پر اس کا کچھ زیادہ اثر نہیں پڑتا۔ مسلمانوں کی صفیں کوہ اُحد کی طرح مضبوط رہتی ہیں۔ قریش اس طرح پیچھے ہٹتے ہیں۔ جیسے ربڑ کی گیند ٹھوس دیوار سے ٹکرا کر لوٹ جاتی ہے۔ حمزہؓ کی تلوار ہوا میں لہراتی اور کفار پر برسنے لگتی ہے۔ ان کے پیچھے علیؓ اور پھر مسلمانوں کی پیادہ فوج ہے۔ لڑائی کا شور و ہنگامہ الامان و الحفیظ۔ مبازروں کے سر پتھر کی طرح زمین پر لڑھک رہے ہیں اور خون سے زمین لالہ زار بنی ہوئی ہے۔

پرستاران اسلام ایسی بے جگری سے کبھی نہیں لڑے۔ بدر میں بھی انہوں نے ایسی جرأت و بہادری کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ ہر شخص ایک سورما بنا ہوا ہے۔ کوہ اُحد آج جن کارناموں کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ ان کو لکھنے کے لیے ایک ضخیم کتاب درکار ہے۔ قریش بھی اس طرح لڑ رہے ہیں جیسے زندگی سے ہاتھ دھو چکے ہوں۔ عبد الدار کی نسل سے سات آدمی علمبرداری کے فرائض انجام دینے کے لیے صفوں سے باہر نکل آئے ہیں۔ لیکن اب ساتوں کے ساتوں مسلمانوں کی تلواروں کے جھکولے کھا کر زمین پر پڑے خاک و خون میں لوٹ رہے ہیں۔

طلحہ تلوار ہلاتے ہوئے آتے اور حضرت علیؓ کو دعوت مبازرت دے کر کہتے ہیں "تم کہا کرتے ہو کہ ہم دوزخ میں جائیں گے اور ہم جنت میں۔ آؤ میں تمہیں جنت میں پہنچائے دیتا ہوں۔"

لیکن علیؓ یہ کہہ کر کہ "میں اس سے پہلے ہی تمہیں دوزخ پہنچا دوں گا۔" جھپٹ پڑتے ہیں۔ بڑا سخت مقابلہ ہوتا ہے بالآخر طلحہؓ زمین پر گر جاتے ہیں۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں "اب کہو طلحہ؟ کیا تم دوزخ میں جانے کے لیے تیار ہو۔"

طلحہ بڑی خوشامد سے جان بخشی کی درخواست کرتے ہیں۔ جو منظور ہو جاتی ہے اور علیؓ یہ کہتے ہوئے اس مقام کی طرف بڑھ جاتے ہیں۔ جہاں لڑائی کے شعلے بڑی

تیزی سے بھڑک رہے ہیں۔ ''جاؤ' چھوڑ دیا دراصل دوزخ کی آگ تم جیسے بہادروں کے واسطے نہیں ہے۔''

اہل مکہ کے قدم ڈگمگا جاتے اور وہ پیچھے ہٹنے لگتے ہیں۔ اور پھر جب مسلمانوں کی طرف سے زیادہ دباؤ پڑتا اور ابوسفیان کی فوج میں بھی تزلزل پیدا ہو جاتا ہے تو عجیب قسم کی ہلچل مچ جاتی ہے۔ ہر طرف سے اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ فتح عظیم پھر پیغمبر ﷺ اور صحابہ کی قسمت میں لکھی گئی ہے۔ بدر کی تاریخ دہرائی جا رہی ہے۔ مسلمانوں کے دل خوشی سے لبریز ہیں۔ سب لوگ یکدم دشمن پر ٹوٹ پڑتے ہیں تاکہ فتح یقینی شکل اختیار کر لے۔ قریش کے تعاقب میں وہ تیر انداز بھیؓ جن کو عقب کی حفاظت کے واسطے متعین کیا گیا تھا آگے بڑھ جاتے ہیں تاکہ مال غنیمت سے محروم نہ رہ جائیں۔

خالد جنگ کے نرغہ میں شریک نہیں رہے۔ ان کے سوار ہنگامی حالات میں امداد کے لیے مستعد کھڑے ہیں اور وہ خود میدان جنگ کے اتار چڑھاؤ کا بڑی غائر نظر سے مطالعہ کرتے رہے ہیں۔ دل تو ان کا بھی بہت چاہتا رہا کہ لڑائی میں شریک ہوں۔ لیکن صرف اس وجہ سے باز رہے کہ سواروں کے پہنچنے سے حالات میں ابتری پیدا ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اب وہ بڑی مایوسی سے دیکھ رہے ہیں کہ اہل مکہ کے قدم اکھڑ چکے ہیں اور وہ مسلمانوں کے حملہ کی تاب نہ لا کر راہ فرار اختیار کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان کی نظریں تیر اندازوں پر بھی پڑ رہی ہیں جو اپنی جگہ چھوڑ کر مال و دولت کے پیچھے دیوانہ وار دوڑے جا رہے ہیں۔

بعض اوقات جنگوں کا فیصلہ بالکل معمولی اقدامات پر ہو جایا کرتا ہے۔ خالد نے جیسے ہی دیکھا کہ اہل مدینہ اس کلیدی مقام کو غیر محفوظ چھوڑ کر چل دیئے ہیں تو وہ اپنے دستہ کو لے کر برق کی سرعت کے ساتھ آگے بڑھے اور درّہ پر قبضہ کر لیا اب وہ اسلامی لشکر کے عقب میں اور قسمت کا پانسہ پلٹ گیا ہے۔ کہاں تو مسلمان جارحانہ طور پر آگے بڑھ رہے تھے۔ کہاں انہیں مدافعانہ طور پر واپس لوٹنا پڑا۔ اب وہ بجائے تعاقب کرنے کے خود نرغے میں آ گئے ہیں۔ اب حضور ﷺ کی فوج پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ

پڑے ہیں۔ حضرت امیر حمزہؓ کئی اہل مکہ کو قتل کر کے خود بھی شہید ہو گئے ہیں۔ وہ بیک وقت کئی کفار سے جنگ کر رہے تھے کہ ایک حبشی غلام نے اپنا خنجر ان کی پشت میں پیوست کر دیا۔ اور وہ ہلاک ہو گئے۔ دن ڈھلنے کے ساتھ ساتھ شہداء کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ علیؓ بدستور کشتوں کے پشتے لگا رہے ہیں۔ حضورﷺ کی ہمت افزائی فوج کو سہارا دے رہی ہے۔ جہاں کہیں دشمن کا نرغہ ہوتا ہے آپ وہیں پہنچ جاتے اور ارشاد فرماتے ہیں ''مسلمانو! خدا ہمارے ساتھ ہے۔ فتح ہم کو ہی حاصل ہو گی۔'' اس آواز سے لوگوں کے دل گرما جاتے ہیں۔ اور وہ ازسرنو حملہ کرنے لگتے ہیں۔ لیکن اس طرح دشمن کی توجہ بھی آپ کی طرف منعطف ہو جاتی ہے۔ آپ کی آواز اور سرخ صافہ آپ کو دوسروں سے ممیز کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس لیے کفار نے اب آپ ہی کو اپنا نشانہ بنا لیا ہے۔ آپ کی طرف نیزے پھینکے جا رہے ہیں۔ تیروں کی بارش ہو رہی ہے۔ تلواریں چمک رہی ہیں۔ لیکن آپ اس سب کے باوجود محفوظ ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے آپ کی زندگی طلسمی ہو۔

لیکن تابہ کے؟ آپ کے علمبردار مصعبؓ گر پڑتے ہیں۔ اور چونکہ وہ آپ کے ہمشکل ہیں اس لیے یہ افواہ پھیل جاتی ہے کہ پیغمبرﷺ شہید ہو گئے۔ اس دوران میں حضورﷺ واقعی زخمی ہو کر منہ کے بل ایک کھڈ میں گر جاتے ہیں۔ آپﷺ کی شہادت کی خبر دوست دشمن سب میں پھیل جاتی ہے۔ جس سے کفار کو تقویت ہوتی ہے اور مسلمانوں کی ہمتیں جواب دے جاتی ہیں۔

ابھی تھوڑی دیر ہوئی اہل اسلام قریش کا پیچھا کر رہے تھے۔ لیکن اب حالات کا رُخ بالکل بدل گیا ہے اور خود ان کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ اب سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہیں کہ بھاگ کر مدینہ میں پناہ لیں۔ لیکن یکا یک لوگ حضورﷺ کی زرہ بکتر اور سرخ صافے سے آپ کو پہچان لیتے ہیں ہنوز زندہ ہیں۔ علیؓ' عمرؓ اور ابوبکرؓ آپ کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ ابوبکرؓ جھک کر آپ کا سر اپنے زانوں پر رکھ لیتے اور چہرے سے خون پونچھتے ہیں۔ عمرؓ لال پیلے ہو رہے ہیں۔ آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں اور پیشانی سے پسینہ

کے قطرے ٹپک رہے ہیں۔ قدرت نے انہیں طویل قامت بنا کر بے نظیر طاقت سے سرفراز فرمایا ہے۔ وہ اپنے بدن کے ہر عضو اور طاقت کے ہر شمہ کو دشمن کے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ علیؓ تھکنا جانتے ہی نہیں۔ اور برابر تلوار چلا رہے ہیں۔ ان کے بھائی جعفرؓ بھی بے پناہ شہامت کا ثبوت دے رہے ہیں۔ بالآخر یہ لوگ قدم بقدم ایک چٹان تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یہاں وہ حضور کو لٹا دیتے اور اہل مکہ کی فوج سے دوبارہ صف آرائی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

کچھ فاصلہ سے ابوسفیان آواز دیتا ہے "کیا محمد ﷺ تمہارے ساتھ ہیں؟" ادھر سے کوئی جواب نہیں دیتا۔ وہ پھر چیختا ہے "کیا ابوبکرؓ ہیں؟" اب بھی کوئی نہیں بولتا۔ اس پر ابوسفیان کہتا ہے۔ "جبل کی فتح، سب مارے گئے۔" حضرت عمرؓ سے ضبط نہیں ہوتا اور وہ فرماتے ہیں "رسول اللہ ﷺ بھی زندہ ہیں اور ابوبکرؓ بھی حیات ہیں یہ دونوں تمہارے واسطے مصیبت بن جائیں گے۔"

شام ہو جاتی ہے۔ لیکن جنگ کا فیصلہ نہیں ہوتا۔ مسلمانوں کی یہ جماعت اس محفوظ جگہ میں حملہ سے بے خوف ہے۔ میدان قریش کے ہاتھ میں ہے لیکن ان کی جمعیت بھی کچھ کم ہو گئی ہے اور ان میں مایوسی بڑھتی جا رہی ہے۔ کیونکہ محمد ﷺ اور آپ کے باوفا ساتھی سب زندہ ہیں۔ چار کے مقابلے میں ایک کی اکثریت کسی کام نہیں آ سکی۔ اور خالد کا حملہ بھی وہ نتائج پیدا نہیں کر سکا۔ جس کی انہیں توقع تھی۔ قریش کے پاس اہل مکہ کو دکھانے کے لیے حمزہؓ اور تقریباً سو مسلمانوں کی لاشیں ضرور ہیں۔ لیکن نہ ایک جنگی قیدی ہے۔ نہ دھیلے کا مال غنیمت۔ لاشوں سے جیسا چاہیں سلوک کر لیں۔ درندہ صفت ہندہ ان کے جسم سے غذا اور زیور حاصل کرتی ہے۔ وہ امیر حمزہؓ کا جگر کھاتی اور ان کے ناک کان کاٹ کر ہار بناتی اور گلے میں پہن لیتی ہے۔ اس کے ساتھی ان کے ہاتھ پاؤں کاٹتے اور لاش کو مثلہ کر کے خوش ہوتے ہیں۔ دوسروں کے بھی ناک کان بطور یادگار مکہ لے جانے کے لیے رکھ لیے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ انہیں اپنی اس نام نہاد فتح سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ نہ مدینہ میں داخل ہوتے ہیں نہ حکومت پر قبضہ

جاتے ہیں۔ نہ اسلام کے خدا کے مقابلے میں اپنے معبودان کعبہ کی فتح و کامرانی کا اعلان کرتے ہیں۔ جو مہتمم بالشان لشکر مکہ سے نہ معلوم کیا کیا اُمیدیں لے کر چلا تھا وہ اب ایک منتشر سی جماعت کی صورت میں واپس آتا ہے۔ ان کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔ اور سرخمیدہ ہو گئے ہیں۔ راستہ میں ابوسفیان اس مہم کا جائزہ لیتا ہے اور اس کے جو غیر متوقع نتائج مرتب ہوئے ہیں ان کے متعلق اپنے احباب سے مشورہ کرتا ہے۔ آخر یہ طے پایا ہے کہ واپس لوٹنا چاہیے اور مسلمانوں کو جو اس شکست سے کمزور اور پژمردہ خاطر ہو گئے ہیں۔ بالکل ہی ختم کر دینا چاہیے۔ پیغمبر ﷺ کو پہلے ہی سے اندیشہ ہے کہ یہ لوگ واپس آئیں گے۔ اور آپ طے کر لیتے ہیں کہ اس مرتبہ بھی بجائے مدینہ میں محصور ہونے کے کھل کر میدان میں مقابلہ کیا جائے گا۔ راستہ میں ابوسفیان کو ایک بدو ملتا ہے۔ جو حضور ﷺ کا ہوا خواہ ہے اور اسے بتاتا ہے کہ پیغمبر ﷺ بدلہ لینے پر تلے ہوئے ہیں۔ اور ایک جرار فوج لے کر مکہ پر چڑھائی کرنے کا ارادہ فرما رہے ہیں۔ اس پر ابوسفیان سخت متوحش ہوتا اور اپنی تھکی ہاری' برداشتہ خاطر فوج کو سمیٹ سماٹ کر فوراً مکہ کا رُخ کر دیتا ہے۔

حضرت حمزہؓ کی شہادت کا حضور ﷺ کے دل پر سخت صدمہ ہے۔ جب قریش رخصت ہو جاتے ہیں تو حضور ﷺ ان کی لاش کی تلاش کا حکم دیتے ہیں۔ آپؓ کے جسم کے ساتھ کفار نے بڑا وحشیانہ سلوک کیا ہے۔ ان کی میت کو بھی دوسرے شہداء کے ساتھ دفن کر دیا جاتا ہے۔ عرب میں سوگ منانے کے لیے سرمنڈوالینے' بین کرنے' کپڑے پھاڑنے' سینہ کوٹنے اور اسی قسم کے جو دوسرے مراسم رائج ہیں۔ حضورؐ نے ان سب سے لوگوں کو منع فرما دیا ہے۔ صرف آنسو بہانے کی اجازت ہے۔ کیونکہ وہ تو بالکل ایک فطری جذبہ ہے۔ حمزہؓ کے متعلق آپ کا فرمان ہے کہ ان کا نام لوح محفوظ پر ان الفاظ میں لکھ دیا گیا ہے۔ ''شیر خدا' شیر اسلام حمزہؓ۔'' آپ سیاہ قبا پہن کر ان کی نماز جنازہ پڑھتے ہیں۔ پھر تمام شہداء اور کفار کی لاشوں کو جہاں جہاں وہ ہلاک یا شہید ہوئے دفن کر دیا جاتا ہے۔ اور مختلف قسم کے پتھروں سے ان کی قبروں کو اس طرح ڈھانپ دیا جاتا ہے کہ ان سب بہادروں کی یادگار باقی رہے۔

اُحد کی شکست میں حضور کو اللہ کی طرف سے کوئی شکایت نہیں۔ بلکہ صحیح پوچھئے تو مسلمانوں کو فتح حاصل ہو چکی تھی۔ پانسہ تو اس وقت پلٹا جب تیر انداز اپنی جگہ چھوڑ گئے۔ اور خالد نے مع اپنے ساتھیوں کے اس پر قبضہ کر لیا۔ قرآن شریف کی ایک آیت میں بتایا بھی گیا ہے کہ "خدا نے تو اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا۔ ابتداء میں اس کے حکم سے تم ہی ان کو قتل کر رہے تھے۔ لیکن جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا اور جونہی اللہ نے تمہیں وہ چیز دکھائی جس کی محبت میں تم گرفتار تھے (یعنی مال غنیمت) اور تم اپنے سردار کی خلاف ورزی کر بیٹھے۔

لیکن جن لوگوں نے مال غنیمت کے لالچ میں اپنی جگہ چھوڑ دی تھی۔ ان کی ذات کا کوئی ذکر نہیں۔ بلکہ قرآن کا ارشاد ہے کہ "اللہ نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔ کیونکہ وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔" جو لوگ اس جنگ میں شہید ہوئے۔ ان کے واسطے اجر عظیم کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔ قرآن نے بات بھی واضح کر کے کہہ دی ہے کہ اگر پیغمبر ﷺ شہید بھی ہو جائیں تب بھی کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ تو صرف رسول ہیں۔ اسلام پھر بھی باقی رہے گا۔ اور فنا نہیں ہو گا۔ حق بہرحال حق ہے اور حق گو اگر مر بھی جائیں تب بھی جو لوگ صاحب ایمان ہیں وہ کسی حالت میں اسے ترک نہ کرینگے۔

اس زمانہ میں جو وحی نازل ہوئی اس کے الفاظ بہت پرشکوہ' ارفع اور تسلی بخش ہیں۔

ممکن نہیں کہ اللہ اہل ایمان کو ایسی حالت میں چھوڑ دے۔ جیسی اس وقت ہے کہ اگر تم لوگ برائیوں سے کنارہ کشی اختیار کر لو۔ اور خدا کے کلام پر یقین رکھو تو تم کو بڑا وسیع اجر ملے گا۔ "اے ایمان والو! صبر کرو اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرو۔ اپنے آپ کو جہاد کے لیے تیار رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ تمہیں کامیابی حاصل ہو۔"

پانچواں باب

"جنگجو"

مدینہ میں اُحد کی شکست کے سبب حضور ﷺ کے اقتدار میں نہ کوئی فرق آیا ہے۔ نہ خلل واقع ہوا ہے۔ مسلمانوں میں آپ کی وہی تعظیم و تکریم اور وہی جذبہ اطاعت کارفرما ہے۔ آپ اب بھی ان کے ویسے ہی قائد اور مقتدا ہیں۔ دین کا معاملہ ہو یا دنیا کا آپ کے الفاظ اور فیصلے قانونی حیثیت رکھتے ہیں۔ اب دو قسم کے نقطہ نظر واضح ہو گئے ہیں۔ ایک یہ کہ جہاں تک حضور ﷺ کا تعلق ہے۔ آپ نے قریش کے مقابلہ میں نہایت اعلیٰ درجہ کی کمان فرمائی اور اگر آپ کے چند ساتھیوں سے ایک بہت بڑی غلطی کا ارتکاب نہ ہو گیا ہوتا تو اُحد میں بھی یقیناً فتح ہوتی۔ اللہ کے متعلق بھی سوئے ظن نہیں ہے کہ اس نے اپنے کیے ہوئے وعدے پورے نہیں کیے۔

لیکن مدینہ سے باہر جنگ کے نتائج اس صورت میں ظاہر ہو رہے ہیں کہ قرب و جوار میں آباد قبائل کا رویہ بالکل تبدیل ہو گیا ہے۔ بدر میں آپ کو جو کامیابی ہوئی تھی اس کا جو خوشگوار اثر ان لوگوں پر پڑا تھا وہ زائل ہو گیا ہے۔ اور اب مدینہ کی حاکمیت زیادہ قابل وقعت نہیں رہی۔ یہودی' عیسائی اور عرب سب کو یقین ہے کہ قریش کے ہاتھوں مسلمانوں کا خاتمہ صرف وقت کا منتظر ہے۔ یہ بھی کوئی راز نہیں رہا کہ مسلمانوں کی فوج کے بہترین سپاہی اُحد کی خاک میں دفن ہو چکے ہیں اور اس نقصان کی تلافی میں کافی عرصہ لگے گا۔

حضور ﷺ کو خبریں پہنچ رہی ہیں کہ پڑوسی مدینہ کے علاقوں پر تاخت و تاراج

کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ آپ ان خطرات کو بخوبی محسوس فرماتے اور پوری طرح چوکس رہتے ہیں۔ لیکن حالات کے ماتحت مسلمانوں پر ان حملوں کے روکنے یا مخالفین کو قرار واقعی سزا دینے کی پوزیشن نہیں ہیں۔

مدینہ میں اس بیان سے جو عمرو بن امیہ نے بنو عامر اور بنو سلیم کے ہاتھوں رہائی پا کر ان کے متعلق دیا ہے، سخت ہلچل مچ گئی ہے۔ زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ ان قبائل کا سردار ابوبرہ کلابی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا تاکہ خود بھی اسلام قبول کرے اور ساتھ ہی حضور ﷺ سے یہ بھی درخواست کرے کہ ایک تبلیغی جماعت اس کے ہمراہ بھیج دی جائے تاکہ وہ لوگ اس کے قبیلہ میں جا کر تبلیغ اسلام کریں۔ حضور ﷺ کو اس بدباطنی پر مطلق شبہ نہ ہوا اور آپ نے ستر صحابہ کو منتخب کر کے جن میں عمرو بن اُمیہ بھی شامل تھے، اس کے ساتھ کر دیا۔ جب یہ لوگ بیئر معونہ پر پہنچے اور ایک ندی کو پار کرنے لگے تو یکایک انہیں ایک بڑی مسلح جماعت نے نرغہ میں لے لیا اور ابوبرہ نے حکم دیا کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے۔ عمرو کے تمام نہتے ساتھی شہید کر دیئے گئے۔ اور خود انہوں نے بھی اس طرح ان سفاکوں سے نجات حاصل کی کہ موت کا بہانہ کر کے زمین پر ساکت و صامت پڑے رہے۔ کچھ اسی قسم کا واقعہ ان چھ مبلغین کے ساتھ بھی پیش آیا۔ جن کو قبیلہ قارة کی درخواست پر بھیجا گیا تھا۔ ان میں سے چار کو تو ان کے میزبانوں نے ہلاک کر دیا اور باقی دو قریش کے ہاتھ فروخت کر دیئے گئے۔ ان میں سے خبیبؓ کو حارث کے اعزاء نے خرید لیا۔ جسے معرکہ بدر میں انہوں نے تلوار سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔ اب ان کی خوشی کا کوئی اندازہ نہ تھا کہ انہیں اپنے مقبول عزیز کا انتقام لینے کے لیے وہی شخص ہاتھ آ گیا جو اس کا اصل قاتل تھا۔ اس کے لیے ایک تقریب منعقد کی گئی۔ تمام اہل خاندان کو مدعو کیا گیا اور انہیں مقتل تک پہنچا دیا گیا۔ موت سے قبل انہوں نے دشمنوں سے صرف ایک ہی درخواست کی کہ انہیں دو رکعت نماز ادا کرنے کی اجازت دی جائے۔ اس کے بعد حارث کی ایک لڑکی برہنہ تلوار لیے ہوئے آگے بڑھی اور ان کا سر تن سے جدا کر دیا۔

دوسرے صحابی زید کا بھی اسی مقصد کے واسطے ایک اور خاندان نے سودا کر لیا۔ لیکن ان کی شہادت زیادہ متہم بالشان طریقہ پر منائی گئی اور اس کا نظارہ کرنے کے لیے قریش کے امراء اور سرداروں کو بھی مدعو کیا گیا۔ جن میں ابوسفیان بھی شامل تھا۔

ان تمام سفاکیوں کی داستانوں نے حضور علیہ السلام کو بے انتہا مغموم کر دیا ہے۔ لیکن انتقام لینے کا وقت ابھی تک نہیں آیا ہے۔

اسی زمانہ میں یہودیوں کا ایک مقتدر قبیلہ بنونضیر اپنے دو آدمیوں کا خون بہا طلب کرنے لگا۔ جن کو عمرو بن امیہ نے مدینہ لوٹتے وقت غلطی سے قتل کر دیا تھا۔ قانوناً یہ خون بہا واجب ہے۔ اس لیے مطلوبہ رقم فوراً ہی ادا کر دی۔

اس سلسلہ میں بنونضیر آپ علیہ السلام کی اور حضرت ابوبکرؓ کی دعوت کرتے ہیں۔ لیکن اتفاقی طور پر بالا خانہ کے اوپر اینٹوں اور پتھروں کا ایک ڈھیر بھی موجود ہے اور جب تمام مہمان اکٹھے ہو جاتے ہیں تو حضور علیہ السلام کو چھت کے اوپر کچھ مشتبہ قسم کے لوگوں کی چت پھرت نظر آتی ہے۔ آپ کو اس میں دغابازی کی بُو آتی ہے۔ چنانچہ آپ علیہ السلام مع حضرت ابوبکرؓ کے مدینہ واپس لوٹ جاتے ہیں۔ بنونضیر کو اپنے مقصد میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے اور آپ کو اپنے دام سے اس طرح بچ کر نکل جاتے دیکھ کر انہیں اندیشہ ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام واپس تشریف لائیں گے اس لیے فوراً قلعہ بند ہو جاتے ہیں۔

پیغمبر علیہ السلام کے صحابہ اس اہانت پر سخت برہم ہیں۔ حضرت عمرؓ ان سے انتقام لینے کی قسم کھا لیتے ہیں۔ جلد ہی فوج اکٹھی کر لی جاتی ہے اور آنحضرت علیہ السلام بنونضیر پر چڑھائی کر دیتے ہیں۔ مسلمان قلعہ کا محاصرہ کر لیتے اور گردو نواح میں تباہی مچا دیتے ہیں۔ ان کی کھیتیاں برباد کر دی جاتی ہیں اور کھجوروں کے درخت کاٹ ڈالے جاتے ہیں۔

ایک یہودی نے اپنے پناہ دہندہ کو چند نقرئی سکوں کے عوض بیچ دیا تھا۔ آج بھی یہود کی زندگی میں اس کا ہر فعل روپیہ کے ترازو میں تولا جاتا ہے۔ جو لوگ روپیہ کو عزیز رکھتے ہیں۔ وہ اپنی جان کے بھی اسی طرح شیدائی ہوتے ہیں۔ پیغمبر اسلام علیہ السلام

نے صرف چند درختوں کو کٹوا دیا ہے۔ وہ اتنے ہی ہاتھ یا سر بھی کٹوا سکتے ہیں۔ لیکن سر یقیناً درختوں سے زیادہ قیمتی ہیں۔ یہودیوں میں سخت کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ آخر چھ روز محصور رہنے کے بعد ان کی طرف سے صلح کی درخواست پیش کر دی جاتی ہے۔ علیؓ اور عمرؓ کو شرائط طے کرنے کے واسطے بھیجا جاتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ سرکش یہود کی کان ناک کاٹ کر مدینہ کی گلیوں میں ان کا جلوس اور مظاہرہ کیا جائے گا۔ لیکن حضور ﷺ تو مجسم رحم و کرم ہیں اور کسی قسم کی خون آشامی یا زیادتی نہیں چاہتے۔ اس لیے آپ نے ان سے صرف زر فدیہ طلب کیا ہے۔ اور اب مسلمان مال و اسباب سے لدے لدائے مدینہ واپس آ رہے ہیں۔

حضور ﷺ چاروں طرف سے غداروں کے نرغہ میں ہیں۔ دشمن آپ کی جان کے خواہاں ہیں۔ انہوں نے آپ کے بہت سے صحابہ کو بڑی سفاکی سے قتل کیا ہے اور روزانہ اسلامی سلطنت کے خلاف سازشیں کرتے رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر آپ کے صابر اور شیریں لبوں سے تنفر یا تلخی کے کچھ کلمات نکل جاتے یا دل میں انتقام کا خیال آ جاتا ہے تو یہ انسانی فطرت سے بعید نہیں۔ نہ اس پر تعجب ہونا چاہیے۔ اُحد کی جنگ نے آپ کے اقتدار کو یقیناً کم کر دیا ہے۔ مدینہ ابھی اس قابل نہیں ہوا کہ بنو عامر کی بدذاتی کا بدلہ لے سکے۔ یا قارۃ میں جو چھ مبلغوں کی جانیں تلف ہوئیں ان کے انتقام پر غور کیا جائے۔ اگر ان حالات میں حضور ﷺ ان لوگوں کے خلاف کچھ نہ کہیں تو یہ بات بشریت کے منافی سمجھی جائے گی۔ اس لیے آپ کبھی کبھی اپنے خدا سے ان کی شکایت کر کے دعا فرماتے ہیں کہ ان پر انتہائی غضب نازل ہو۔ ''جس طرح انہوں نے تیرے عبادت گزار بندوں کو ہلاک کیا ہے تو بھی ان کو ہلاک کر دے۔ انہیں اپنی کرنی کا پھل مل جائے۔ جس طرح وہ تیرے پیغمبر ﷺ کی جان کے درپے ہیں۔ اسی طرح تُو ان کے درپے ہو جا۔''

لیکن اللہ اپنے معاملات میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں کرتا۔ خواہ وہ اس کے پیغمبر ﷺ ہی کیوں نہ ہوں۔ اس لیے انہیں فوراً ہی یہ سخت جواب ملتا ہے۔ ''یقیناً وہ

لوگ نافرمان ہیں۔ لیکن آپ کو اس سے کوئی واسطہ نہیں کہ خدا انہیں سزا دیتا ہے یا معاف کر دیتا ہے۔" نابینا شخص کے معاملہ میں جس طرح خدا تعالی نے آپ ﷺ سے خطاب کیا تھا۔ اسی طرح یہ جواب بھی قرآن شریف کے صفحات میں تا قیامت ثبت رہے گا۔ ان امور سے آپ کی بشریت اور اس کے ماتحت جھنجلاہٹ اور تنفر کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس سے آپ کی دیانتداری' سچائی اور حق پرستی کا بھی واضح ثبوت ملتا ہے۔

﴿2﴾

بنو نضیر کے خلاف مہم ایک اور حیثیت سے بھی بڑی اہم ہے۔ ابھی تک مال غنیمت اس طرح تقسیم ہوتا تھا کہ چار حصے افواج کے اور ایک حصہ سلطنت کا جس کو حضورؐ اپنی صوابدید پر خرچ فرمائیں۔" لیکن مہاجرین یعنی ان لوگوں کی جو آپ کی وجہ سے گھر بار چھوڑ کر مدینہ آ گئے ہیں۔ مالی حالت اب تک ناگفتہ بہ ہے اور اس کی اصلاح کی صرف دو صورتیں ممکن ہیں۔ یا تو یہ کہ انصار کے قبضہ میں جتنی جائیداد ہے اس کا ایک معتد بہ حصہ ان میں تقسیم کر دیا جائے۔ یا پھر جنگ میں جو کچھ مال ملا ہے وہ ان کو دے دیا جائے۔ اس معاملہ میں بھی انصار کی طرف سے بڑی فراخدلی کا ثبوت ملتا ہے۔ اور وہ حضور ﷺ سے خود ہی عرض کرتے ہیں کہ کل مال غنیمت کو جس طرح مناسب سمجھیں مہاجرین میں تقسیم کر دیں۔ اس سلسلہ میں قرآن حکیم کی ایک سورۃ بھی نازل ہو چکی ہے۔ جس سے اس کا جواز ملتا ہے۔ اور مہاجروں کو بنو نضیر سے حاصل کردہ تمام سامان مل جاتا ہے۔ انصار کو ان میں سے بعض کی زبوں حالی کا بخوبی اندازہ ہے۔ اور وہ نہایت وسیع القلبی سے اس معدلت کی تعریف کرتے ہیں۔

لیکن کیا یہ انصار کا محض جذبہ ایثار ہے جس کی وجہ سے انہوں نے اپنے حصہ سے دست کشی اختیار کر کے بنو نضیر کے یہودی قبیلہ سے حاصل کردہ تمام مال و دولت مہاجروں کے لیے وقف کر دیا ہے؟ کیا اس میں خود حضور ﷺ کی شخصیت کے مقناطیسی اثرات شامل نہیں ہیں جو انسان کو انسانی سطح سے بالاتر ہو کر قائل کرنے پر آمادہ کرتی

رہتی ہے۔ محمد ﷺ اب اس ساعت سے بہت بلند ہو گئے ہیں۔ جب آپ اپنے خیالات میں گم مکہ کی وادیوں میں گھوما کرتے اور اپنے خوابوں اور اُمیدوں میں مگن تھے۔ ایک عرصہ گزر گیا ہے کہ آپ عرفات کی پہاڑی پر بیٹھے اس وادی پر نظر ڈال رہے تھے۔ جس میں مکہ واقع ہے اور غور فرما رہے تھے کہ حضرت ابراہیمؑ کے تعمیر کردہ خانہ خدا کی لوگوں نے کیسی بے حرمتی کی ہے۔ اس کو بھی ایک زمانہ ہو چکا ہے کہ آپ کی طبیعت میں بے اختیار اس قسم کے خیالات پیدا ہوئے کہ عرب سے پھوٹ' نااتفاقی اور باہمی منافرت کا دور ختم ہو جائے اور اس کی جگہ امن و امان کا ڈنکا بجنے لگے۔ کعبہ دوبارہ خدائے واحد کی عبادت گاہ بن جائے۔ لوگوں کو اجازت ہو کہ بلا روک ٹوک اپنی مرضی کے مطابق عبادت کر سکیں۔ اہل دانش کائنات کے مالک حقیقی کی درگاہ میں سربسجود ہوں جو روح الارواح ہے۔ عورتوں کی اسی طرح عزت کی جائے جیسے بہادر فرزندوں کی عورتیں قابل عزت سمجھی جاتی ہیں۔ تمام عرب اسلام کے جھنڈے تلے مجتمع ہو اور مسلمان دنیا کے گوشہ گوشہ میں اسلام کا پیغام پہنچا دیں۔ لیکن ان تصورات پر بھی ایک زمانہ بیت چکا ہے۔ وقت نے ان میں سے کچھ آرزوئیں پوری کر دی ہیں۔ لیکن ہنوز بہت کچھ ہونا باقی ہے۔ اتنی بات ضرور کہی جا سکتی ہے یہ خواب بڑے خوش آیند تھے اور اگر من وعن پورے ہو جاتے تو کیا ہی اچھا ہوتا۔ پھر بھی یہ بات کچھ کم قابل طمانیت نہیں کہ آپ کی مساعی جمیلہ کے باعث ان کا کچھ حصہ حقیقت میں تبدیل ہو گیا ہے۔

بدر کے بعد آپ کی تجاویز کا تکملہ چند سال کے اندر ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن اُحد کے بعد ایسا لگنے لگا ہے کہ افق کچھ پیچھے ہٹ گیا ہے۔ غداری سانپ کی طرح بل کھاتی کبھی اِدھر کبھی اُدھر رینگتی پھر رہی ہے۔ اور ایسے وقت اور مقام پر ظاہر ہو کر حملہ کرتی ہے کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ اس طرف بھی کوئی خطرہ ہو سکتا ہے۔ اس وقت آپ کے دشمنوں کی تعداد بے شمار ہے۔ مدینہ کے اندر بھی اور باہر بھی' عرب' یہودی اور عیسائی سب ہی مخالفت پر آمادہ ہیں۔

عربوں کی مخالفت تو سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ آنحضرت ﷺ نے باثر

اور اہل الرائے طبقہ کے ایک بڑے حصہ کو توڑ کر اپنا موافق بنا لیا ہے۔ آپ نے قریش کی سیادت میں رخنہ انگیزی کر کے مدینہ میں ایک خود مختار سلطنت کی داغ بیل ڈال دی ہے۔ آپ نے قانون وراثت اور شادی بیاہ کی رسوم میں دُور رس تبدیلیاں کر دی ہیں۔ قدیم زمانے سے چلی آنے والی روایات کو طاق نسیاں کے سپرد کر دیا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی رسم عبادت اور قوم کے دیوتاؤں کو بھی باطل قرار دے رہے ہیں۔ ان حالات میں اگر اہل عرب اس کوشش میں متحد ہو جاتے ہیں کہ آپ کو سب کا مشترکہ دشمن سمجھ کر (خواہ وہ غلطی پر ہی کیوں نہ ہوں) راستے سے ہٹا دیا جائے۔ تو انسانی نقطہ نظر سے ان کا یہ فعل قابل معافی ہے۔

لیکن ایک یہودی کی مخالفت کا سبب اس آسانی سے سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ کیونکہ اسے تو حضور علیہ السلام کی طرف سے ضمیر کی مکمل آزادی عطا کر دی گئی ہے۔ مگر کیا دوستی اور دشمنی ہمیشہ عقل وخرد کے ماتحت کام کرتی ہیں؟ آقا اس کے ساتھ بدسلوکی کرتا ہے۔ لیکن کتا وفاداری کے ساتھ اس کے پیارے ہاتھوں کو چاٹتا رہتا ہے۔ برخلاف اس کے سانپ اپنے نجات دہندہ کو ڈس لیتا ہے۔ انسان بھی اکثر ان لوگوں سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ جو اسے اپنا دوست بنانا چاہتے ہیں اور محسن کشی تو اس کا عام شیوہ ہے۔

اسی طرح مدینہ کے یہود نے ان تمام مراعات کو' جو یہاں کے نئے فرمانروا نے عنایت فرمائی ہیں' قطعاً فراموش کر دیا ہے۔ اب وہ دشمنان اسلام کی ان تمام سازشوں میں شریک ہیں جو وہ سب اور بالخصوص قریش وقتاً فوقتاً کرتے رہتے ہیں۔ بعض واقعات نے جلتی پر تیل کا کام کیا ہے۔ مثلاً کعب شاعر کا قتل یا اسی کی طرح ان کی ایک اور مقتدر ہستی ابورفیع سلام کا تہ تیغ کیا جانا۔ بنونضیر کی جلاوطنی کے بعد ان کی کھلم کھلا مخالفت تو ختم ہو چکی ہے۔ لیکن وہ اپنی پوشیدہ ریشہ دوانیوں اور سازشوں سے باز نہیں آئے۔ اور مستقل طور سے عداوت پر کمر بستہ ہیں۔ اب ان کی انتہائی کوشش یہ ہے کہ خود مسلمانوں میں پھوٹ ڈالیں اور منافرت کے بیج بوئیں۔ خود مدینہ کے اندر وہ حضور علیہ السلام اور آپ کے مخصوص صحابہ کو بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔ قرآن کو غلط

پڑھتے اور اس کی غلط تاویلیں کرتے ہیں۔ چونکہ لوگ ان کی تعلیمی' ذہنی اور اقتصادی برتری سے مرعوب ہیں۔ اس لیے وہ ان کی باتوں کو بڑے غور سے سنتے ہیں۔ اور ان کے بوئے ہوئے ریس کے بیج دُور دور تک پھیل جاتے ہیں۔ چنانچہ مدینہ سازشوں' مخالفتوں اور بغاوتوں کا آماجگاہ بن گیا ہے۔

انہیں حالات کے ماتحت بنو قینقاع کے فتنہ نے سب سے پہلے سر اٹھایا ہے جو مدینہ کے قرب و جوار ہی میں آباد ہے۔ ان کی مخالفت سے شہر کو ایک ایسا خطرہ لاحق ہو گیا ہے کہ حضور ﷺ کو بالآخر حکم دینا پڑا ہے کہ یا تو اپنے علاقے خالی کر دیں یا اسلام لا کر حکومت کے شریک بن جائیں۔ اس کا جو جواب انہوں نے دیا وہ نہایت گستاخانہ اور تمردانہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں "محمد ﷺ! قریش کے اوپر جو فتح آپ نے حاصل کی ہے اس پر آپ اتنا غرور نہ کریں۔ یہ محاربہ ان لوگوں کے ساتھ پیش آیا جو فن جنگ سے ناواقف ہیں۔ آپ اگر ہم سے نبرد آزمائی پر تیار ہوں تو ہم دکھا دیں کہ فتح اتنی آسانی سے حاصل نہیں ہوا کرتی۔"

اس جواب کے ساتھ ہی وہ قلعہ بند ہو جاتے ہیں۔ اور حضور ﷺ سے کہلا بھیجا ہے کہ اگر ہمت ہے تو آئیں اور ہمیں باہر نکال کر اپنی برتری ثابت کریں۔ اس گستاخانہ طرز عمل کا صرف ایک ہی جواب ممکن ہے کہ آپ مدینہ سے فوج لے کر نکلیں اور انہیں محصور کر لیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ جنگ زیادہ طولانی ثابت نہیں ہوتی۔ ہفتہ کے اندر ہی وہ قلعہ خالی کر دیتے اور مدینہ کی حدود سے باہر نکل جاتے ہیں۔ محمد ﷺ بھی ان کے ساتھ وہی سلوک کر سکتے ہیں جو حضرت داؤدؑ نے عمانیہ کے ساتھ کیا تھا کہ انہیں اینٹوں کے بھٹہ میں پھنکوانے کا حکم دے دیا۔ لیکن آپ کا جذبہ ترحم اس وقت بھی قومی مصلحت پر غالب آیا اور ان کو صرف اتنی ہی سزا دی گئی کہ قلعہ سے نکل جائیں اور اس میں بھی بڑی تیزی اور پھرتی سے کام لیں۔ تاکہ مبادا آپ کو اپنی رائے تبدیل نہ کر دینی پڑے۔

﴿3﴾

آئندہ بارہ سے اٹھارہ مہینوں تک جو مختلف جھڑپیں ہوئیں۔ ان سب کا ذکر

طوالت سے خالی نہ ہوگا۔ چوتھے اور پانچویں سال میں بھی حضورﷺ قریش اور یہود کی باہمی سازشوں کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ بنو نضیر' بنو قینقاع اور وہ تمام شاعر جنہیں مدینہ میں اپنی قادر الکلامی کا موقع نہ ملتا تھا اب ایک جگہ سے دوسرے جگہ ہو جاتے ہیں۔ کبھی خیبر اور کبھی دوسری یہودی بستیوں اور قلعوں میں پہنچ کر مخالفت کے گیت الاپتے ہیں۔ ہر مقام پر وہ لوگوں کو اس زبردست خطرے سے آگاہ کر کے جو عرب قوم کو پیش آنے والا ہے اس بات پر زور دیتے ہیں کہ محمدﷺ کی مدافعت میں سب کو یک جان و متفق ہو جانا چاہیے۔ اپنے جذبہ انتقامی سے سرشار ہو کر وہ پیغمبر اسلام کو ایسا ظالم اور سفاک بنا کر پیش کرتے ہیں۔ جس نے ہوس جاہ و حشم کی پردہ پوشی کے واسطے چہرہ پر مذہب کی نقاب ڈال رکھی ہے۔ وہ حضورﷺ کو بے رحم' سنگدل' جابر اور اسی قسم کے سینکڑوں نام دے کر کہتے ہیں کہ جو قوم آج تک برابر آزاد رہی ہے اور آج بھی اپنی آزادی برقرار رکھنے کے واسطے جدوجہد کر رہی ہے وہ اسے غلام بنانا اور زنجیروں میں جکڑنا چاہتے ہیں۔ صرف یہی نہیں عملی طور پر بھی ایسی چالیں چلی جا رہی ہیں اور ایسے کھیل دکھائے جاتے ہیں کہ اسلام کو کامیابی ہو گئی ہے۔ محمدﷺ کعبہ میں تلوار لیے کھڑے ہیں۔ جس سے عربوں کا خون قطرہ قطرہ ٹپک رہا ہے۔ ان کے بت سرنگوں پڑے ہوئے ہیں۔ اور قربان گاہوں کے ملبے ان کے اوپر ڈھیر ہو رہے ہیں۔

خطرہ واقعی سر پر موجود ہے۔ اس لیے اہل مکہ کی تیاریاں بھی دوچند ہو گئی ہیں۔ یہودیوں کی امداد ہی اُن کے واسطے مفید ہو گی۔ ادھر خود یہود بھی اس پر مسرور ہیں کیونکہ اس اتحاد ہی سے ان کو یہ اُمید بندھ سکتی ہے کہ وہ محمدﷺ اور اسلام کے قابل معنرت نام کو صفحہ ہستی سے مٹانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس اتحاد میں دوسرے قبائل بھی شریک ہو جاتے ہیں اور اس طرح باہمی مفاد یعنی مدینہ پر حملہ کرنے کی غرض سے ایک بڑی فوج اکٹھی ہو جاتی ہے۔

اس دور میں قرآن مجید کی جو سورتیں نازل ہوتی ہیں۔ ان میں دشمنان اسلام کی کارستانیوں کو بیان کر کے حکم دیا گیا ہے کہ وہ باہمی اتفاق و اتحاد کو قائم رکھیں" اے

ایمان والو! سختی سے قائم رہو۔ آپس میں متفق رہو۔ تم ساری اُمتوں میں بہترین اُمت ہو اور وہ یہود تمہارا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے۔" اللہ نے جو فرائض تم پر عائد کیے ہیں۔ ان کو پابندی سے ادا کرتے رہو اور اسی معاہدہ پر جو اس کے ساتھ کیا ہے۔

مسلمانوں کو نصیحت کی گئی ہے کہ دوسرے مذاہب کے لوگوں کو دوست نہ بنائیں کیونکہ "تم ایسے ہو کہ ان سے محبت رکھتے ہو۔ مگر وہ تم سے محبت نہیں رکھتے۔ جب تم ان سے ملتے ہو تو وہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لا چکے ہیں۔ اور جب تنہا ہوتے ہیں تو مارے غصے کے تمہارے خلاف اپنی انگلیاں دانتوں سے کاٹتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ اپنے جوش غضب میں خود ہی ہلاک ہو جاؤ۔ بے شک اللہ سینے کے رازوں سے خوف واقف ہے۔"

یہودیوں نے جو رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ اس پر قرآن کسی تعجب کا اظہار نہیں کرتا۔ ان کی نفسیاتی تاریخ میں یہ کوئی نیا واقعہ نہیں ہے۔" اگر وہ آپ کو جھٹلاتے ہیں تو آپ سے پہلے بھی رسولوں کی تکذیب کی جا چکی ہے۔ حالانکہ وہ کھلی نشانیاں' صحیفے اور روشن کتابیں لے کر آئے تھے۔ ان لوگوں سے جن کو آپ سے پہلے کتاب دی گئی تھی' نیز مشرکوں سے بھی آپ تکلیف دہ باتیں سنیں گے۔ لیکن اگر صبر سے کام لیں گے اور پرہیز گاری پر قائم رہیں گے تو یہ عزم و ہمت کے امور ہوں گے۔" مسلمانوں کی کامیابی شک و شبہ سے یقیناً بالاتر ہے۔ لیکن اہل اسلام کو استقلال کے ساتھ حضورؐ کا وفادار رہنا اور کامیابی کی راہ میں جو دشواریاں بھی پیش آئیں۔ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنا لازمی ہے۔"

"اے ایمان والو! صبر پر قائم رہو۔ اور دوسروں کو بھی صبر کی تلقین کرو' مستقل مزاجی سے کام لو اور اللہ کے مقرر کیے ہوئے فرائض کی انجام دہی کرتے رہو' تاکہ تمہیں کامیابی حاصل ہو۔" اہل اسلام کے لیے اس دنیا اور عاقبت دونوں میں اجر عظیم کا وعدہ کیا گیا ہے۔ جو کوئی خدا کی راہ میں جنگ کرے۔ خواہ وہ شہید ہو یا غازی اللہ اس کو اجر عظیم عطا فرمائے گا۔"

اسلام کی تاریخ میں پہلی مرتبہ مسلمانوں کو قتال یعنی جنگ کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ قرآن کہتا ہے۔ "طاغوت (باطل) کے دوستوں سے جنگ کرو۔ ان سے فی سبیل اللہ جہاد کرو۔ جو کوئی نیک عمل میں شرکت کرے گا۔ اسے اس کا اجر دیا جائے گا اور جو شخص باطل کا ساتھ دے گا۔ اس کی اسے سزا ملے گی۔" موت کا خوف بے کار ہے ان سے کہہ دیجئے کہ اگر تم اپنے گرد برج بھی تعمیر کر لو۔ تب بھی جو موت تمہاری قسمت میں لکھ دی گئی ہے وہ آ کر رہے گی۔"

مسلمانوں کو آگاہ کیا گیا ہے کہ "اگر خدا کی عنایت و مہربانی تمہارے شامل حال نہ ہوتی تو کفار کی ایک جماعت یقیناً اہل اسلام کو تباہ و برباد کر دینے میں کامیاب ہو جاتی۔ لیکن خدا چونکہ مسلمانوں کا پشت پناہ ہے۔ اس لیے خود کفار ہی دوزخ کا کندہ بنیں گے۔" "اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ کو اپنا رفیق نہ بناؤ۔ یہ خود آپس میں بھی ایک دوسرے کے دوست نہیں ہیں اور جو کوئی انہیں اپنا رفیق بنائے گا۔ اس کا شمار انہیں میں ہو گا۔"

﴿4﴾

اسی زمانہ میں مدینہ کے معاشرتی قوانین میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ جن کا تعلق قتل، جسمانی ضرر یا ایذا رسانی اور غلامی سے ہے۔ قرآن کا حکم ہے کہ "اور کسی ایسی شخص کی جان نہ لو جس کو خدا نے حرام قرار دیا ہے۔ مگر حق کے ساتھ اور جو کوئی غلطی سے قتل ہو جائے تو ہم نے اس کے ورثاء کو انتقام کا حق دیا ہے۔" یا "کسی مومن کا یہ کام نہیں کہ وہ دوسرے مومن کو قتل کرے۔ بجز اس صورت کے کہ وہ غلطی سے قتل ہو جائے" یا "اے اہل ایمان تمہارے لیے قتل کے مقدمہ میں قصاص لکھ دیا گیا ہے۔ آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت۔"

قرآن میں قتل عمد یا بالارادہ قتل کی سزا موت ہے۔ آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت، لیکن ان الفاظ کو ان کے ظاہری معنوں میں لینا غلط ہو گا۔ کیونکہ کوئی شخص اگر عورت کو قتل کر دے تب بھی اسے وہی انتہائی سزا

دی جائے گی۔ جو اسلامی شریعت میں ہے اہل روما' یہودیوں اور مصریوں کے قانون سے بالکل مختلف ہے۔ قاتل کی جان مقتول کے رشتہ داروں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے جن کو یہ اختیار ہے کہ اگر چاہیں تو جان کا عوض خون بہا کی شکل میں وصول کر لیں لیکن جب ایک دفعہ روپیہ وصول ہو گیا تو پھر اس کو قتل کرنا ممنوع ہے۔ البتہ اگر کسی کافر کو جنگ میں قتل کیا گیا ہے تو اس کی کوئی سزا نہیں۔

قتل عمد کے متعلق کئی صورتیں بیان کی گئی ہیں۔ اکثر میں خون بہا جائز قرار دیا گیا ہے اور یہ موسوی یا حمورابی قوانین کے مقابلہ میں ایک بہتر صورت ہے۔ انتقامی قوانین صرف جان پر ہی موقوف نہیں بلکہ اس سے کم درجہ کے جسمانی نقصان پر بھی حاوی ہیں۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ اگر تم کسی سے بدلہ لو تو صرف اتنا جتنا کہ خود تمہیں ضرر پہنچا ہے۔ لیکن اگر صبر سے کام لو تو یہ زیادہ بہتر ہے۔" ہم نے تورات میں لکھ دیا ہے کہ جان کے بدلے جان' آنکھ کے بدلے آنکھ' ناک کے بدلے ناک' کان کے بدلے کان' دانت کے بدلے دانت اور زخموں کے لیے برابر کا بدلہ۔"

ارسطو نے کہا ہے کہ غلامی ایک قدرتی امر ہے اور بعض اقوام بنائی ہی اس لیے گئی ہیں کہ غلام رہیں۔ اس نظریے کے پس پشت کوئی دلیل بھی کیوں نہ ہو۔ لیکن حضور ﷺ کا خیال ہے کہ یہ ایک معاشی بے انصافی ہے۔ جس میں اصلاح کی فوری ضرورت ہے۔ رومی قوانین میں اس کو قدرتی امر اور جائز طریقہ قرار دیا گیا ہے۔ یہودیوں میں صدیوں سے غلامی ان کے معاشرتی نظام کا ایک جزو لانیفک بنی ہوئی ہے۔ یسوع مسیح قانون موسوی کو مستحکم کرنے کے واسطے تشریف لائے تھے۔ اور گو ان کا دل اکثر ان غمزدوں کی تکالیف پر پگھلتا رہا۔ تاہم اس صورتحال کی اصلاح کے واسطے انہوں نے کوئی تدابیر اختیار نہیں کیں۔ بلکہ اس کے برخلاف عیسائیت نے اس کو جائز تسلیم کر لیا اور کلیسا خود غلاموں کی تجارت میں ملوث ہو گیا۔ پھر جسٹین کے مرتب کردہ اصولوں میں غلامی کو قانون قدرت کی حیثیت سے شامل کر لیا گیا۔

لیکن محمد ﷺ کی نظروں میں غلامی کے اندر کوئی خوبی نہیں ہے۔ ایک مرتبہ کوئی

شخص آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھنے لگا کہ مجھے کوئی ایسا طریقہ بتائے جو مجھ کو دوزخ سے دور اور جنت کے قریب لے آئے۔ آپ ﷺ نے جواب دیا کسی غلام کو آزاد کراؤ یا کسی قیدی کی گردن چھڑاؤ۔ لیکن خدا کے نزدیک غلام کو آزاد کرانا سب سے پسندیدہ عمل ہے۔

ایک روایت ہے کہ حضرت ابو مسعودؓ اپنے کسی غلام کو زدوکوب کر رہے تھے۔ عین اسی وقت حضور ﷺ وہاں پہنچ گئے۔ اور فرمانے لگے۔ ''ابو مسعودؓ! تمہیں اپنے اس غلام پر جتنا قابو حاصل ہے۔ خدا تعالیٰ کو تم پر اس سے زیادہ قدرت حاصل ہے۔''

ابو مسعودؓ نے مڑ کر جو دیکھا کہ حضور ﷺ بنفس نفیس ان سے مخاطب ہیں تو سخت شرمندہ اور پریشان ہوئے اور کہنے لگے۔ ''میں خدا اور رسول کے نام پر اس غلام کو آزاد کرتا ہوں۔'' اس پر آپ ﷺ نے فرمایا ''ہاں' دوزخ کی آگ میں جھلنے سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔''

غلاموں کے متعلق نئے توانین کی رُو سے حکم ہے کہ ان کے ساتھ ایسا ہی منصفانہ اور انسانی سلوک کیا جائے جیسا کہ بیواؤں اور یتیموں کے بارے میں ہدایت کی گئی ہے۔ ان قوانین میں وہ مختلف طریقے بھی بتائے گئے ہیں جن کے ذریعہ غلاموں کو آزادی دی جا سکتی یا حاصل ہو سکتی ہے۔ آقا اسے خود بھی آزاد کر سکتا ہے۔ یا اگر اس نے آقا کی کوئی قابل قدر خدمت انجام دی ہے تو اس کے صلہ میں بھی اس کی گردن چھوٹ سکتی ہے۔ یا پھر وہ روپیہ ادا کر کے آزادی کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ جب ایک مرتبہ وہ آزاد ہو جائے تو اس کے اوپر پہلے زمانہ میں غلام رہنے کا داغ باقی نہیں رہتا۔ اسے بھی وہی حقوق و مراعات حاصل ہو جاتے ہیں۔ جو دوسرے شہریوں کو حاصل ہیں۔ اگر وہ مسلمان ہے تو اسے یہ بھی حق ہے کہ وہ اعلیٰ خاندان کی لڑکی سے شادی کرے۔ اس معاملہ میں عملی سبق دینے اور ایک اچھی مثال قائم کرنے کی غرض سے حضور ﷺ نے اپنی رشتہ کی بہن زینبؓ کا نکاح اپنے متبنیٰ لڑکے زید سے کر دیا تھا جس کے متعلق آپ کو یاد ہو گا کہ وہ پہلے غلام رہ چکے تھے۔

5

زیدؓ کے ذکر پر ایک مرتبہ پھر ہماری توجہ حضورؐ کے ذاتی اور نجی معاملات کی طرف منعطف ہوتی ہے۔ بدر سے قبل حضورؐ کی دو بیویاں سودہؓ اور عائشہؓ تھیں۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ کی دختر حفصہؓ کو بھی آپ نے اپنی مناکحت میں لے لیا تھا۔ اگلے اٹھارہ ماہ میں آپؐ کے گھرانہ میں تین اور خواتین کا اضافہ ہوگیا۔ ان میں پہلی عبداللہ بن جحش کی بیوہ زینب ہیں۔ جو اسلام کی خاطر معرکہ اُحد میں شہید ہو گئے تھے۔ دوسری حارث کی دختر جویریہؓ ہیں۔ جو مدینہ کے قرب و جوار میں ایک مہم کے دوران قیدی بن کر آئی تھیں۔ بنو مصطلق کی جنگ میں مسلمانوں نے چھ سو سے کچھ زیادہ لوگوں کو گرفتار کیا تھا۔ جن میں سب سے زیادہ ممتاز اس قبیلہ کا سردار حارث بن ابی ضرار اور اس کی بیٹی جویریہ تھیں۔ لڑائی کے بعد یہ طے پایا کہ باپ بیٹی دونوں مسلمان ہو جائیں گے اور جویریہ حضورﷺ کے نکاح میں دے دی جائے گی۔ بنو مصطلق کے قبیلہ میں اس خبر سے خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ کیونکہ موعودہ رشتہ کی وجہ سے ان سب کو آزادی حاصل ہو گئی۔ حضورﷺ کی رشتہ دار بہن کا معاملہ بھی حل طلب ہے وہ عبدالمطلب کی نواسی ہونے کی حیثیت سے ایک اعلیٰ گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ حسن و جمال میں بھی کسی سے کم نہیں۔ ذہین بھی ہیں اور عربی زبان میں نوشت و خواند سے بھی واقف ہیں۔ قرآن شریف بھی انہیں خوب یاد ہے۔ پھر حضورﷺ سے رشتہ ہونے کے باعث انہیں مدینہ کی دوسری خواتین پر گونہ شرف بھی حاصل ہے۔ کئی سال تک آپ کو اپنے عم زاد بھائی یعنی پیغمبر صاحب سے خاص انسیت بھی رہی ہے۔ اور آپ نے جو کامیابیاں حاصل کی ہیں ان پر انہیں ناز بھی ہے اور ان کے دل میں یہ خیال جاگزین ہے کہ ایک دن آئے گا جب ان کی شادی حضورﷺ سے ہو جائے گی۔ لیکن آنحضرتﷺ نے بہ حیثیت سربراہ اسلام ان کے متعلق دوسری ہی تجویز سوچی ہے۔ آپﷺ کو زید کا خاص خیال ہے جو اسلام قبول کرنے والوں میں سابق الاولون ہیں۔ جن کی دین اور خود حضورﷺ سے وفاداری مسلم ہے اور جنہوں زبردست مہمات میں انہوں نے آپ کا ساتھ دیا ہے۔ آپ کی خواہش ہے کہ ان

سب باتوں کے صلہ میں اپنی رشتہ دار زینب کو ان کے نکاح میں دے دیں۔ جب یہ تجویز پیش کی گئی تو ان کے بھائی اور خود انہوں نے اسکی مخالفت کی لیکن آپ کے احکامات سے سرتابی ناممکن تھی اس لیے شادی ہو گئی۔

مگر باوجود اس کے باہمی موافقت اور مناسبت پیدا نہ ہو سکی۔ زینب باوجود تعلیم یافتہ اور صاحب فہم ہونے کے پہلے عورت تھیں اور بعد میں کچھ اور۔ وہ اپنی خاندانی حیثیت کو زیدؓ کے خاندان سے ملا کر دونوں کا مقابلہ کرتیں۔ آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھتیں اور پھر زید پر نظر ڈالتیں تو زمین آسمان کا فرق نظر آتا تھا۔ خود زیدؓ کو بھی اس شادی میں کوئی لطف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ تو ایک سادہ لوح انسان تھے لیکن بیوی ضدی تھیں اور اپنا ہی کہنا کرتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ حالات بگڑتے چلے گئے یہاں تک کہ باہمی مناقشات نقطہ عروج پر پہنچ گئے۔ اتفاقاً حضور ﷺ ایک روز زیدؓ کے ہاں گئے اور آپ نے زینب کی کچھ تعریف کر دی۔ جس پر ان کا جذبہ خود آرائی تفاخر کی حد تک پہنچ گیا۔ اس کے بعد انہوں نے شوہر سے اور زیادہ بے اعتنائی اور منافرت برتنی شروع کر دی۔ آخر وہ مجبور ہو کر آپ کے پاس گئے اور درخواست کی کہ ان کو اس بند نکاح سے آزاد کر دیا جائے۔

حضور ﷺ نے دریافت فرمایا ''کیا تم ان میں کوئی نقص پاتے ہو؟''

''جی نہیں نقص تو کوئی نہیں، مگر ہم دونوں کا اب نباہ نہ ہو سکے گا۔''

حضور ﷺ نے سمجھایا ''نہیں تم کو چاہیے کہ باہم شیر و شکر ہو کر رہو اور بیوی کی خاطر داری کرتے رہو۔''

زیدؓ گھر واپس چلے گئے اور زینب کو خوش رکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن مناکحت کی گاڑی نے آگے چلنے سے انکار کر دیا۔ آخر بہت غور و خوض کے بعد زیدؓ اس نتیجہ پر پہنچے کہ بجز طلاق کے اور کوئی چارہ کار نہیں۔ اس لیے انہوں نے بغیر حضور ﷺ کی اجازت کے بیوی کو طلاق دے دی۔ زینبؓ فوراً ہی ان کے گھر سے نکل آئیں اور زید کو اطمینان کا سانس لینے کا موقع ملا۔ اس میں شک نہیں کہ ان کا حسن راحت چشم تھا لیکن

ان کا رخصت ہو جانا راحت قلب معلوم ہونے لگا۔

زینبؓ نے زیدؓ کو خواہ مخواہ طلاق پر مجبور نہیں کیا تھا۔ ان کا دل حضور علیہ کے متعلق ان جذبات اور خواہشات سے مملو تھا جن کو صرف ایک عورت ہی سمجھ سکتی ہے۔ عدت کے بعد ہی انہوں نے اپنی اس تمنا کا اظہار بھی کر دیا کہ وہ حضور علیہ سے رشتہ کی طالب ہیں اور چونکہ ان کی اس بے پناہ آرزو کا رد ممکن نہ تھا اس لیے آپ نے ان کو اپنے گھر میں بہ حیثیت پانچویں زوجہ کے داخل فرما لیا۔

اس شادی نے مدینہ میں سنسنی پھیلا دی ہے۔ کیونکہ لوگ زیدؓ کو حضور علیہ کا بیٹا ہی تصور کرتے ہیں۔ عربوں کے خود ساختہ معاشرتی قوانین میں یہ تو جائز تھا کہ کوئی شخص اپنی ساس سے بیاہ رچالے یا اپنے باپ کی بیواؤں میں سے کسی سوتیلی ماں کو پسند کر کے اسے اپنی بیوی بنا لے۔ لیکن منہ بولے بیٹے کی مطلقہ بیوی کا باپ کی مناکحت میں آنا قطعاً ناجائز اور ناقابل قبول ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ منہ بولا لڑکا کسی صورت میں بھی حقیقی فرزند نہیں ہو سکتا۔ ان کی طبعی جہالت اس رشتہ کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ مخالف زبان قینچی کی طرح تیزی سے چل رہی ہے اور زینبؓ کا حضور علیہ سے رشتہ سخت ترین تنقید کی آماجگاہ بن گیا ہے۔ بالآخر ایک وحی ہی اس بحث کا خاتمہ کرتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں "پھر جب زید کی حاجت روائی ہو چکی اور وہ طلاق دے چکا تو اس نے (زینبؓ) کو بطور زوجہ کے آپ کو دے دیا۔ تاکہ مسلمانوں کے لیے جب ان کے متبنی بے تعلق ہو جائیں تو نکاح میں کوئی دشواری نہ رہے۔"

اسی زمانہ میں اس سے بھی زیادہ ایک اور اہم واقعہ پیش آتا ہے۔ جس نے حضور علیہ کی زندگی میں ایک ہیجان پیدا کر دیا ہے۔ بنی مصطلق کی شکست کے بعد آپ علیہ واپس تشریف لا رہے تھے کہ راستے میں مریسیع کے مقام سے جب لشکر نے کوچ کیا تو حضرت عائشہؓ جو حضورؐ کے ساتھ سفر کر رہی تھیں، پیچھے رہ گئیں۔ شتربان کو یہ احساس ہی نہ ہوا کہ ہودج خالی ہے۔ اس نے یہی سمجھا کہ آپ اس کے اندر ہی تشریف فرما ہوں گی۔ چنانچہ اسے اٹھا کر اونٹ پر رکھا اور روانہ ہو گیا۔ دراصل ان کے گلے کا ہار

کہیں گر گیا تھا اور وہ اسے جھاڑیوں کے پیچھے ڈھونڈتی پھر رہی تھیں کہ یہ واقعہ پیش آ گیا۔ شتربان کو دن بھر اس حادثہ کا علم نہ ہو سکا اور اگر ہوا بھی ہو گا تو اُس نے خوف کے مارے اس کا اظہار نہ کیا۔ اس دوران میں مسلمانوں کی فوج کے افسر صفوان بن معطل نے جو خود بھی پیچھے رہ گئے تھے حضرت عائشہؓ کو دیکھا اور با احتیاط تمام انہیں واپس حضورﷺ کے پاس پہنچا دیا۔ اس دوران میں ایک رات گذر چکی تھی اور صفوان اپنے مردانہ حسن کے واسطے مشہور ہیں۔ بس اب کیا ہے منافقوں کی زبانیں گز گز بھر کی ہو گئی ہیں۔ عبد اللہ بن ابی کو بالخصوص حضورﷺ کے گھرانے کو بدنام کرنے کا ایک نادر موقع ہاتھ آ گیا ہے۔ عائشہؓ کی واپسی پر ان کے شوہر، والد اور والدہ نے اس کے بارے میں متعدد سوالات کیے ہیں اور انہوں نے اس کا اس طرح جواب دیا ہے "حضورﷺ جب کبھی سفر پر جانے کا ارادہ فرماتے تو آپ کی ازدواج میں ہمراہ جانے پر تکرار ہوا کرتی۔ اس لیے قرعہ اندازی سے یہ معاملہ طے کیا جاتا۔ چنانچہ اس مرتبہ میرا نام نکلا پردہ کا حکم نازل ہو چکا تھا۔ میں ایک عماری کے اندر بٹھا دی جاتی تھی۔ جو حضورﷺ کی حرموں کے واسطے بنائی گئی تھی۔ واپسی میں ایک جگہ لشکر کے کوچ کرنے سے کچھ پہلے مجھے قضائے حاجت کے واسطے اتر کر جانا پڑا۔ جب فوج آگے بڑھ گئی تو میں نے کجاوے میں بیٹھنے کا ارادہ کیا لیکن یکا یک مجھے معلوم ہوا کہ میرا ہار کہیں گر گیا ہے۔ اور میں اسے تلاش کرنے کے واسطے چلی گئی۔ میں اس گمشدہ زیور کو ڈھونڈنے میں معروف تھی؛ اُدھر سواروں نے میرا ہودج اونٹ پر لادا اور روانہ ہو گئے۔ انہیں اس کے ہلکے ہونے پر اس واسطے شبہ نہ ہوا کہ اوّل تو ہم سفر میں کوئی سامان ہی ساتھ نہ رکھتے تھے اور پھر خود مجھ کا بھی کم ہی وزن تھا۔ ہار کی تلاش کامیاب ثابت ہوئی اور میں خوش خوش لوٹی تو یہ دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئی کہ اونٹ اور عماری دونوں غائب ہیں۔ میں نے آوازیں دیں مگر کسی نے نہ سنا۔ مجھے امید تھی کہ جلد ہی میری گمشدگی کا علم ہو جائے گا اور میرا اونٹ مجھے لینے کے واسطے واپس لوٹے گا مگر کوئی نہ آیا۔ انتظار کرتے کرتے نیند نے مجھے آلیا اس لیے میں بیٹھ گئی اور پھر سو گئی۔ صفوان کا جو لشکر کے عقب میں چلا کرتے تھے اُدھر سے گذر ہوا۔ اور انہوں

نے مجھے بے نقاب دیکھ کر پہچان لیا۔ جب تک میں سوتی رہی۔ وہ انتظار کرتے رہے جب بیدار ہوئی تو انہوں نے "اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہ" کہا۔ میں خدا کی قسم کھاتی ہوں کہ میرے اور ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں نے فوراً ہی چہرہ ڈھانپ لیا۔ اور میں ان کے اونٹ پر سوار ہو گئی۔ جس میں انہوں نے میری مدد کی۔ صفوان اونٹ کی نکیل پکڑے ہوئے اسے لشکر تک لے آئے۔

عائشہؓ کا بیان واضح اور مکمل تھا۔ اور ان کے طور و طریق یا چہرہ سے کسی طرح بھی کسی گناہ یا خطا کا اظہار نہ ہوتا تھا۔ واقعہ افسوسناک ضرور تھا۔ لیکن ایسا حادثہ کسی کو بھی پیش آسکتا تھا۔ حضورﷺ نے محسوس کر لیا کہ عائشہؓ جو کچھ کہہ رہی ہیں صحیح ہے۔ صفوان کے متعلق بھی آپ کو علم تھا کہ بہت راستباز اور دیانتدار ہیں اور اس کا بھی یقین واثق تھا کہ انہوں نے بہ حیثیت ایک سپاہی اور دوست کے اپنے فرائض سے سرمو تغافل نہیں کیا اور بالآخر وحی نے حضرت عائشہؓ پر جو اتہام لوگوں نے لگایا اس کی واشگاف الفاظ میں تردید بھی کر دی۔

لیکن اس کا ایک بہت ناگوار اثر حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ کے ناگوار تعلقات میں منتج ہوا ہے۔ حضرت عائشہؓ کا خیال ہے کہ ان کے متعلق جو رکیک سوالات کیے گئے ان کے پردے میں حضرت علیؓ کا ہاتھ ہے۔ حضرت علیؓ نے غالباً ایک ایسے معاملہ میں جس سے براہ راست ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ بڑا محتاط رویہ اختیار کیا اور زور دیا کہ بمقابلہ اس قسم کی تحقیقات کے جس سے حضورﷺ کو اطمینان ہو جاتا زیادہ کدو کاوش سے کام لیا جائے۔ حضرت عائشہؓ نے غالباً اس میں اپنی اہانت سمجھی اور حضرت علیؓ نے واجبی شبہات کو عبداللہ بن ابی کی الزام طرازی کے برابر سمجھ لیا۔

اس وقت سے حضرت علیؓ اور ان کے درمیان باہمی عزت و احترام میں کچھ کمی واقع ہو جاتی ہے۔

لیکن آنحضرتﷺ کی حضرت علیؓ کے متعلق جو رائے ہے اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ نہ حضرت علیؓ ہی کی طرف سے اس میں کسی کمی کا امکان ہو سکتا ہے۔

آپ کی چہیتی بیٹی فاطمہؓ کی اُن سے شادی اس بات کی ضمانت ہے کہ اپنے محبوب رہنما کے ساتھ ان کے تعلقات ہمیشہ مستحکم رہیں گے۔

6

پیغمبر ﷺ کو اس کا بھی بخوبی علم ہے کہ مدینہ پر ایک تیسرے حملے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ آپ ﷺ کے جاسوس برابر ان سازشوں اور کارروائیوں کی خبریں گوش گزار کرتے ہیں۔ جو یہودی اور قریش اپنے حلیفوں کے ساتھ مل کر کر رہے ہیں۔ ہم دوسرے موقعوں پر دیکھ چکے ہیں کہ جب کبھی خطرہ لاحق ہوا تو نظریات کے تابع رہنے والے پیغمبر ﷺ نے کس طرح یکایک ایک عملی انسان بن کر دکھایا کہ آپ ایک پُرعزم اور چابکدست فوجی جنرل بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ اب بھی حضور ﷺ حالات کا بڑی دوربین نظروں سے مطالعہ کر رہے ہیں اور بہت پہلے سے مدافعت کے واسطے تیار ہو جاتے ہیں۔ اتنی زبردست مخالف فوج کے مقابلے میں آپ کو اپنے تمام علاقوں کا تحفظ ناممکن نظر آتا ہے۔ اس لیے آپ صرف مدینہ کے دفاع پر اکتفا کرتے اور شہر کے حدود میں رہ کر اس کو مستحکم کرنے پر اپنی توجہ مرکوز کر دیتے ہیں۔ خوش قسمتی سے آپ ﷺ کی امداد اور مشورہ کے لیے سلمان فارسی موجود ہیں جو کسی زمانہ میں ایران کے گورنر رہ چکے ہیں۔ وہ جدید ترین اصول حرب سے بخوبی واقف ہیں اور پیغمبر ﷺ کو مشورہ دیتے ہیں کہ شہر کے گرد ایک گہری خندق کھودی جائے۔ چنانچہ تمام مدینہ چیونٹیوں کے چھتے کی طرح باہر نکل کر کام میں مصروف ہو جاتا ہے اور آپ کے بتائے ہوئے طریقوں پر عمل کرتا ہے۔ ہر طرف پھاؤڑوں اور کدالوں کی آواز کے ساتھ ان لوگوں کے کلمات سے ایک شور مچ جاتا ہے جو اپنے ساتھیوں کو زیادہ محنت پر اکسا رہے ہیں۔ خود حضورؐ بھی مثال قائم کرنے کے لیے کدال اور بیلچہ لے کر کام پر ڈٹ گئے ہیں۔ زمین سخت اور سنگلاخ ہے۔ لیکن کوئی شے آپ ﷺ کو تن دہی سے باز نہیں رکھ سکتی۔ جہاں کہیں دشواری پیش آتی ہے۔ آپ امداد کے لیے فوراً وہاں پہنچ جاتے ہیں اور پھر ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ قدرت آپ کے ساتھ ساتھ چلی جا رہی ہے۔ اور یکے بعد دیگرے تمام مشکلات حل ہو رہی ہیں۔

خندق عمیق اور وسیع ہوتی جاتی ہے۔ آپ ﷺ کو اس جوش اور لگن سے کام کرتے دیکھ کر لوگ مست و مسرور ہو گئے ہیں۔ اور اتنے کم وقت میں اتنی زبردست کھائی کا تیار ہو جانا بادی النظر میں ایک معجزہ ہی دکھائی دیتا ہے۔

بالآخر مکہ والوں کے مقابلے اور طویل محاصرے کے لیے خندق' ہتھیار اور سامان رسد کی فراہمی مکمل ہو جاتی ہے۔

اب محمد ﷺ اطمینان سے بیٹھ کر ابوسفیان کا انتظار کر سکتے ہیں۔ لیکن آپ ﷺ کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ ایک زبردست فوج مدینہ کی طرف بڑھنے لگی ہے۔ اور اُفق پر جنگ کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ بعض کا اندازہ دس لاکھ کا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ دشمن کی جماعت بیس لاکھ سے کم نہیں۔ رفتہ رفتہ دوسرے گوشے بھی افواج سے پُر ہو جاتے ہیں۔ پہلے بنوغطفان آتے ہیں پھر بنونفیر اور پھر دوسرے یہود قبائل کعب بن اسد کی سرکردگی میں نمودار ہوتے ہیں۔ مدینہ کے گردو پیش کا تمام علاقہ خیمہ و خرگاہ سے بھر جاتا ہے اور ان کی مجلا و مصفا ڈھالوں' نیزوں اور تلواروں سے سورج کی شعاعیں اس طرح چمکتی ہیں جیسے آگ کے شعلوں نے میدان کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہو۔ برچھیوں کا ایک بے پناہ جنگل ہے جو زمین پر چھا گیا ہے۔ فضا میں گھن گرج سی پیدا ہو گئی ہے۔ مگر شہر میں ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ قرآن کے الفاظ اس موقع کے لیے یہ ہیں "جب وہ اوپر کی جانب سے اور نیچے کی طرف سے تم پر چڑھ آئے تھے اور خوف سے تمہاری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں اور کلیجے منہ کو آنے لگے تھے اور خدا کی نسبت تم طرح طرح کے گمان کرنے لگے تھے۔"

بعض صحابہ یہ بھی مشورہ دیتے ہیں کہ یہاں سے بھاگ چلنا چاہیے۔ یہ اتحادی افواج اتنی زبردست ہیں کہ عرب کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ محصورین مقابلتاً ہتھیاروں اور سپاہیوں کی تعداد اور جنگی تجربات میں ان سے بہت پیچھے ہیں۔ مضافات میں آباد بنی قریظہ اس آڑے وقت میں امداد دے کر یا کم از کم غیر جانبدار ہی رہ کر بڑی مدد کر سکتے ہیں۔ لیکن انہوں نے تمام وعدوں' تمام معاہدوں اور تمام وفاداروں کو پس

پشت ڈال کر اتحادیوں سے گٹھ جوڑ کر لیا ہے۔ محمد ﷺ سعد بن مغیرہ اور سعد بن عبیدہؓ کو ان کے پاس بھیجتے اور پچھلے مواعد یاد دلانے کی کوشش فرماتے ہیں کہ مدینہ کے متعلق ان سے جو سمجھوتہ ہوا ہے اس پر قائم رہیں۔ لیکن بنو قریظہ کا جواب نہایت ناشائستہ اور گستاخانہ ہے وہ کہتے ہیں "تمہارے محمد ﷺ تمہارے رسول ﷺ کون ہوتے ہیں؟ کہ ہم ان کی اطاعت کریں۔ یہاں سے دور ہو جاؤ ہمارے درمیان اب کوئی معاہدہ نہیں۔"

جب یہود کے اس طرز عمل کا مسلمانوں کو پتہ چلتا ہے تو وہ بھونچکے رہ جاتے ہیں۔ غداری! بالکل غداری' احسان فراموشی! بے شک احسان فراموشی! کیا عربوں میں پہلے بھی کبھی ایسا ہوا ہے؟ لیکن اس غداری اور خود اپنے ساتھیوں کی مایوسانہ گفتگو اور شور و شغب کے باوجود اسلام کے سپہ سالار کی طمانیت اور اعتماد میں کوئی فرق نہیں آیا۔ آپ سنجیدگی اور متانت کا ایک مجسمہ دکھائی دیتے ہیں۔ بہت اطمینان کے ساتھ فیصلہ فرماتے ہیں اور حیرت انگیز سکون کے ساتھ ان کے متعلق احکام صادر کرتے ہیں۔

مدینہ کا نظم و نسق ابن مکتومؓ کے سپرد فرما کر آپ ﷺ نے اپنی تمام صلاحیتیں جنگ کے واسطے وقف کر دی ہیں۔ مسلمانوں کی تین ہزار فوج شہر کے اطراف میں متعین کر کے انہیں حکم دے دیا ہے کہ اگر دشمن خندق پار کرے تو خود بھی حملہ کر دیں۔ اتحادیوں کی برابر یہی کوشش ہے کہ مسلمانوں کو ان کے حصار سے باہر نکال لائیں لیکن محمد ﷺ اپنے تیار کردہ نقشہ جنگ کے مطابق لڑنے پر جمے ہوئے ہیں اور اس باب میں کفار کی تمام تدبیریں ناکامیاب ہو رہی ہیں۔ وہ جدھر سے بھی خندق عبور کرنے کی کوشش کرتے ہیں زک ہوتی ہے اور سخت نقصان اٹھا کر واپس لوٹنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی تیروں کی بارش بھی چلنے لگتی ہے۔ کبھی کبھار سواروں کا زبردست حملہ ہوتا ہے۔ لیکن ابوسفیان کے تمام حربے ناکامیاب ثابت ہوتے ہیں اور مدینہ ناقابل تسخیر نظر آتا ہے۔

محاصرہ تقریباً ایک ماہ تک جاری رہتا ہے۔ لیکن لاحاصل' دن گذرنے کے ساتھ ساتھ اتحادیوں کی ہمتیں پست ہوتی جاتی ہیں اور ان کے مقابلہ میں محصور پُرامید ہو رہے ہیں۔ دشمنوں کی افواج میں اختلافات بھی رونما ہونے لگے ہیں۔ پیغمبر ﷺ ان

حالات سے پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ آپ مختلف حیثیتوں سے فائز المرام ہو کر اب ان سے گفت و شنید میں بھی کامیابی حاصل کر رہے ہیں۔ اتحادیوں میں سے ہر جماعت کے ساتھ علیحدہ علیحدہ بات چیت ہونے کی وجہ سے وہ کئی دھڑوں میں بٹ گئے ہیں۔ سرداران قریش کی انتہائی کوشش ہے کہ آپس میں نا اتفاقی پیدا نہ ہو۔ لیکن اختلافات کے پودے مضبوط جڑیں پکڑ چکے ہیں۔

اس دوران میں عناصر قدرت نے بھی اہل مکہ کے خلاف سازشیں شروع کر دی ہیں۔ سیاہ بادلوں نے سورج کو اپنے نرغے میں لے لیا ہے۔ زمین پر تاریکی چھا گئی ہے اور پانی کی بڑی بڑی بوندیں زرہوں اور ڈھالوں پر گر کر ہنگامہ مچا رہی ہیں۔ دشمن بھاگ کر خیموں میں پناہ لیتے ہیں۔ لیکن فوراً ہی ایک تیز و تند ہوا ان خیموں کے ساتھ بھی زور آزمائی کرنے لگتی ہے۔ ساتھ ہی موسلا دھار بارش میدانوں اور خندق دونوں کو تہ آب کر دیتی ہے۔ اب اس نے طوفانی رنگ اختیار کر لیا ہے۔ تمام رات یہ جھکڑ شوں شوں کرتا رہتا ہے۔ خیمے اکھڑ کر گر جاتے ہیں۔ بارش کا پانی ہتھیاروں اور سامان خوراک دونوں کے ساتھ بڑی زیادتیاں کرتا رہتا ہے اور سخت سردی بڑے بڑے سورماؤں کی ہڈیوں تک کو یخ کر دیتی ہے۔

پھر جب صبح کا سورج رفتہ رفتہ بھورے بادلوں سے نمودار ہو کر میدان جنگ کو کہیں سیاہ اور کہیں قرمزی رنگ سے مزین کر رہا ہوتا ہے تو سویرے اٹھنے والے یہ دیکھ کر مسرور ہو جاتے ہیں کہ قریش کا بے پایاں لشکر جنوب کی طرف کوچ کر رہا ہے۔ ان کے حلیف تو طوفان کی تاریکیوں سے فائدہ اٹھا کر پہلے ہی رفو چکر ہو گئے تھے۔ تحقیق کرنے پر یہ خبر صحیح ثابت ہوتی ہے کہ قریش نے مراجعت کا قصد کر لیا ہے۔ اتحاد ختم ہو چکا ہے اور قریش نے اسلام کو بیخ و بن سے اکھاڑ دینے کا جو خواب دیکھا تھا وہ ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے پراگندہ ہو گیا ہے۔ وہی ابوسفیان جو بہت مغرورانہ طور پر سر اٹھا کر حملہ کرنے چلا تھا اسی سر کو نہوڑائے واپس جا رہا ہے۔ وہی فوج جو اپنی کثرت تعداد پر نازاں نہایت طمطراق سے مدینہ کی اینٹ سے اینٹ بجانے آئی تھی۔ مایوسیوں کے سمندر میں غوطہ کھاتی واپس جا رہی ہے اور اس کے ساتھ ہی کعبہ کے اصنام باطل نے بھی اپنی گردنیں جھکا دی ہیں۔

﴿7﴾

مدینہ خوشی سے پھولے نہیں سماتا لیکن فتح کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک حلف دروغ بنو قریظہ سے حساب کتاب صاف نہیں کر لیا جاتا۔ اگر خوش بختی نے مسلمانوں کا ساتھ نہ دیا ہوتا تو وہ اب تک مدینہ کو یقیناً دشمنوں کے حوالے کر چکے ہوتے۔ لیکن اتنے طویل محاصرہ کے بعد اسلامی فوج کے نبرد آزما تھک کر چور ہو گئے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ جنگ کے محاسبہ کو فی الحال ملتوی کر دیا جائے اور فتح کی خوشیاں اپنی مستورات کی آغوش میں منائی جائیں۔ لیکن انہیں اپنی تمناؤں کو چند روز کے لیے پس پشت ڈال دینا ضروری سمجھا جا رہا ہے۔ سب سے پہلے تو بنی قریظہ کو اپنے متمردانہ طرز عمل کی وجوہات بتانا ضروری ہیں۔ پھر اس کی سزا ملتی ہے چنانچہ مسلمانوں کی فوج انہیں اپنے ہی قلعہ میں محصور کر لیتی ہے اور پچیس دن بھی نہیں گزرتے کہ پورا قبیلہ جس میں سات سو مرد اور اتنی ہی عورتیں اور بچے شامل ہیں ہتھیار ڈال دیتا ہے اور اطاعت قبول کر لیتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ انہیں کیا سزا دی جائے۔ بنی قریظہ کا خیال ہے کہ جس طرح ان سے پہلے کئی صورتوں میں ہو چکا ہے۔ حضور ﷺ ازراہ ترحم و رعایت ان کو صرف مدینہ سے نکل جانے کا حکم دے کر خاموش ہو جائیں گے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اگر آپ بہ نفس نفیس اس معاملہ کو طے فرماتے تو شاید جلا وطنی پر معاملہ ختم ہو جاتا لیکن حضرت عمرؓ اور بعض دوسرے صحابہ کا اصرار ہے کہ ان سے غداری کا بھرپور انتقام لیا جائے۔ آخر بڑی بحث و تمحیص کے بعد معاملہ کا تصفیہ ایک ایسے شخص پر چھوڑ دیا جاتا ہے جسے دونوں فریقوں کا اعتماد حاصل ہو۔ چنانچہ سعد بن معاذ اس کام کے لیے منتخب ہوتے ہیں۔ یہودیوں کو یقین ہے کہ فیصلہ ان کے حق میں ہو گا۔ لیکن بدقسمتی سے ان کو اس کا علم نہیں کہ محاصرہ کے دوران میں ان کو ایک زخم کاری لگ چکا ہے جس کی وجہ ان کے نزدیک یہودیوں کی وہ غداری ہے جس کی پاداش میں یہ جنگ وقوع پذیر ہوئی ہے۔

سعد زخمی ہیں۔ اس وجہ سے ان کو اٹھا کر لایا گیا ہے اور معاملہ کی اونچ نیچ سمجھائی گئی

ہے۔ قریظہ ان سے رعایت اور نرمی کی درخواست کرتے ہیں۔ ان کے والد سے اپنے دوستانہ تعلقات یاد دلاتے ہیں۔ ہر شخص کی نظر سعدؓ پر لگی ہوئی ہے دیکھئے وہ کیا تصفیہ کرتے ہیں۔

وہ بہت محتاط الفاظ میں اپنا فیصلہ سناتے ہیں "یہودیوں کی مقدس کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ جب خدا تمہارے دشمنوں کو تمہارے ہاتھ میں دے دے تو تم اپنی تلوار کی دھار سے ہر ایک کا سر قلم کر دو۔ لیکن ان کی عورتیں' بچے اور مویشی یا جو کچھ شہر کے اندر ہے بطور مال غنیمت کے تمہاری ملکیت ہو جائے گا۔ تم اس سارے مال کو جو خدا نے تمہیں عطا کیا ہے اپنے استعمال میں لاؤ۔ چنانچہ جو کچھ خود ان کی کتابوں میں تحریر ہے اسی کے مطابق ان سے بھی سلوک کیا جائے۔ ہر مرد تلوار کے گھاٹ اتارا جائے۔ ہر عورت و بچہ غلام بنے اور کل مال و سامان مسلمانوں کے قبضہ میں آ جائے۔"

ثالثی کے اس فیصلہ کو سن کر مجمع پر سکوت چھا جاتا ہے اور فوراً ہی یہودی عورتیں اور بچے چیخنے چلانے لگتے ہیں۔ شام ہوتے ہوتے سات سو قبریں اس طرح بنی بنائی تیار ملتی ہیں کہ ان کی سات قطاریں ہیں جن میں سے ہر ایک میں سو سو لحدیں کھدی ہوئی ہیں۔ تمام مدینہ ان غداریوں کے انجام کو دیکھنے کے لیے جمع ہو گیا ہے۔ ان میں یہودی' نصرانی' صابی سب ہی شامل ہیں اور اپنے اپنے تئیں اس واقعہ سے نتائج اخذ کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی شہر کے عمائدین اور گرد و پیش کی آبادیوں کے سردار قبیلہ بھی جمع ہیں۔ یکے بعد دیگرے ایک ایک قیدی کو اس قبر کے قریب جس میں اسے قیامت تک آرام کرنا ہے لایا جاتا ہے۔ وہ جدوجہد بھی کرتا ہے' التجا بھی کرتا ہے لیکن مضبوط ہاتھ اسے اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہیں۔ تیز و طرار تلوار کی چمک دکھائی دیتی ہے اور ہلکی سی چیخ سنائی دیتی ہے۔ خون کے کچھ چھینٹے اڑتے ہیں اور ایک سر تن سے جدا ہو کر قبر میں جا گرتا ہے۔ دھڑ اس کے اندر ڈال کر لحد پاٹ دی جاتی ہے۔ اسی طرح دوسرا' پھر تیسرا حتیٰ کہ سات سو کی گنتی پوری ہو جاتی ہے۔

اس طرح یہودیوں کا مسئلہ خود انہیں کے قوانین کے مطابق طے ہو جاتا ہے۔

چھٹا باب

"فاتح"

احزاب یا خندق کی فتح نے اسلام کی بنیاد کو مستحکم کر کے حضور ﷺ کی شہرت اور نیک نامی میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ عرب کے گوشہ گوشہ سے لوگ اس حیرت انگیز شخصیت کو دیکھنے کے لیے جوق در جوق چلے آ رہے ہیں جو فقیرانہ درویشی اور معمولی حیثیت کے انسان کی طرح زندگی بسر کرنے کے ساتھ سکندر جیسی صولت' ہیرو جیسی فصاحت و بلاعت' مسیح جیسے ترحم اور شیر جیسی طاقت و جبروت کا مالک ہے۔ ایسا شخص جو امن کے زمانے میں خدا پرستی کی تعلیم کا بڑا شفیق استاذ' روشن ضمیر مہتمم' بے لاگ منصف اور نرم دل و مہربان حکمران ہے۔ جب جنگ ہو تو فنون حرب کا ماہر' مستقل مزاجی کا پیکر' استقامت کا ستون' دشمنوں کے لیے کوہ گراں اور اعلیٰ درجہ کا جنرل بن جاتا ہے۔ جس کی تبلیغ خود اپنی زندگی کی آئینہ دار ہے۔ جس کا مذہب فرشتوں کے لیے نہیں بلکہ زندہ انسانوں کے واسطے وضع کیا گیا ہے۔ اور جس کا خدا رحمٰن و رحیم ہے' جس کی تمام زندگی صحابہ ہی نہیں تمام انسانوں کے لیے بمنزلہ ایک کھلی ہوئی کتاب کے ہے۔ جب وہ کوئی فیصلہ فرماتے ہیں' تو علی رؤس الاشہاد اور اس کے ساتھ کبھی کوئی نفسانی خواہش یا مقصد شامل نہیں ہوتا۔ آپ کے ساتھی معتمد علیہ بھی ہیں' ہمراز بھی اور دوست بھی۔ جب آپ ان سے کسی قسم کا کام کرنے کی خواہش کرتے ہیں' تو سب سے پہلے خود کر کے دکھاتے ہیں۔ خواہ اس کا تعلق عورتوں سے ہو یا قرب و جوار کے قبائل سے یا دشمنوں سے۔ جب آپ ﷺ سے کوئی غلطی ہو جاتی ہے اور غلطی بہرحال انسانی فطرت کا تقاضا ہے تو آپ

اس کا اظہار فرما دیتے ہیں۔ اس لیے زیادہ عبادت فرماتے ہیں کہ دوسرے بھی آپ کی مثال پر عمل کریں۔ روزہ رکھتے ہیں تو اس واسطے کہ اور لوگ بھی ایسا ہی کریں۔ آپ صدقہ و خیرات میں بہت سعی فرماتے ہیں تاکہ آپ کے پیرو بھی یہی روش اختیار کریں۔ آپ شادیاں کرتے اور ان سے اولاد حاصل کرتے ہیں کیونکہ آپ کے نزدیک نظام تخلیق اس سے قائم ہے۔ اور اپنا کام خود اپنے ہاتھوں انجام دیتے ہیں تاکہ لوگ محنت کی قدر کرنا سیکھیں۔ محمد ﷺ بہ حیثیت انسان' بہ حیثیت پیغمبر اور بہ حیثیت ایک فاتح کے ایسے ہیں۔ اس لیے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ قرآن کہتا ہے ''تم لوگوں کے پاس پیغمبر ﷺ کی ایک بڑی عمدہ مثال موجود ہے۔'' اور صحیفہ مبارکہ کی اس شہادت میں کسی قسم کا مبالغہ نہیں ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ عزم الخلائق' سید البشر اور انسانیت کا بہترین نمونہ ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا بہترین انسانوں ہی کے واسطے بنائی گئی ہے۔ انہیں سے اس کا رنگ روپ اور انہیں سے اس کی رونق ہے اور ان بڑے لوگوں پر اعتماد و اعتقاد کرنا بھی قدرتی امر ہے۔ ہم اپنے بچوں اور سڑکوں تک کو ان کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ہم ان کی تصانیف اور ان کے مجسمے اپنے گھروں میں باعزت طریقے پر رکھتے ہیں اور روزمرہ واقعات کے سلسلے میں بھی ان کے حالات زندگی سے سبق لیتے رہتے ہیں۔ انہیں کے نام پر تمام قوم فخر کرتی ہے۔ صرف اس ایک بات سے کہ ان کے شہر میں ایک عظیم شخصیت جلوہ گر ہے۔ وہاں کے باشندوں کا اعزاز بڑھ جاتا ہے۔ اگر ہمارے بچپن کے ساتھی آگے چل کر ہیرو بن جاتے یا شاہانہ زندگی بسر کرنے لگتے ہیں تو ہمیں چنداں تعجب نہیں ہونا چاہیے' کیونکہ نوجوانی میں انسان بڑائی کے خواب دیکھتا رہتا ہے اور عنفوان شباب کا یہی جذبہ اس کا سب سے محبوب مشغلہ ہوتا ہے۔

محمد ﷺ اب اس صدی کی عظیم ترین شخصیت ہیں۔ کسی زمانہ میں وہ خواب دیکھتے رہے ہوں۔ ان کا مقاطعہ کیا گیا ہو دیس نکالا ملا ہو۔ لیکن اب ''وہی سر پھرے مبلغ'' دنیوی اور دینی بادشاہ ہیں۔ اب وہی مجلس کے صدر' عوام کے نور نظر اور بوڑھوں کے ساتھ نوجوانوں کے بھی ہیرو بنے ہوئے ہیں۔ اب لوگ ملک کے ہر حصے سے ان

کے تبلیغی واعظ سننے آتے ہیں اور ان کی فصاحت و بلاغت کے جادو سے مسحور ہو کر مسلمان بن جاتے ہیں۔

مدینہ کو آپ پر فخر ہے۔ آپ کی عظمت کا پتہ لگا لینے پر فخر ہے اور اس پر بھی فخر ہے' کہ اس نے حضور ﷺ پر جو اعتماد کیا تھا۔ اس میں زبردست کامیابی حاصل ہوگئی ہے۔ چھ سال کے واقعات' حکومت کے دوران جو مشکلات پیش آئیں اور جس طرح آپ نے ان کو حل فرمایا ان سب نے مل کر آپ کو ایک بیدار مغز حکمران بنا دیا ہے۔ آپ نے اپنی قوم کی خوبیوں کو اجاگر کر کے ان کو عمل میں لانے کے مواقع فراہم کر دیے ہیں۔ خود مکہ میں بھی ایک طبقہ آپ کی موافقت میں بولنے لگا ہے۔ بہت سے لوگ آپ کی زندگی کے حالات بیان کرتے اور بین السطور میں خود اپنی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ محمد ﷺ کوئی صاحب کشف و کرامت بزرگ' کوئی پیر و مرشد تو نہیں ہیں۔ ایک انسان ہیں۔ معمولی انسان ان میں وہ خوبیاں اور خصوصیات دیکھتا ہے جو اسے کسی دوسرے انسان میں بھی نظر آ سکتی ہیں۔ محمد ﷺ خود اپنی اعلیٰ نسبی یا دولتمندی کے دعویدار نہیں ہیں۔ آپ ان تمام کاموں میں حصہ لیتے ہیں جن میں عوام شریک ہوتے ہیں۔ فتوحات نے بھی آپ کو مافوق الانسان ہستی نہیں بنا دیا۔ بلکہ اس نے یہی سبق سکھایا ہے کہ کوئی معمولی انسان اپنی کوششوں سے بھی کچھ کر سکتا ہے۔ آپ کی طاقت' قوت اور عظمت سب کچھ اس باب میں مضمر ہے کہ آپ اپنی قوم کے خیالات متیقن توقعات اور زمانہ کے تقاضوں کو پورا کر رہے ہیں۔ آپ کی شخصیت میں عرب کو ایک ایسا نقیب دکھائی دے رہا ہے۔ جو انہیں حیرت انگیز قومی عظمت اور فتوحات کے زریں مستقبل سے روشناس کر رہا ہو۔

اتحادیوں کو شکست دینے کے بعد چھوٹے چھوٹے باغی قبیلوں کو قابو میں لانا چنداں مشکل نہیں رہا۔ اور رفتہ رفتہ نہایت پُراطمینان طریقے سے اسلام اپنی خبریں دوسرے علاقوں میں بھی پھیلانے لگا ہے۔ اب اسے کسی نمایاں مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا۔ ہجرت کے چھٹے سال آنحضرت ﷺ سواروں کے ایک دستہ کو ابن اسلام کی

سرکردگی میں بنو بکر کے خلاف بھیجتے ہیں۔ وہ رات کو سفر کرتے اور دن کو آرام کرتے ہوئے جاتے اور اچانک دشمن کے سر پر پہنچ کر انہیں منتشر کر دیتے ہیں اور پچاس اونٹ اور تین ہزار بھیڑوں پر مشتمل مال غنیمت لے کر چند ہی روز میں مدینہ واپس لوٹ آتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ بنو بکر کے سردار ثمامہ کو حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ لیکن آپ اس سے کوئی انتقام نہیں لیتے۔ دشمن کو تکالیف دینا یا اذیت پہنچانا آپ کا شیوہ نہیں۔ بلکہ اس کے برخلاف آپ معافی اور درگزر میں خوشی محسوس فرماتے ہیں۔ آپ اسیروں کے ساتھ ان کی عمر، رتبہ اور حیثیت کے مطابق سلوک کرتے ہیں۔ جس کا ان پر بین طور پر اثر پڑتا ہے۔ یہی حال اس سردار کا بھی ہوتا ہے۔ ثمامہ کے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ حضور ﷺ کا شکریہ ادا کر سکے۔ چنانچہ وہ آپ سے درخواست کرتا ہے کہ اسے دائرۂ اسلام میں داخل کر کے حلیفوں کی فہرست میں شامل کر لیا جائے۔ جس کے بعد حضور ﷺ اس کو اپنے قبیلے کا دوبارہ سردار مقرر فرما دیتے ہیں۔ جب وہ اپنے لوگوں میں پہنچ کر آپ کی عنایات اور خوش اخلاقی کا حال بیان کرتا ہے تو اس سے ہم کو اندازہ ہوتا ہے کہ نومسلم آپ کی شخصیت سے کس قدر متاثر ہوا کرتے تھے۔ کیونکہ ان حالات کو سن کر قبیلہ مسلمان ہو جاتا ہے۔ اسلام نے ایک مرتبہ پھر یہ اعجاز دکھایا ہے کہ راتوں رات دشمنوں کا ایک پورا گروہ وفادار دوست بن گیا ہے۔ وہی ثمامہ جو چند روز قبل کفار قریش کا حلیف تھا اب ان کا سخت مخالف اور دشمن بن گیا ہے۔ اس کا علاقہ اس راستے سے بالکل متصل واقع ہوا ہے جدھر سے گزر کر کاروان مکہ جایا کرتے تھے۔ اب وہ ان کو روک لیتا ہے۔ جس کی وجہ سے تجارت بالکل ٹھپ ہو کر رہ گئی ہے۔ اہل مکہ کو چند ہی روز میں اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کی ضروریات زندگی میں کمی واقع ہو رہی ہے۔ اور قحط کے آثار نظر آنے لگے ہیں لیکن ثمامہ کا دل ان کی بے کسی پر نہیں پسیجتا۔ بالآخر وہ آنحضرت ﷺ سے درخواست کرتے ہیں کہ ان کی طرف سے ثمامہ کو ہموار کریں۔ آپ ﷺ پر اس کا بڑا اثر ہوتا ہے اور آپ اس کو صرف دو جملے لکھتے ہیں ''میری قوم کا تحفظ کرو' ان کے قافلے گذر جانے دو۔'' جس کا اس کے اوپر فوری اثر ہوتا ہے۔ وہ ان ہدایات کے مطابق

تعرض سے باز آ جاتا ہے اور اہل مکہ فاقہ کشی سے بچ جاتے ہیں۔

بعض لوگوں کے نزدیک حضور ﷺ کی یہ مراعات اور ہر قصور کو معاف کر دینے کی عادت زنانہ پن کی علامت ہے۔ اور وہ اسے آپ ﷺ کی کمزوری پر محمول کرتے ہیں۔ اس قسم کے واقعات بڑھتے جا رہے ہیں حالانکہ عربوں' یہودیوں اور عیسائیوں میں اس کے بالکل برخلاف کارروائیاں ہوتی ہیں۔ آپ جب کوئی مہم سر کرنے کے لیے فوج روانہ فرماتے ہیں' تو امیر لشکر کو واضح طور پر ہدایت کر دی جاتی ہے' کہ جو لوگ لڑائی میں شریک نہ ہوں۔ ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔ عورتوں' بیماروں اور بچوں سے نرمی کا برتاؤ کیا جائے۔ اس بات کی بھی سخت تاکید کی جاتی ہے کہ کسی سے کسی قسم کا دھوکہ یا بدعہدی نہ ہونے پائے۔ نہ کسی بچے کو قتل کیا جائے۔ محمد ﷺ کے طریق کار میں لوگوں کو اسرائیلی پیغمبر کے اس حکم سے بین مغائرت نظر آتی ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ "اب جاؤ اور عمالقہ کو قتل کر دو اور جو کچھ ان کے پاس ہے اس سب کو غارت و برباد کر دو۔ انہیں کوئی رعایت نہ دو بلکہ مردوں' عورتوں' بچوں' گائے' بیل' بھیڑ' بکری' اونٹ اور گدھوں تک کو تلوار کے گھاٹ اتار دو۔"

ایک ایسے شخص سے جو ہمیشہ اس بات پر زور دیتا رہے کہ خدا تک پہنچنے کا راستہ یتیموں کی امداد' مصیبت زدگان کو پریشانیوں سے نجات دلانے' اور غلاموں کی گردن چھڑانے میں مضمر ہے۔ بجز رحم و کرم کے اور کس بات کی توقع ہو سکتی ہے۔ آپ کی ہمدردیاں صرف اپنی قوم یا بنی نوع انسان تک ہی محدود نہیں۔ اس میں ہر قسم کے جانور' چرند و پرند حتیٰ کہ حشرات الارض تک شامل ہیں۔ آپ ﷺ کا فرماں ہے کہ "جانوروں کے بارے میں خدا سے ڈرو' صرف ان پر ہی سواری کرو جو اس لائق ہوں۔ تھکے ماندے ہوں تو ان سے نیچے اتر آؤ۔ سطح ارض پر کوئی چوپایہ یا ہوا میں اڑنے والا کوئی پرندہ ایسا نہیں جو جان نہ رکھتا ہو۔ وہ سب بھی اللہ ہی کی طرف واپس جانے والے ہیں۔"

............﴿2﴾............

آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کو مکہ چھوڑے ہوئے چھ برس ہونے

والے ہیں۔ ان کو حرم کعبہ کے دیدار کا بے انتہا شوق ہے۔ مدینہ میں بالکل امن و سکون ہے۔ گردو پیش کے قبائل عارضی طور پر سہی لیکن فی الحال حملہ کی تیاریاں نہیں کر رہے۔ ایام حج قریب آرہے ہیں اور محمد ﷺ کا خیال ہے کہ اس سلسلہ میں لوگوں کی جو خواہشات ہیں انہیں پورا کیا جائے۔ اسی زمانہ میں یہ آیت نازل ہوتی ہے "تم بلاشبہ مسجد حرام میں بے خوف و خطر داخل ہو گے۔ اللہ کو وہ سب کچھ معلوم ہے جو تمہیں معلوم نہیں۔ پھر اس نے تم کو ایک اور بڑی فتح دے دی۔"

اس وحی پر بڑی خوشی منائی جاتی ہے اور اس کو ایک پیشگوئی سمجھ کر بالعموم یقین کر لیا جاتا ہے کہ اسلام کو ایک نئی کامیابی ہونے والی ہے۔ اس کی خبر مدینہ سے مکہ تک جا پہنچتی ہے۔ مدینہ میں مہاجر اور انصار دونوں خوش خوش حج کی تیاری میں معروف ہو جاتے ہیں۔ تقریباً پورا شہر ہی حج کا عزم کرتا ہے۔ ادھر اہل مکہ کو خوف و ہراس نے آگھیرا ہے۔ ان کے نزدیک یہ سب کچھ حج کے پردہ میں حملہ کی تیاریاں ہیں۔ ان مہینوں میں جنگ و جدل منع ہے۔ لیکن مکہ کے باشندے محمد ﷺ کی طرف سے بے فکر ہو کر نہیں بیٹھ سکتے۔ قریش کی سراسیمگی سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ لیکن آپ کو فتوحات کا خیال تک بھی نہیں ہے اور انتقامی کارروائی تو آپ کی فطرت ہی کے منافی ہے۔ حضور ﷺ تو مکہ صرف اس غرض سے آنا چاہتے ہیں کہ اپنے پیارے وطن کی سیر کریں۔ ان مکانات کو دیکھیں جہاں آپ ﷺ نے زندگی کے دن چین و سکون سے گذارے تھے۔ کوہ صفا اور عرفات پر جائیں اور خانہ کعبہ کا طواف کر کے حجر اسود کو بوسہ دیں۔ اللہ نے آپ سے کامیابی کا وعدہ فرمایا ہے۔ اب آپ اس کے گھر کا طواف کر کے ان نوازشوں اور عنایتوں کا شکر ادا کرنا چاہتے ہیں جو خدائے قدوس آپ ﷺ پر فرماتا رہا ہے۔

اہل مکہ کو آپ کے متعلق جو شبہات ہیں آپ ان کا اپنے ساتھیوں سے ذکر فرماتے ہیں اور مشورہ طلب کرتے ہیں۔ بالآخر یہ طے ہوتا ہے کہ اس سال صرف چند ہی لوگ عازم حج ہوں۔ چنانچہ دو ہزار کی ایک جماعت قربانی کے جانور ساتھ لے کر چل کھڑی ہوتی ہے۔ پیغمبر ﷺ اور آپ کے ہمراہیوں کے پاس بجز ان چھوٹی تلواروں کے

جن کے لے جانے کی ایام حج میں عام اجازت تھی اور کوئی ہتھیار نہیں ہے۔ لیکن سامان حرب کا فقدان' حج کی نیت' قربانی کے جانوروں کی موجودگی قریش کے خوف و ہراس میں کوئی کمی نہیں کرتی۔ ان کا اب بھی یہی خیال ہے کہ محمد ﷺ فتح کی غرض سے نکلے ہیں اور حج کا صرف بہانہ ہی بہانہ ہے۔ اس لیے انہوں نے طے کر لیا ہے کہ خواہ کچھ ہی ہو' انہیں مکہ میں داخلہ کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔ حضور ﷺ کو بھی دل سے اس بات کا یقین نہیں ہے کہ قریش ان نہتے مسلمانوں پر غلبہ پانے کی کوشش نہیں کریں گے۔

مکہ سے تھوڑے فاصلہ پر حدیبیہ کی بلندیوں کے قریب حضور ﷺ مکے کے سفیروں کا انتظار فرماتے ہیں۔ اب دو ہی صورتیں ممکن ہیں یا تو وہ یہیں رک جائیں یا پھر لڑ بھڑ کر اپنا راستہ بنائیں۔ کیونکہ قریش اور ان کے حلیف میدان میں اتر آئے ہیں اور آگے بڑھنے میں مزاحم ہیں۔ ثقیف کا سردار عروہ سب سے پہلے بطور سفیر کے حاضر ہوتا اور بتاتا ہے کہ کل قبائل نے قسمیں کھائی اور حلف اٹھا لیے ہیں کہ مسلمانوں کی افواج کو بلا جنگ وجدل شہر میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ حضور ﷺ ان کو سمجھاتے ہیں کہ ہم صرف حج کی نیت سے آئے ہیں اور ہمارا مقصد لڑنا بھڑنا ہرگز نہیں۔

گفت و شنید کئی روز تک جاری رہتی ہے۔ ہزار طریقہ پر سمجھایا جاتا ہے اور بالآخر عروہ اپنے لوگوں کو ان نوواردوں کا حال بتانے اور جو کچھ اس نے سنا اور دیکھا اس سے آگاہ کرنے کے لیے قریش کی طرف واپس چلا جاتا ہے۔

وہاں پہنچ کر وہ کہتا ہے ''مسلمان محمد ﷺ کے ساتھ جس محبت' وفاداری اور نیازمندی سے پیش آتے ہیں۔ اس نے مجھے دنگ کر دیا۔ ان کی معمولی سی خدمت تک کے لیے لوگ اس طرح دوڑتے ہیں جیسے یہ بھی ان کا کوئی مقدس فریضہ ہے۔ وہ لوگوں کے درمیان ایک دیوتا کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ میں بادشاہوں کے درباروں میں بھی گیا ہوں۔ میں نے خسرو کو اس کے زمانہ عروج میں دیکھا ہے۔ میں نے ہرقل کی اپنے امراء کے درمیان جلوہ گری کا بھی مشاہدہ کیا ہے۔ لیکن جس طرح محمد ﷺ کے ساتھی ان کی عزت کرتے ہیں ایسی تعظیم وتکریم کبھی میری نگاہ سے نہیں گزری۔

اب حضورﷺ کے لیے بھی لازم ہو گیا ہے کہ اپنا ایک سفیر قریش کے پاس بھیجیں۔ حضرت عثمانؓ اس اہم فریضہ کے واسطے منتخب ہوتے ہیں۔ اور جہاں تک ممکن ہو سکا انہیں سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن کامیابی نہیں ہوتی۔ قریش کہتے ہیں ''عثمان! جہاں تک تمہاری ذات کا تعلق ہے' ہم اجازت دے دیتے ہیں کہ حج اور بیت اللہ کا طواف کر لو' لیکن ہم محمدﷺ کو کسی صورت میں بھی داخل نہیں ہونے دیں گے۔''

حضرت عثمانؓ اس پر برہم ہو کر کہتے ہیں ''خدا تعالیٰ مجھ سے ہرگز خوش نہ ہو گا کہ حضورﷺ تو حج نہ فرمائیں اور میں اپنی خواہش پوری کر لوں وہ تو ہمارے سردار ہیں اور سب سے پہلے انہیں کو طواف کرنے کا حق پہنچتا ہے۔''

اس جواب پر کفار قریش کا پارہ چڑھ جاتا ہے اور وہ طیش میں آ کر انہیں زنجیروں میں جکڑ دیتے ہیں۔ اس واقعہ کی خبر جب مسلمانوں تک پہنچتی ہے تو وہ سخت مشتعل ہو جاتے ہیں۔ یہ صورتحال اس وجہ سے بھی ناقابل برداشت ہے کہ ایک قوم دوسرے سفیر کی عزت کرتی ہے۔ چنانچہ سب مسلمان ایک چھتارے درخت کے نیچے جمع ہو کر قسمیں کھاتے ہیں کہ قریش سے ان کی تذلیل کا بدلہ لیں گے۔ اور اسلام کی بقاء کے لیے ایک ایک کٹ مرے گا۔

قریش دیکھتے ہیں کہ جنگ فضول ہی نہیں بلکہ شکست کا موجب بھی بن سکتی ہے اس لیے عثمانؓ کو آزاد کر دیا جاتا ہے اور اب سہیل بن عمرو کے ذمہ یہ کام ڈالا گیا ہے کہ وہ قریش کی طرف سے حضورﷺ کے ساتھ گفتگو کر کے کوئی معقول تصفیہ کرا دیں۔ بالآخر شرائط صلح طے ہو جاتی ہیں اور انہیں معرض تحریر میں لے آیا جاتا ہے۔ اس اہم فریضہ کی خدمات حضرت علیؓ کے سپرد ہیں اور وہ شروع کرتے ہیں۔ ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔'' سہیل فوراً ٹوکتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم اس طرز تحریر سے اتفاق نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ ابتدائی الفاظ ''بسم اللہ اللھم'' ہونے چاہئیں' حضورﷺ اس ترمیم کو منظور فرما لیتے ہیں اور حضرت علیؓ بسم اللہ کی جگہ لکھ دیتے ہیں۔ لیکن جب آپﷺ لکھواتے ہیں کہ یہ معاہدہ محمد الرسولﷺ اور قریش کے درمیان ہے تو پھر ایک اعتراض اٹھ کھڑا ہوتا

ہے۔ سہیل کہتا ہے کہ اگر ہم آپ کو خدا کا رسول ﷺ تسلیم کر لیں تو جھگڑا ہی کیا باقی رہ جاتا ہے۔ آپ کا نام اور ولدیت لکھنا کافی ہو گا۔

حضور ﷺ کے نزدیک اس کی بھی کوئی اہمیت نہیں۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں اچھا جیسی تمہاری مرضی۔ پھر آپ حضرت علیؓ سے فرماتے ہیں لکھو محمد ﷺ بن عبد اللہ اور سہیل بن عمر کے درمیان جو معاہدہ ہوا اس کی شرائط حسب ذیل ہیں۔ اس کے بعد شرائط صلح لکھواتے ہیں۔

اوّل یہ کہ مسلمانوں اور قریش کے درمیان صلح رہے گی اور اس کا اطلاق ان قبائل پر ہو گا جو فریقین کے حلیف ہیں۔ اور یہ معاہدہ دس سال تک برقرار رہے گا۔ دوئم جو قبائل اب تک غیر جانبدار ہیں انہیں اختیار ہو گا کہ کسی جانب بھی شریک ہو جائیں۔ تیسرے محمد ﷺ اور ان کے ساتھی فوراً مکہ کے علاقے سے نکل جائیں گے۔ چوتھے مسلمانوں کو اجازت ہو گی کہ اگلے سال القدر کے مہینے میں مکہ معظمہ کی زیارت کے لیے آ سکیں گے۔ پانچویں جب مسلمان حدود مکہ میں داخل ہوں تو بغیر ایک تلوار کے جو نیام میں محفوظ رہے گی' کوئی دوسرا ہتھیار نہ لائیں گے۔ چھٹے مسلمان مکہ میں صرف تین روز قیام کریں گے اور اس دوران کسی کو آمادہ یا مجبور نہ کر سکیں گے کہ اپنی مرضی کے خلاف مکہ چھوڑ کر چلا جائے۔

حضور ﷺ کے صحابہ بالخصوص حضرت عمرؓ جنہوں نے مدینہ میں نازل ہونے والی وحی سے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ ہمیں قریش پر ایک اور فتح ہونے والی ہے' حالات کے اس طرح پلٹا کھانے پر سخت مایوسی کا شکار ہیں۔ بعض لوگ تو حالت یاس میں یہاں تک کہنے لگے ہیں کہ خدا نے تو ہماری قسمت میں فتح لکھ دی تھی لیکن حضور ﷺ نے اس کو کالعدم کر دیا۔ کم فہم اس سے بھی کچھ زیادہ ہی کہہ رہے ہیں۔

آنحضرت ﷺ لاکھ فرماتے ہیں کہ واپسی سے پہلے جانوروں کی قربانی دے دو۔ مگر کوئی ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ یہ خاموشی ان کے جذبات کی آئینہ داری کر رہی ہے۔ محمد ﷺ خاموش ہو جاتے ہیں وضو کرتے' سر منڈواتے اور چھری ہاتھ میں لے کر ان

اونٹوں کی گردنیں کاٹنی شروع کر دیتے ہیں جنہیں وہ اپنے ہمراہ لائے ہیں۔ آپ ﷺ کی مثال پر عمل نہ کرنا سنت نبوی کے منافی ہے۔ صحابہ کو اپنے طرز عمل پر شرمندگی کا احساس ہوتا ہے اور جلد ہی زمین قربانیوں کے خون سے لالہ زار بن جاتی ہے۔ مسلمانوں میں از سر نو جوش وخروش پیدا ہو جاتا ہے۔ پیغمبر ﷺ مدینہ واپس لوٹتے ہیں۔ لیکن آپ کی پیشانی پر نہ کوئی بل ہے نہ شکن۔ کیونکہ اس وقت تک مسلمانوں کو اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہے۔

فتح اور مکہ میں داخلہ کا وعدہ ضرور کیا گیا تھا۔ لیکن اس سے یہ کہیں ظاہر نہ ہوتا تھا کہ اس کا تعلق اس خاص موقع سے ہے۔ اب صلح حدیبیہ نے اسکو اگلے سال کے لیے معین کر دیا ہے جس سے یقین ہو جاتا ہے کہ وحی کے ذریعے دی جانے والی پیشگوئی صحیح ہے۔ ویسے بھی قرآن حکیم کا کوئی پیشگوئی یا وعدہ ایسا نہیں جو پورا نہ ہوا ہو۔ پھر انہیں اللہ کے کلام پر کیوں شبہ ہو؟

............﴿3﴾............

اس سخت سزا کے بعد بھی جب سے بنو قریظہ دوچار ہو چکے ہیں۔ یہود کے قبائل اب تک اپنی ریشہ دوانیوں سے باز نہیں آتے' یہ بات تو کھل کر سامنے آ گئی ہے کہ انہیں مسلمان تو کبھی نہیں بننا اور نہ ان پر کسی معاملہ میں اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ اب بھی ان کے قبضہ میں کئی مستحکم قلعے ہیں اور ان کا رویہ منافقانہ اور مدافعانہ ہے۔ اس لیے مدینہ کے تحفظ کو مدنظر رکھتے ہوئے حضور ﷺ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ان کے خلاف ایک عام مہم ناگزیر ہے۔ وہ اگر نہ مسلمان ہوتے ہیں' نہ دوست بنتے ہیں تو پھر ان کی قسمت میں غلامی ہی ہے۔

پیغمبر ﷺ اب اس بے سرو سامان فوج کے سربراہ نہیں رہے جو بدر میں لڑی تھی۔ نہ اس غیر منظم لشکر کے سپہ سالار ہیں جو اُحد میں بے راہ روی کی مرتکب ہوئی تھی۔ اب آپ ﷺ کے ماتحت ایک ایسی فوج ہے جو تعداد کے لحاظ سے بھی معقول کہی جا سکتی ہے۔ تربیت یافتہ بھی ہے اور اسلحہ سے بھی بخوبی مزین ہے۔ آپ ﷺ نے خود اپنی باطنی

صلاحیتوں اور صبر و سکون سے کام لیتے ہوئے سپاہیوں کو فنونِ حرب اور نقل حرکت کی تعلیم دی ہے۔ انہیں بتایا ہے کہ کب حملہ کرنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی ہتھیاروں کے صحیح استعمال اور میدانِ جنگ کی چالوں کو بھی بخوبی ذہن نشین کرا دیا ہے۔ آپ ﷺ نے اس سلسلہ میں پابندیاں ان پر عائد کی ہیں۔ ان سب کو پہلے اپنے اوپر آزما لیا ہے۔ ان کی محنت و جفاکشی' ان کی خوراک اور ان کی نیند' سب کچھ اس تجربہ کے ماتحت ہی معین کی گئی ہے' اور اسی کا نام فوجی تنظیم ہے اور انہیں سبق دیا گیا ہے کہ بغیر اس کے دشمن کو کمزور یا حقیر سمجھا جائے' اپنے اعلیٰ مقصد' اپنی ہمت و جرأت اور اپنے ارباب حل و عقد پر کلی اعتماد رکھیں۔ اب ان سب باتوں کو گرہ میں باندھ کر پیغمبر ﷺ اس فوج کے ذریعہ یہودیوں کے مسئلہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا چاہتے ہیں۔

چنانچہ آپ چار ہزار پیادہ فوج اور دو ہزار سواروں کے جلو میں مدینہ سے نہایت سرعت کے ساتھ اس عزم کو لے کر نکلتے ہیں کہ یہود کی طاقت کا قلع قمع کر کے ہی واپس لوٹیں گے۔ اگلے چند مہینوں تک اسلامی فوج مستقلاً یہودیوں سے نبرد آزما رہتی ہے۔ پہلے ان کا ایک قلعہ سر ہوتا ہے پھر دوسرا' پھر تیسرا اور اسی طرح فتوحات کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ مسلمان صرف فتح کرنا جانتے ہیں۔ ان کے ہتھیاروں کے آگے قلعے ریت کے گھروندے ثابت ہوتے ہیں۔ جو مدافعت کرتے ہیں انہیں مسلمانوں کے تیر سینکڑوں کی تعداد میں چھید کر رکھ دیتے ہیں۔ اہل مدینہ کو بے شمار مال غنیمت اور املاک حاصل ہو چکی ہے۔ ناعم' فدک' وادی القریٰ' سلام' قموص' نطاۃ اور خیبر کے مضبوط و مستحکم قلعے یا تو خود ہی ہتھیار ڈال کر باجگذار بن گئے ہیں یا پھر انہیں بزور شمشیر فتح کیا جا چکا ہے۔ لیکن ان سب میں خیبر نے بڑی سخت مزاحمت کی ہے۔ یہودیوں کا یہ قلعہ جو بلندی پر واقع اور سنگلاخ چٹانوں سے محفوظ ہے۔ ان کا نادر ترین جوہر ہے اور تمام عرب اسے ناقابل تسخیر سمجھتا ہے۔ کئی روز تک مسلمانوں کی حربی طاقت اور استطاعت کا امتحان ہوتا رہتا ہے۔ پیغمبر ﷺ اپنے خیمہ میں بیٹھے سوچ رہے ہیں کہ اس کو کس طرح سر کیا جائے۔ مختلف صحابہ متضاد تجاویز پیش کرتے ہیں لیکن صرف حضرت ابوبکرؓ ہمت کر کے اسلام کا

جھنڈا اس کی فصیل پر گاڑنے کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ بڑی جرأت اور بہادری سے حملہ کرتے ہیں' لیکن ناکام لوٹنا پڑتا ہے۔ حضرت عمرؓ کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آتا ہے۔ لیکن قسمت علیؓ کا ساتھ دیتی ہے۔ کئی محاربوں میں انہوں نے بہت سے یہودیوں کو اپنی تلوار کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ بعض کو فصیل سے نیچے دھکیل کر ہڈی پسلی سرمہ کر دی ہے۔ اور چند کو ایسے کاری زخم لگائے ہیں کہ ان کا مندمل ہونا مشکل نظر آ رہا ہے۔ انہوں نے حارث کو خاک و خون میں لتھیڑ کر رکھ دیا اور قلعہ کے گورنر مرحب کو بھی اپنے آباؤ اجداد سے ملنے آخری سفر پر روانہ کر دیا۔ بالآخر خیبر بھی حضرت علیؓ کے ہاتھوں فتح ہو جاتا ہے' جس کے نتیجے میں اہل اسلام کو بے شمار مال غنیمت حاصل ہوتا ہے۔ شرائط صلح کے لحاظ سے یہودیوں کو اپنی پیداوار کا نصف حصہ بطور خراج مدینہ کی حکومت کو ادا کرنا طے پاتا ہے اور اس کے صلہ میں انہیں قید و بند اور غلامی کی زندگی سے نجات مل جاتی ہے۔

یہ فتح اس لحاظ سے بھی قابل ذکر ہے کہ اس سلسلے میں حضورﷺ کی شادی ایک حسین و جمیل یہودن صفیہ سے ہو جاتی ہے۔ ان کا شوہر جنگ میں ہلاک ہو چکا ہے اور وہ خود مسلمانوں کی قید میں آ گئی ہیں۔ جب شرائط صلح طے ہو چکیں تو یہودیوں نے مسلمانوں سے تعلقات استوار کرنے کی غرض سے یہ تجویز پیش کی کہ حضورﷺ ان کو اپنی مناکحت میں لے لیں۔ خود صفیہؓ کی بھی یہی خواہش ہے۔ کیونکہ جس دن سے وہ قیدی بنا کر آپ کے سامنے پیش کی گئی حضورﷺ ان کی نظروں میں کھب گئے ہیں۔ آپ میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جن کو ایک سمجھدار عورت اپنے خاوند میں تلاش کرتی ہے۔ جسمانی حسن' معاملات میں صدق و صفائی' ہمعصروں میں عزت و توقیر' انصاف' استقامت اور ان سب سے بڑھ کر عفو اور رحمدلی۔ اور اپنی اس خواہش کے آگے انہوں نے اپنا دین بھی تج دیا اور مسلمان ہو گئیں ہیں۔ کسی صاحب اقتدار مرد اور ایک قیدی عورت کے مابین اس شان و شوکت یا خوشی و انبساط کی شادی کا حال تاریخ کے صفحات پر تو کہیں نظر نہیں آتا۔ لیکن اس سلسلہ میں ایک بات البتہ بڑی انوکھی ہوئی ہے وہ یہ کہ مہمانوں سے

کہا گیا ہے کہ وہ اپنا اپنا کھانا ساتھ لائیں۔ کیونکہ دولہا کو مالِ غنیمت سے کوئی حصہ نہیں ملتا اور ان کی مالی حالت اتنی بڑی دعوت کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ لیکن پھر بھی دعوت بڑی پُرمسرت ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ صفیہ کے حسن کی داستان تمام عرب میں مشہور ہے اور خیبر کی فتح خود ایسا واقعہ ہے جس پر فاتحین جس قدر بھی ناز کریں، کم ہے۔

صفیہؓ دنیا کے اس عظیم فاتح کے خیمے میں رخصت ہو کر آ گئیں ہیں اور نازاں ہیں کہ ان کی قسمت کے دروازے کھل گئے ہیں۔ چند روز بعد حارث کی بیوہ اور مرحب کی بہن نے جو دونوں خیبر کے محاصرہ میں اپنے اپنے شوہروں سے ہاتھ دھو چکی تھیں۔ حضورﷺ کے اعزاز میں دعوت دی۔ جب سب مہمان جمع ہو گئے تو زینب نے ان کے سامنے ایک بھنا ہوا دُنبہ لا کر رکھا۔ حضورﷺ نے اس کا پہلا ہی لقمہ لیا تھا کہ طبیعت میں استکراہ پیدا ہوا اور آپ نے یہ کہہ کر اسے تھوک دیا کہ اس میں زہر کی آمیزش ہے۔ اس احتیاط کے باوجود بھی اس کا اثر ہو گیا اور کئی روز تک طبیعت ناساز رہی۔ لیکن آپﷺ کے ایک صحابی بشرا بن براء آپ کے ہاتھ ڈالنے سے قبل ہی اس کا ایک نوالہ کھا چکے تھے۔ ان کی حالت زیادہ خراب ہوئی اور انہوں نے نہایت تکلیف سے جان دی۔ مروّجہ قانون کے بموجب بشر کے خاندان والوں نے زینب کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ جب ان کے گلے پر چھری رکھی گئی تو وہ بہت چیخی چلائیں۔ لیکن اس وقت تک گلا کٹ چکا تھا خون جاری ہو چکا تھا اور بہتا ہوا دہلیز تک پہنچ چکا تھا۔ خون کا بدلہ خون سے لیا جا چکا تھا اب رحم کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

……………﴿4﴾……………

صلح حدیبیہ جس پر حضرت عمرؓ اور بعض دوسرے جلیل القدر صحابہ اتنے مایوس ہوئے تھے۔ بڑی کامیابیوں کا پیش خیمہ ثابت ہو رہی ہیں۔ عرب کے شہروں میں مدینہ کبھی اتنا نامور نہ ہوا تھا جتنا آج ہے۔ اور وہاں کے حکمران کا شمار اب دنیا کے بڑے بڑے فرمانرواؤں میں ہونے لگا ہے۔ یہودیوں کے خلاف مہمات نے آپ کے نام اور ساتھ ہی اسلام کی عظمت میں چار چاند لگا دیے ہیں۔

کئی سال ہوئے جب آپ ﷺ مکہ میں تشریف رکھتے تھے۔ اس وقت یہ بات آپ پر واضح کر دی گئی تھی کہ اسلام قریش ہی کی اصلاح کے واسطے نہیں آیا۔ بلکہ اس کا مقصد تمام دنیا کو ہدایت دینا اور نور ایمان سے منور کر دینا ہے۔ اسلام کا خدا ابتداء ہی سے رب العٰلمین یعنی دو جہان کا مالک ہے۔ وہ رب الناس' ملک الناس' الٰہ الناس یعنی تمام انسانوں کا پروردگار' بادشاہ اور حاجت روا ہے۔ صرف یہودیوں' عیسائیوں یا مسلمانوں ہی کا نہیں بلکہ تمام مخلوق اور ہر ذی روح شے کا خدا وہی ہے۔ اس لیے جو پیغام آپ پہنچا رہے ہیں جو تبلیغ آپ فرما رہے ہیں وہ کسی محدود طبقہ یا خطہ ارض کے لیے نہیں ہے۔ لیکن ابھی تک اس کا موقع نہیں مل سکا کہ آپ اس پیام کو اپنے اردگرد کے علاوہ دوسروں تک بھی پہنچا سکیں۔

اب جو اسلام کو سکون و اطمینان میسر آیا ہے تو پیغمبر ﷺ محسوس فرماتے ہیں کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ اس پیام کو دوسری قوموں تک پہنچا دیا جائے۔ چنانچہ ایک جمعہ کے خطبہ میں آپ ﷺ اعلان فرماتے ہیں کہ ان کا ارادہ غیر ملکی درباروں میں سفیر بھیجنے کا ہے اور پھر نمازیوں سے دریافت فرماتے ہیں کہ اس کام کے واسطے کون لوگ موزوں ہوں گے۔ صحابہ میں اس تجویز کا پُر جوش خیر مقدم ہوتا ہے۔

ایران کے بادشاہ خسرو کو عبداللہ بن خدافہ ایک نامہ مبارک پیش کرتے ہیں۔ جس پر محمد رسول اللہ ﷺ کی مہر ثبت ہے۔ بادشاہ ایک مترجم کو بلواتا اور خط سننا شروع کر دیتا ہے۔ جس کی ابتداء ان الفاظ سے ہوتی ہے۔ ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف سے خسرو شہنشاہ ایران کے نام۔'' خسرو اس کو اپنی تحقیر سمجھتا ہے اور بھڑک اٹھتا ہے۔ غصہ سے دیوانہ خط پرزے پرزے کرتا اور فرش پر بکھیر دیتا ہے۔ جب عبداللہ واپس آتے اور حضور ﷺ سے یہ واقعہ بیان کرتے ہیں تو آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ ''اللہ اس کی سلطنت کو بھی اسی طرح پارہ پارہ کر دے گا۔ جس طرح اس نے میرے خط کو چاک چاک کر ڈالا۔''

خسرو نے صرف اس اظہار ناراضگی پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نے باذان کو

جو عرب میں اس کا نائب ہے لکھا کہ اس شخص کو جو اپنے آپ کو پیغمبر ﷺ بتاتا ہے گرفتار کر کے فوراً ہمارے دربار میں بھیج دو۔ چنانچہ عبداللہ کی واپسی کے کچھ ہی عرصہ بعد باذان کے آدمی مدینہ پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر وہ خوف سے تھر تھر کانپنے لگتے ہیں اور ان کو علم ہو جاتا ہے کہ عرب میں آپ ﷺ کی قدر و منزلت کا کیا حال ہے۔

آپ ﷺ ان لوگوں سے فرماتے ہیں "باذان سے کہہ دینا کہ میری مملکت اور میرا دین جلد ہی خسرو پر غالب آجائے گا۔ اس سے کہنا کہ میں اسے بھی اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔"

ایلچی یہ پیام لے کر باذان تک پہنچتے ہیں۔ لیکن اس دوران میں اسے اطلاع ملتی ہے کہ جس طرح خسرو نے اپنے باپ ہرمز کو قتل کر دیا تھا۔ اسی طرح وہ اپنے بیٹے شیرویہ کے ہاتھوں عدم آباد پہنچ چکا ہے۔ چنانچہ اب باذان کو آزادی حاصل ہے کہ وہ جو چاہے راستہ اختیار کرے اور وہ حضور ﷺ کی دعوت قبول کر کے مسلمان ہو جاتا ہے۔

ہرقل دوسرا فرمانروا ہے جسے حضور ﷺ اپنا نامہ مبارک ارسال فرماتے ہیں۔ وحیہ کلبی پیغمبر ﷺ کا یہ خط خود لے کر حاضر دربار ہوتے ہیں۔ قیصر اسے بڑے اہتمام سے لیتا اور پڑھوا کر سنتا ہے۔ تحریر ہے۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم' محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف سے شہنشاہ ہرقل کے نام۔ جو شخص ہدایت کے راستے پر چلنے والا ہو اس پر سلامتی ہو۔ میں تمہیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اسلام قبول کرو تو تم کو خدا دوگنا اجر دے گا اور اگر تم نے اسے قبول نہ کیا تو اہل ملک کا گناہ بھی تمہارے سر ہوگا۔ اے اہل کتاب ایک بات پر متفق ہو جاؤ کہ ہم سوائے خدائے واحد کے کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں اور اگر تم اسلام کی دعوت قبول نہیں کرتے تو کم از کم اتنا کرو کہ مدینہ کی اسلامی سلطنت کو تسلیم کر لو۔"

خط پڑھے جانے کے بعد ہرقل اس نامہ مبارک کو بڑے اہتمام کے ساتھ گدے پر رکھ دیتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ مسلمانوں کے سفیر کو عزت و احترام کے ساتھ

بطور شاہی مہمان ٹھہرایا جائے۔ چنانچہ واپسی تک وحیہ کلبیؓ اس مہمان نوازی کا لطف اٹھاتے رہے جس کے واسطے قیاحرہ مشہور ہیں۔ اس وقت ہرقل کا ستارہ عروج پر ہے۔ اس نے سستی اور کاہلی کا غلام ہونا منظور نہیں کیا اور اپنی رعایا کے دکھ درد میں ہر طرح شریک ہے۔ جوانی کی بے فکریاں خواب پارینہ ہو چکی ہیں۔ روما اور ہرقل دونوں کی شاندار فتوحات' کامیاب حملوں اور بے شمار مال غنیمت اکٹھا ہو جانے سے اس کی شان و شوکت اور اقتدار میں بے انتہا اضافہ ہو گیا ہے۔ اگر وہ اسلام اختیار کر لے تو اس دین کو دنیا کے بڑے مذاہب میں شمار کیا جانے لگے گا۔ لیکن ہرقل کو اس مسئلہ پر غور کرنے کے لیے وقت درکار ہے۔ اس لیے وہ بعض قیمتی تحائف کے ساتھ وحیہ کلبیؓ کو واپس بھیج دیتا ہے۔ اس دوران میں وہ ابوسفیان سے جو ایک کاروباری سفر پر غزہ آئے ہوئے ہیں۔ پیغمبر ﷺ اور اسلام کے متعلق تفصیلات دریافت کرتا ہے اور انہیں باوجود حضور ﷺ کی مخاصمت کے سچی بات بتانی پڑتی ہے کہ "جی حضور! اُن کے تابعین میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور آج تک کسی نے ان کو نہیں چھوڑا۔"

جس زمانہ میں وحیہ کلبیؓ یونانی دربار میں پیش ہو رہے تھے۔ حاطبؓ قعوقونس یعنی مصر کے قبطی بادشاہ کے پاس اسی غرض سے پہنچتے ہیں۔ قعوقوس کو یونانیوں سے نفرت ہے۔ حالانکہ وہ انہیں کے ماتحت مصر کا فرمانروا ہے۔ لیکن وہ علانیہ مسلمان ہو کر نئی مصیبتیں سر لینے پر تیار نہیں۔ وہ آپ ﷺ کے سفیر کا پورا احترام کرتا ہے اور دعوت اسلام کے جواب میں لکھتا ہے "محمد ﷺ بن عبد اللہ کے نام قعوقوس رئیس قبطہ کا سلام علیک۔ میں نے وہ خط پڑھا جس میں آپ نے مجھے اسلام لانے کی دعوت دی ہے! اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے اور میں ایسا ہی کر رہا ہوں۔ مجھے اس قدر علم تھا کہ ایک پیغمبر مبعوث ہونے والا ہے لیکن میں سمجھتا تھا کہ وہ شام میں پیدا ہو گا۔ بہر حال میں آپ ﷺ کے پیام رساں کی وہی عزت کرتا ہوں جو سفیروں کی ہوا کرتی ہے۔ وہ آپ کی خدمت میں میری طرف سے دو قبطی لڑکیاں پیش کریں گے۔ جن کا تعلق بہت اونچے گھرانوں سے ہے۔ اس کے علاوہ میں آپ کے واسطے ایک سفید خچر' اپنے ملک کا بنا ہوا

کچھ کپڑا اور اعلیٰ قسم کا شہد اور مکھن بھیج رہا ہوں۔

حبش کی سفارت کو جیسی کہ پہلے ہی سے توقع کی جا سکتی تھی۔ سب سے زیادہ کامیابی ہوتی ہے۔ مسلمان مہاجروں نے یہاں اسلام کے لیے پہلے ہی سے زمین تیار کر رکھی ہے۔ اس لیے جب حضور ﷺ کا ایلچی دربار میں پہنچتا ہے تو اس کا بڑی شان و شوکت سے استقبال کیا جاتا ہے۔ اس کو دربار میں اونچی جگہ ملتی ہے۔ اس کی ادنیٰ سے ادنیٰ خواہش کا احترام کیا جاتا ہے۔ شہنشاہ ایک مخصوص دربار منعقد کرتا اور نامہ مبارک کو بآواز بلند پڑھوا کر سنتا ہے جس میں تحریر ہے۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف سے نجاشی شاہ حبش کو سلام علیک۔ حمد خدائے لایزال' واحد و قدوس و رب العٰلمین۔ میں اس کی شہادت دیتا ہوں کہ حضرت عیسیٰؑ بن مریم روح اللہ ہیں۔ وہ کنواری مریم کے فرزند ہیں۔ انہیں خدا تعالیٰ نے اپنی روح اسی طرح پھونکی جس طرح حضرت آدمؑ میں پھونکی تھی۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں اس کا محض ایک پیامبر ہوں۔ میرا کام صرف یہ ہے کہ میں آپ کو اپنی طرف بلاؤں تا کہ آپ خدائے وحدہٗ لاشریک کو ماننے لگیں۔ جس کا کوئی ثانی نہیں جس کے قبضہ میں زمین و آسمان کی تمام مخلوق ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ نصیحت کارگر ہوگی۔"

شہنشاہ نامہ مبارک کو اپنی آنکھوں سے لگاتا' تخت سے نیچے اترتا اور تمام دربار کے سامنے جس میں جعفرؓ بھی شامل ہیں۔ اسلام کا کلمہ پڑھتا ہے۔ اور پھر حضورؐ کے خط کا جواب اس طرح لکھواتا ہے۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں نجاشی سلام پیش کرتا ہے۔ اسلام علیکم و رحمتہ اللہ۔ خدا آپ پر درود بھیجے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ سوائے اللہ کے کوئی معبود نہیں۔ جس نے مجھے اسلام کا راستہ دکھایا۔ یا رسول اللہ میں نے آپ کا نام مبارک پڑھا۔ آپ ﷺ نے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق جو تحریر فرمایا ہے وہ صحیح ہے میرا ایمان ہے کہ آپ نبی برحق ہیں۔ میں نے جعفرؓ اور درباریوں کے سامنے کلمہ توحید پڑھا ہے اور میں اپنے بیٹے کو آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں۔ لیکن اگر آپ کا حکم ہوگا تو میں خود

بیعت کرنے اور آپ کی تعلیمات سننے کے واسطے حاضر ہو جاؤنگا۔"

بنو غسان کے عیسائی فرمارواشرجیل بن عمرو کا جواب بہت زیادہ نامعقول ہے۔ یہ خاندان وسطی عرب کے علاقہ میں آباد ہے اور ان کی ریاست کے حدود شام تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس نے آپ کے نامہ مبارک کا جواب تمسخرانہ انداز میں لکھا۔ اس کے الفاظ یہ ہیں "میں اس کا جواب خود وہاں پہنچ کر دوں گا۔" واپسی کے دوران حضور ﷺ کے ایلچی کو بھی غالباً اس کے اشارہ سے قتل کر دیا گیا۔ حضور ﷺ کو جب اس کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے بنو غسان سے بدلہ لینے کا عہد فرمایا۔ یمن کے بادشاہ ہوازن کا جواب بھی کچھ اس طرح کا اشتعال انگیز ہے "محمدؐ سے کہہ دینا کہ اگر انہوں نے دوبارہ مجھ سے اسلام کی بات کی تو میں جنگ کے شعلے مدینہ تک پہنچا دوں گا۔" اس پر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں اس کو کبھی اس بات کی اجازت نہیں دوں گا۔

بحرین کے بادشاہ نے جس کی حکومت خلیج فارس کے کنارے کنارے دور تک پھیلی ہوئی ہے بڑا معقول طریقہ اختیار کیا ہے۔ وہ یہ کہ معہ اپنی تمام رعایا کے دائرہ اسلام میں شامل ہو گیا ہے۔

اس کے علاوہ اسلام دوسری سمتوں میں بھی فتوحات سے ہمکنار ہو رہا ہے۔ بعض بڑے کوردہ، دور دراز، غیر متوقع گوشوں کے لوگ بھی جوق در جوق آکر مسلمان ہو رہے ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں ہستی خالد بن ولید کی ہے۔ جس کی وجہ سے مکہ میں تہلکہ مچ گیا ہے۔ قریش کے کسی ایک شخص کا اسلام لانا فی نفسہ کوئی اہم واقعہ نہیں۔ کیونکہ مسلمانوں کی تعداد کا ایک بڑا حصہ قریشی النسل ہی ہے۔ لیکن ولید کے بیٹے خالد کی بالکل ایک جداگانہ حیثیت ہے۔ خود انہوں نے ذاتی طور پر دلیری، شجاعت اور جوانمردی کے بڑے کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ فاتح اُحد ہونے کے باعث انہیں بڑا کامیاب اور ہونہار فوجی جنرل سمجھا جاتا ہے اور ان سے قوم کی بہت سی اُمیدیں وابستہ ہیں۔ وہ ایک عرصہ تک اسلام دشمنی میں بڑا نمایاں کردار بھی ادا کرتے رہے ہیں۔ لیکن اب وہ کون سی شے ہے جس نے انہیں اپنے دین اور باپ دادا کے بتوں سے برگشتہ کر دیا ہے؟

کیا یہ الوالعزمی کے جذبات ہیں؟ کیا وہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں میں شامل ہو کر انہیں اپنی قابلیت کے اظہار کا موقع مل جائے گا؟ کیا وہ دنیاوی طمع کے سبب سے ایسا کر رہے ہیں اور اہل اسلام نے ان سے کسی بڑے عہدے کا وعدہ کر لیا ہے؟ یہ سب بازاری باتیں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ بعض موقعوں پر مرد بوڑھی عورتوں کو مات کر دیتے ہیں۔ اس قسم کا یہ بھی ایک واقعہ ہے لیکن نہیں۔ خالد خود اپنی سوجھ بوجھ کو کام میں لا کر' اونچ نیچ سوچ کر مسلمانوں کی صف میں شامل ہوئے ہیں۔ جس طرح ان سے قبل حضرت عمرؓ اسلام لائے تھے۔ یا اور بہت سے اسلام لا چکے ہیں۔ انہیں نہ کسی عہدہ کی تمنا ہے نہ وہ کوئی رعایت چاہتے ہیں۔ انہوں نے تو اپنے دل کی آواز پر لبیک کہا ہے۔ اس میں نہ کسی حجت کی گنجائش ہے نہ کسی دلیل کی ضرورت۔ کسی زمانہ میں وہ بڑے زبردست کٹر صابی تھے۔ اب توبہ کر کے وہ اتنے ہی باعمل مسلمان بن سکتے ہیں۔ جن قابلیتوں اور صلاحیتوں کے ساتھ وہ اب تک کفار کی خدمت کر رہے تے ہیں۔ اسی طرح اب اسلام کے واسطے سینہ سپر بن جائیں گے۔

خالدؓ نے ایک مثال قائم کر دی ہے۔ اس کے بعد دوسرے بھی اسی راستہ پر گامزن ہونے لگے ہیں۔ وہی عمر بن العاص ہیں جنہوں نے دو مرتبہ قریش کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف حبشہ میں وکالت کی تھی۔ خانہ کعبہ کے مجاور عثمان بھی انہیں کا ساتھ دے رہے ہیں۔ اب کون کہہ سکتا ہے کہ ان کے سامنے کوئی دنیاوی مفاد تھا۔ انہیں تو ایک بڑا عہد ملا ہوا تھا۔ عزت تھی۔ چڑھاوے چڑھتے تھے۔ یہ سب انہوں نے ایک معمولی حیثیت کے مسلمان بننے کی خاطر ترک کر دیا۔ جہاں ظاہر ہے کہ یہ تمام چیزیں انہیں میسر نہیں ہوسکتیں۔

اہل اسلام ان لوگوں کے اپنے زمرہ میں آجانے سے بے حد خوش ہیں۔ کیونکہ اب انہیں ایک زریں مستقبل سامنے نظر آنے لگا ہے۔

............﴿5﴾............

ہم دیکھ چکے ہیں کہ ایران کے فرمانروا خسرو نے حضورﷺ کا نامہ مبارک کس

طرح چاک کر کے اس کے پرزے حقارت سے فرش پر بکھیر دیئے اور سفیروں سے کیسا نا معقول سلوک کیا۔ حارث کے ساتھ بصرہ کے حکمران نے جو برتاؤ کیا اور غداری سے انہیں قتل کرایا اس کا بیان بھی اوپر آ چکا ہے۔ جب یہ خبر حضور ﷺ تک پہنچی تو آپ نے تہیہ کر لیا کہ اس خون کا قصاص لیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں جو دشواریاں اور خطرات مضمر تھے ان کا آپ کو کما حقہٗ علم تھا۔ خصوصاً یہ کہ آپ کو اندیشہ تھا کہ بازنطینی حکومت سے مخاصمت پیدا ہو جائے گی۔ اور تاریخ کا یہ پہلا واقعہ ہے کہ کسی عرب سلطنت نے یونانی حکومت سے ٹکر لینے کی جرأت کی ہو۔ کس کو علم ہے کہ اس معمولی سی چنگاری سے کہاں کہاں آگ بھڑک اٹھے! اور پھر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ آتش سوزاں تمام ایشیاء کو اپنی گرفت میں نہ لے لے اور کسریٰ کی وسیع سلطنت خاکستر کا ڈھیر نہ بن جائے۔

لیکن خطرات کا خوف حضور ﷺ کے عزائم میں حائل نہیں ہو سکتا۔ آپ ﷺ تین ہزار سواروں پر مشتمل ایک فوج اپنے متبنیٰ زید کی سرکردگی میں شام کے علاقہ موتہ کی طرف روانہ فرماتے ہیں تاکہ وہاں کے معاملات روبراہ ہو جائیں۔ یعنی پہلے انہیں اسلام لانے کی دعوت دی جائے اور اگر وہ اس پر راضی نہ ہوں تو تلوار دونوں کے درمیان فیصلہ کر دے۔ بعض زعیم اہل قریش بڑبڑاتے ہیں کہا انہیں ایک آزاد شدہ غلام کے ماتحت بھیجا جا رہا ہے۔ لیکن اسلام نے آزاد اور غلام کی قیود حرف غلط کی طرح مٹا دی ہیں۔ حضور ﷺ نے اس خیال سے کہ اگر سپہ سالار جنگ میں کام آ جائے ان کے جانشین بھی اس طرح مقرر فرمائے ہیں کہ زید کی شہادت کے بعد جعفر بن ابو طالبؓ اور اگر وہ بھی جام شہادت نوش کر لیں تو عبداللہ بن رواحہؓ امیر لشکر ہوں گے۔

شام کی سطح مرتفع میں موتہ کے مقام پر مدینہ کی فوج کا یونانی' رومی افواج سے پہلا مقابلہ ہوتا ہے۔ زید کی فوج تپتے ہوئے صحرا میں سفر کرنے کے بعد تھک بھی گئی ہے اور یہ بھی دیکھتی ہے کہ دشمن کے لشکر سے تعداد میں بھی بہت کم ہے۔ پھر بھی ایک لاکھ سپاہیوں کے مقابلے میں ان تین ہزار فدائیوں کی ہمتیں جوان رہتی ہیں اور وہ لڑائی کے واسطے اس طرح مستعد ہیں جیسے شکاری شکار پر ٹوٹ پڑنے کے لیے بے چین ہوتے

ہیں۔ ان کے سامنے بجز فتح یا شہادت کے تیسرا کوئی دروازہ نہیں ہے۔ انہیں دونوں طرف فائدہ ہی فائدہ نظر آتا ہے۔ کامیاب ہوئے تو غازی قتل ہوئے تو شہید۔ اس لیے وہ بھوکے شیر کی طرح دشمن پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔

جنگ طول کھینچ رہی ہے اور خون آشام ہوتی جا رہی ہے۔ زید آخر تک لڑتے اور اسلامی جھنڈے کو مضبوطی سے تھامے رہتے ہیں۔ لیکن شہید ہو جاتے ہیں۔ جس کے ساتھ ہی جعفرؓ فوراً ان کی جگہ لے کر جھنڈا سنبھال لیتے ہیں۔ ہر طرف نیزوں کی بارش ہو رہی ہے۔ تلواریں دھوپ میں چمک رہی ہیں۔ زخمی سپاہیوں کی چیخ پکار اور گھوڑوں کی کراہ کے ساتھ اسلحہ کی جھنکار نے مل کر عجیب قسم کا شور برپا کر رکھا ہے۔ زمین خون کے فواروں سے گلگوں ہو رہی ہے۔ اسلام کا جھنڈا جس مضبوط ہاتھ میں ہے اس پر یکا یک پیچھے سے تلوار کی ایک کاری ضرب پڑتی ہے اور وہ کٹ کر دور جا گرتا ہے۔ لیکن جعفرؓ کچھ پرواہ نہیں کرتے اور اسے فوراً دوسرے ہاتھ میں تھام لیتے ہیں۔ دشمن اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کرتے ہیں۔ اور اسے بھی قطع کر دیتے ہیں۔ دونوں کٹے ہوئے بازوؤں سے خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں لیکن اسلامی جھنڈے کی عظمت سب پر بھاری ہے۔ اس لیے وہ اس کو دونوں بازوؤں کی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ دشمن ان کو نہتا پا کر ہر طرف سے یورش کر دیتے اور شہید کر ڈالتے ہیں۔ اب عبداللہ کی باری ہے کہ لشکر کی قیادت کریں۔ وہ بھی اپنے فرائض بڑی تندہی سے ادا کرتے اور ہمت و جوانمردی کے بڑے کارنامے دکھاتے ہیں۔ لیکن مخالف جمعیت کے آگے کچھ پیش نہیں جاتی۔ اور بالآخر وہ اپنی جان عزیز اسلام پر قربان کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد اب کوئی نامزد جنرل باقی نہیں رہتا۔ خالد فوراً آگے بڑھتے اور آواز لگاتے ہیں۔ ''مسلمانو! حملہ کرو! ہمارے لیے فتح' ورنہ جنت کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔'' اس پر جنگ میں پھر جان پڑ جاتی ہے۔ خالد فوجوں کو بڑی ہوشیاری سے لڑاتے ہیں۔ اب ان کا حملہ قلب پر ہو رہا ہے۔ مخالف فوجیں مجبور ہیں کہ اِدھر اُدھر ہٹیں۔ جس کی وجہ سے ان کی صفیں درہم برہم ہو جاتی ہیں۔ اور انہیں پیچھے ہٹنا پڑتا ہے۔ وہ تو رات ہو گئی۔ ورنہ آج ہی لڑائی کا فیصلہ ہو گیا ہوتا۔

خالد نے آج جوانمردی اور سرکردگی کا اتنا اچھا مظاہرہ کیا ہے کہ رات کو فوجی مجلس شوریٰ انہیں بالاتفاق اپنا امیر منتخب کر لیتی ہے۔ اس کے بعد باقی رات اگلے روز کی جنگ کا نقشہ تیار کرنے میں صرف ہو جاتی ہے۔

دوسری صبح جب نمودار ہوتی ہے تو یہ نظارہ دکھائی دیتا ہے کہ خالد اپنی فوج کا پرا جمائے میدان میں موجود ہیں۔ انہوں نے جہاں تک ممکن ہو سکا فوج کو میدان میں پھیلا دیا ہے۔ مختلف دستے اِدھر اُدھر گھومتے اور پھر اپنی جگہ واپس آ جاتے ہیں۔ دشمنوں کو اپنے خیموں سے کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ رات کی تاریکی میں مسلمانوں کو کمک پہنچ گئی ہے اور ان کی فوجیں کل کے مقابلے میں آج کہیں زیادہ ہیں۔ دشمن کی ہمتوں کو پست کرنے میں یہ ترکیب بڑی کامیاب ثابت ہو رہی ہے۔ پھر خالد حریف کو اتنا موقع بھی نہیں دیتے کہ وہ اپنی فوجوں کی صحیح طور پر صف آرائی بھی کر سکے اور اچانک بھرپور حملہ کر دیتے ہیں۔ اسلامی افواج میدان میں پھیل کر تین طرف سے دشمن پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔ اس طریق کار میں خطرات بھی مضمر ہیں۔ لیکن خالد کی جرأت آزمائی کا دوسری طرف سے بڑی کمزوری کے ساتھ جواب ملتا ہے۔ یونانی افواج پہلے ہی سے حواس باختہ تھیں۔ اس حملہ کی تاب نہیں لا سکتیں تھیں ان کے قدم اکھڑتے ہی مسلمانوں نے ان کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ بھگدڑ مچ گئی۔ اور وہ بے شمار سامان اور لاتعداد ہتھیار چھوڑ کر فرار ہو گئے۔

خالد مال غنیمت سے لدے پھندے ایک فاتح لشکر کے سردار کی حیثیت سے مدینہ میں داخل ہوتے ہیں۔ آج سے وہ سیف اللہ یعنی اللہ کی تلوار کے لقب سے یاد کیے جائیں گے۔ کیونکہ اس جنگ میں بہادری کے علاوہ فن جنگ سے واقفیت اور مہارت میں ان کو بڑی ناموری حاصل ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس لڑائی کے دوران میں ان کے ہاتھ میں نو تلواریں ٹوٹی ہیں۔ دوسرے جنرل بھی کم نبرد آزما ثابت نہیں ہوئے۔ حضرت جعفر طیارؓ کے جسم پر تلواروں اور نیزوں کے نشانات سب ملا کر پچاس سے کچھ اوپر ہی ہیں۔

خالد اپنے ہمراہ تینوں امیران لشکر یعنی زیدؓ جعفرؓ اور عبداللہؓ کے لاشے بھی لے

آئے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے آنسو رواں ہیں۔ مدینہ اپنے بہادروں پر سوگ منا رہا ہے۔ لوگ امنڈے آ رہے ہیں اور اپنے ان نبرد آزماؤں کی میتوں کو موت کی آغوش میں زخموں سے چور اس طرح سوتا دیکھ رہے ہیں کہ ان کے چہروں سے اسلام کے نام پر قربان ہونے کی طمانیت جھلک رہی ہے۔ حضور ﷺ کو خاص طور پر بہت صدمہ ہے کیونکہ زیدؓ اور جعفرؓ دونوں بہت کافی عرصہ تک آپ کے زیر شفقت رہ چکے ہیں۔ آپ جعفرؓ کے شیر خوار بچے کو گود میں لے کر محبت سے گلے لگاتے اور آنسو بہاتے ہیں۔ پھر جب زیدؓ کی لڑکی سامنے آتی ہے تو اسے دیکھ کر رنج و غم کے جذبات کو ضبط کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

آپ ﷺ کو اس حالت میں دیکھ کر ایک صحابی دریافت کرتے ہیں۔ یا رسول اللہ! آپ اس طرح کیوں روتے ہیں؟"

آپ جواب میں فرماتے ہیں "یہ وہ آنسو ہیں جو ایک دوست دوسرے کی دائمی مفارقت پر بہاتا ہے"

مدینہ میں ان شہداء کے جنازے بڑی دھوم دھام سے اٹھائے جاتے ہیں۔ میتیں جلوس کی شکل میں قبرستان کی طرف جا رہی ہیں اور تقریباً سارا شہر ان کے جلو میں ہے۔ عمائدین سب ہی شریک ہیں۔ تمام مسلمان نماز جنازہ ادا کرتے اور شہدا کے واسطے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ پھر ان کو نہایت خلوص، پیار و محبت سے قبروں سے دفن کر دیا جاتا ہے۔

............﴿6﴾............

مدینہ میں امن و سکون ہے، عربوں کے قبیلے آ آ کر دائرہ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔ یہودیوں کے غرور کا سر نیچا ہو گیا ہے۔ حملہ کا فوری خطرہ نہ یونانیوں کی طرف سے ہے۔ نہ ایرانیوں کی جانب سے القعدہ کا مہینہ بھی آ پہنچا ہے۔ اور صلح نامہ حدیبیہ کی شرائط کے بموجب مسلمانوں کو مکہ جانے حج کے فرائض ادا کرنے کا حق حاصل ہے۔ درختوں پر موسم بہار کے پھول کھلنے اور خنک ہوائیں چلنے لگیں ہیں۔ آنحضرت ﷺ

کے ساتھ ایک ہزار عازمان حج کا قافلہ روانہ ہو رہا ہے اور اس طرح سات سال مکہ سے غیر حاضر رہنے کے بعد قرآن شریف کی یہ پیشن گوئی پوری ہو رہی ہے کہ "اللہ نے چاہا تو تم مسجد حرام میں اطمینان سے داخل ہو گے۔ سر منڈواؤ گے یا بال ترشواؤ گے اور تمہیں کوئی خطرہ نہ ہوگا۔"

اہل اسلام اپنے ساتھ بجز ان چھوٹی تلواروں کے جن کی صلح نامہ کی رُو سے اجازت ہے اور کوئی ہتھیار نہیں لائے۔ اور اب وہ اپنے قربانی کے جانور ساتھ لیے ہوئے مکہ میں داخل ہو رہے ہیں۔

لیکن شہر خالی ہے۔ اس کے تمام باشندے غریب و امیر سب اپنے مکانات چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ تین روز تک وہ قرب و جوار کی پہاڑیوں میں ڈیرے ڈالے پڑے رہے اور محفوظ مقامات پر مجتمع ہو کر دیکھتے رہے کہ پیغمبر صاحب اور ان کے ساتھی کیا کرتے تھے۔

یہ ایک عجیب و غریب نظارہ ہے۔ جس میں دونوں جانب سے حیرت انگیز جذبات کا اظہار ہو رہا ہے۔ پہاڑیوں سے نیچے جھانک جھانک کر وہ اس ہستی کو دیکھتے ہیں جسے انہوں نے کبھی شاعر کہا کبھی دیوانہ' کبھی اس کا مقاطعہ کیا اور کبھی اس کے زندہ یا مردہ لانے پر انعام مقرر کیا۔ ان کے ساتھ ہی ایسے لوگ بھی دکھائی دے رہے ہیں جو کبھی ان کے دوست اور رشتہ دار تھے' کچھ زیادہ عرصہ نہیں صرف چھ سات سال ہی تو گزرے ہیں اور اتنے مختصر عرصہ میں یادیں پرانی نہیں ہو جایا کرتیں۔ انہیں بخوبی یاد ہے کہ محمد ﷺ کس طرح شہر کی سڑکوں پر تبلیغ کرتے پھرتے تھے۔ کس طرح ایک چھوٹی سی ٹولی' جس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان کے ہمراہ رہا کرتی تھی۔ اور کس طرح ایک بڑا مجمع ان کی جنت کے وعدوں کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ اور دوزخ کی آنچ کے ذکر پر ہنستا تھا۔ اب سات برس کے مختصر سے عرصہ میں کیسی کیسی حیرت انگیز تبدیلیاں رونما ہو گئی ہیں۔ وہی محمد ﷺ آج عرب کے سب سے مقتدر اور ذی اختیار سردار ہیں۔ ان کو ستانے اور ایذا دینے والے قریش جو ان کے اہل قبیلہ بھی ہیں اور عزیز بھی اپنی عظمت و بزرگی

کی بلندیوں سے پھسل پھسل کر نیچے کی طرف آ رہے ہیں۔ ان کی افواج پراگندہ ہو چکی ہیں۔ ان کے کاروانوں کے راستے اور روزی کی راہیں محمد ﷺ اور ان کے ساتھیوں کے رحم و کرم پر منحصر ہو گئی ہیں۔ اور ان کی قوم کے منتخب لوگ اسلام قبول کرنے کے لیے مدینہ کی طرف چل پڑے ہیں۔

اسی طرح اہل اسلام کے دلوں میں بھی مختلف نوعیت کے خیالات موجزن ہیں۔ بہت سے ایسے لوگ ہیں جو ایک عرصہ کی جلاوطنی کے بعد اپنے ان گھروں کو جن میں وہ پیدا ہوئے اور پلے بڑھے' دوبارہ دیکھ رہے ہیں۔ انہیں اپنے خدا اور رسول کے ان وعدوں پر جو ان سے کیے گئے تھے۔ پورا اعتماد تھا۔ کچھ لوگ رو بھی رہے ہیں۔ لیکن یہ خوشی کے آنسو ہیں جو ضبط نہیں ہو رہے۔ بعض اہل اسلام ایسے بھی ہیں جو پہلی مرتبہ مکہ آئے ہیں۔ انہوں نے حضرت ابراہیمؑ کے تعمیر کردہ خانہ خدا' مقدس حجراسود اور ان سینکڑوں بتوں کا حال سنا ہے۔ جنہیں محمد ﷺ معبودان باطل کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو اس موقع کو اپنی تمام مشکلات و آلام کا خاتمہ سمجھ رہے ہیں۔

لیکن تمام آنکھیں حضور ﷺ کی مرکزی شخصیت پر مرکوز ہیں۔ آپ ﷺ کے ادنیٰ سے ادنیٰ اقدام کو بھی نظروں میں سمویا جا رہا ہے۔ لوگوں کے نزدیک ہر بات دلچسپ ہے اور آپ ﷺ کے نزدیک ہر شے اہم ہے۔ آپ خانہ کعبہ میں تشریف لے جاتے ہیں بڑے احترام سے حجراسود کو بوسہ دیتے ہیں۔ پھر سات طواف پورا کرنے کے بعد صفا و مروہ پر سعی فرماتے ہیں اور اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ کے تعمیر کردہ بیت عتیق کے دروازے پر نفل نماز ادا کرتے ہیں۔

مسلمان حجاج تین دن تک مکہ میں قیام کرتے اور حج کے تمام ارکان ادا کر کے صلح حدیبیہ کی شرائط کے بموجب چوتھے دن مقدس شہر کو خالی کر دیتے ہیں دراصل اہل مکہ کو اپنے گھروں سے نکل جانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ یا آپ ﷺ کے صحابہ کے دلوں میں فتوحات کا خیال تک نہ تھا۔ حضور ﷺ بچپن اور جوانی میں صادق اور الامین تھے۔ یعنی آپ ﷺ کی بات پر مکمل اعتماد کیا جا سکتا تھا۔ اب بھی گو

زمانہ بہت سی کروٹیں بدل چکا ہے۔ لیکن آپ کے قول یا تحریر میں کوئی فرق نہیں آیا۔ آپ اب بھی الامین ہیں۔ اب بھی وہی محمد ﷺ ہیں جن پر دوست دشمن سب اعتبار کر سکتے ہیں۔

﴿7﴾

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا آپ ﷺ کے دشمن بھی ایسے ہی ہیں۔ یہودیوں کی غداریوں کا اوپر ذکر آ چکا ہے۔ قریش نے بھی اپنی بے اعتمادی کا اظہار کر دیا ہے حضور ﷺ کے مدینہ سے رخصت ہوتے ہی ان کی دلی کدورت ظاہر ہو جاتی ہے۔ وہ مسلمانوں کے ایک حلیف قبیلہ بنو بکر پر حملہ کرتے' اکثر لوگوں کو تہ تیغ کرتے اور ان کی کھیتیاں تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ یہ بین طور پر صلح حدیبیہ کی شرائط کی خلاف ورزی ہے۔ جس کا اطلاق حلیف قبائل پر بھی یکساں ہوتا ہے۔ اس بدنصیب قبیلہ کے تعتیہ السیف اشخاص مطالبہ کرتے ہیں کہ اس دوستانہ معاہدہ کی رو سے جو انہوں نے مسلمانوں سے کر رکھا ہے اہل اسلام کو ان کی طرف سے انتقام لینا چاہیے۔ آج بھی اسلام پر نکتہ چینی کرنے والے کچھ لوگ ایسے موجود ہیں جو کہتے ہیں حضور ﷺ نے صلح حدیبیہ کو توڑنے کے اسباب خود پیدا کیے۔ کیونکہ اس کی شرائط مسلمانوں کے خلاف جاتی تھیں۔ بعض لوگ اس سے بھی آگے بڑھ کر حضور ﷺ پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ آپ ﷺ کا مقصد دراصل اپنی سلطنت کو وسیع و مضبوط کرنا تھا۔ مکہ کا شہر عرب میں ایک بڑی اہم حیثیت رکھتا تھا۔ اور جب تک اسے فتح نہ کیا جاتا اسلام کی عظمت و وقعت پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکتی تھی۔ لیکن موجودہ صورت میں یہ سوال کہ آیا آنحضرت ﷺ کو کبھی مکہ فتح کرنے کا خیال آیا بھی تھا یا نہیں' یا یہ کہ اس کی تسخیر سے عرب پر آپ کے تسلط کی تکمیل ہو جائے گی۔ اور بہ حیثیت فرمانروا کے آپ ﷺ کے اختیارات بہت وسیع ہو جائیں گے۔ بالکل غیر متعلق ہے۔ اگر واقعی آپ نقض عہد کرنا چاہتے تو اس کے لیے بہترین موقع وہ تھا جب آپ شہر کے اندر مقیم تھے۔ اور مدافعت کے واسطے ایک متنفس بھی موجود نہ تھا۔ لیکن آپ ﷺ جس طرح داخل ہوئے اسی طرح باہر تشریف لے آئے اور ایک اینٹ تک اپنی جگہ سے

نہ ہلی۔ اب اگر آپ ﷺ کی نظر مکہ کی طرف لگی ہوئی ہے تو اس کے سو فیصدی ذمہ دار قریش ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اس صلح نامہ کی خلاف ورزی کر ڈالی ہے۔ جس کی شرائط سب انہیں کی موافقت میں ہیں۔ اب اس کی دھجیاں اڑ چکی ہیں۔ دونوں فریق آزاد ہیں کہ جس طرح چاہیں اپنے ہتھیار استعمال کریں۔

قریش کو اس کا احساس ہوا ہے لیکن بعد از وقت کہ انہوں نے بنو بکر پر حملہ کر کے انتہائی فاش غلطی کی ہے۔ وہ حضور ﷺ کے غصے اور مسلمانوں کے طیش کو فرو کرنے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں ابوسفیان کو ان اختیارات کے ساتھ مدینہ بھیجتے ہیں کہ جن شرائط پر بھی مناسب سمجھیں صلح کر لیں۔ اسلامی دارالحکومت میں پہنچنے کے بعد وہ سب سے پہلے اپنی بیٹی ام حبیبہؓ کے گھر جاتے ہیں۔ جنہیں حال ہی میں حضور ﷺ نے اپنی زوجیت میں لیا ہے۔ اور خواہش کرتا ہے کہ وہ درمیان میں پڑ کر تصفیہ کرا دیں۔ چنانچہ آنکھوں میں آنسو لا کر کہتا ہے۔ "کیا تمہیں اپنے شوہر باپ سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔"

اُم حبیبہؓ باپ کی بڑی عزت کرتی ہیں۔ لیکن مسلمان ہو جانے کے بعد ان پر اور ان کے مرحوم شوہر پر قریش نے جو مظالم توڑے تھے وہ سب انہیں اچھی طرح یاد ہیں۔ جو لوگ پہلی مرتبہ ہجرت کر کے حبش گئے تھے ان میں یہ بھی شامل تھیں۔ اس لیے ابوسفیان کو اس گھر میں ہمدردی کی بھیک واجبی ہی مل سکتی تھی۔ اس لیے وہ جواب میں کہتی ہیں۔ "اس مکان کے مالک اور میرے خاوند رسولؐ خدا ہیں۔ تم میرے باپ ضرور ہو۔ لیکن کافر اور بت پرست ہو۔"

ابوسفیان بیٹی کو برا بھلا اور کوستا ہوا ابوبکرؓ اور علیؓ کے پاس جاتا ہے مگر یہاں بھی اسے کورا ہی جواب ملتا ہے۔ پھر وہ خود حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے لیکن وہاں بھی کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ اور اس معاملہ میں آپ ﷺ ایک لفظ تک نہیں فرماتے۔

ابوسفیان بے نیل و مرام مکہ لوٹ آتا ہے اور اپنی بیٹی پھر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ اور آخر میں آنحضرت ﷺ سے اپنی ملاقات کا حال بیان کر کے کہتا ہے کہ

حضورﷺ نے اس معاملہ میں بالکل چپ سادھ لی ہے۔

مدینہ میں جنگ کی خفیہ طور پر تیاریاں شروع ہو چکی ہیں۔ لیکن حاطب بن ابی بلتعہ کو حضورﷺ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے کہ انہوں نے اس کی اطلاع دشمن کو دے دی ہے یہ خط راستے میں پکڑا جاتا ہے اور اس کا مضمون حسب ذیل ہے۔ مکہ والو! ہوشیار ہو جاؤ۔ رسول اللہ تم پر حملہ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اس لیے جلد اپنی مدافعت کرو۔" مجرم حلفیہ بیان کرتا ہے کہ اس کا مقصد صرف اپنی بیوی بچوں کو تحفظ ہے جو اہل مکہ کے قبضہ میں ہیں۔ اگر اہل مکہ کو علم ہوگا کہ میں ان کا دوست ہوں تو میرے گھروالوں سے نیک برتاؤ کریں گے۔ حضرت عمرؓ کا خیال ہے کہ ان کا سر فوراً قطع کر دینا چاہیے۔ وہ کہتے ہیں۔"یارسول اللہﷺ حاطب جھوٹا ہے اور مکار ہے۔ اہل مکہ کے لیے جاسوسی کرتا ہے۔ مجھے اجازت دیجیے کہ اس کی گردن اڑا دوں۔" حضورﷺ کچھ سختی سے فرماتے ہیں "میرے صحابہ سے درگزر کرو۔ حاطب معرکہ بدر میں ہمارے شریک رہے ہیں۔" اور اس کے بعد مجرم سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں "جاؤ تمہیں معاف کر دیا گیا۔"

اہل مکہ ابھی چون و چرا ہی میں مبتلا ہیں کہ مکہ کی قریبی پہاڑیوں پر دس ہزار آگ کے الاؤ خبر دیتے ہیں کہ مسلمانوں کی افواج قریب آ پہنچی ہیں۔

ابوسفیان صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے باہر نکلتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اسے راستے میں حضورﷺ کے چچا عباس مل جاتے ہیں۔ وہ دریافت کرتا ہے "کیا یہ عباس ہیں؟" اور وہ اثبات میں جواب دیتے ہیں۔

پھر وہ پوچھتا ہے "تمہارے پیچھے کون لوگ آ رہے ہیں؟"

"محمد رسول اللہﷺ جو دس ہزار ساتھیوں کے ساتھ تمہاری ملاقات کو تشریف لائے ہیں۔"

وہ پوچھتا ہے۔" تمہارا کیا مشورہ ہے۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

عباسؓ کہتے ہیں۔"ہتھیار ڈال دو۔ ورنہ تم سب کا خاتمہ ہو جائے گا"

ابوسفیان ان کے ساتھ مسلمانوں کے کیمپ میں آتا ہے۔ حضرت عمرؓ اس کے نگران ہیں۔ اور آپ فوراً کفار کے اس سرغنہ کو پہچان لیتے ہیں۔ اور غصہ سے فرماتے ہیں۔ "یا اللہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ ابوسفیان ہمارے کیمپ میں اور وہ بھی بغیر کسی صلح نامہ یا معاہدہ کے" پھر نہایت درشتی سے فرماتے ہیں۔ "کیا اس بات کو تسلیم کرنے کا اب بھی وقت نہیں آیا کہ اللہ ایک ہے۔" وہ کہتا ہے۔ "مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں۔"

"اور یہ کہ محمد ﷺ اس کے رسول ہیں۔"

وہ کہتا ہے۔ "صاف گوئی معاف' مجھے اب تک اس کا یقین نہ تھا۔"

آپ تہذیبی طور پر اپنی تلوار اس کے سر پر گھماتے اور فرماتے ہیں۔ "تو میں تمہاری اس کج فہمی کا ابھی خاتمہ کیے دیتا ہوں۔"

اسی وقت خوش قسمتی سے آنحضرت ﷺ وہاں تشریف لے آتے ہیں۔ اور اس کا سر زمین پر قلابازیاں کھانے سے بچ جاتا ہے۔

عباسؓ فرماتے ہیں۔ "ابوسفیان' اب وقت آ گیا ہے کہ تم بداعمالیوں سے توبہ کرو۔ حق کے سامنے ہتھیار ڈال دو۔ اور حضور ﷺ سے معافی کے خواستگار ہو۔"

اور ان حالات کے تحت ابوسفیان اہل اسلام کی صفوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ قریش کا یہ سردار مسلمانوں کی صفوں میں جو ضبط و نظم اور رکھ رکھاؤ ہے' اسے دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے۔ اور جب اسے لشکر کے گرد گھمایا جاتا ہے تو عباسؓ سے کہتا ہے۔ "خدا کی قسم تمہارے بھتیجے کی مملکت بڑی وسیع ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اب کوئی طاقت ملک میں ایسی باقی نہیں جو ان کا مقابلہ کر سکے"

اس کے بعد وہ فوراً ہی اپنے قبیلہ میں اس غرض سے واپس جاتا ہے۔ کہ انہیں مشورہ دے کہ اب مقابلہ فضول ہے اور انہیں فاتح عرب کے آگے ہتھیار ڈال دینے چاہئیں۔

علی الصبح مقررہ وقت کے مطابق اسلامی فوجیں مکہ پر قبضہ کرنے کے لیے آگے بڑھتی ہیں۔ وہ جنگ کے لیے پوری طرح تیار ہیں۔ حضرت زبیرؓ کو حکم ہے کہ وہ

پہاڑیوں کی جانب سے مکہ میں داخل ہو جائیں اور سعدؓ کو اس راستہ کی حفاظت پر متعین کیا گیا ہے جو بلندی اور پستیوں سے ہوتا ہوا شہر کو جاتا ہے۔ حضرت علیؓ کے ذمہ اپنے دستہ کے ساتھ بڑھ کر حجوں کی پہاڑی پر قبضہ کرنا۔ اور اس پر اسلام کا جھنڈا لہرا دینا ہے۔ جب کہ خالدؓ کو حکم ہے کہ بقیہ فوج کے ساتھ شہر پناہ تک پہنچ جائیں۔ حضور ﷺ بہ نفس نفیس عقب میں رہتے ہیں۔ تاکہ جہاں آپؐ کی ضرورت ہو فوراً پہنچ جائیں۔ ہر سپہ سالار کو ہدایت ہے کہ جب تک ان پر حملہ نہ ہو وہ اپنی طرف سے جنگ ہرگز نہ چھیڑیں۔ حضرت زبیرؓ کو کسی مخالف جماعت سے واسطہ نہیں پڑتا۔ اس لیے وہ شہر تک پہنچ گئے ہیں۔ لیکن خالدؓ کا راستہ روک لیا گیا ہے۔ قریش کے کئی فوجی دستے ان کے سامنے آگئے اور تیروں کی بارش کرنے لگتے ہیں۔ خالدؓ نے بھی حملہ کا حکم دے دیا ہے اور خود قریش کی پیادہ فوج کے درمیان گھس جاتے ہیں حضور ﷺ عقب سے اس معرکہ آرائی کو دیکھ کر سبب دریافت فرماتے ہیں۔

''یااللہ' یہ کیا دیکھ رہا ہوں۔ کیا میں نے جنگ کو منع نہیں کیا تھا۔'' آپ ﷺ کو بتایا جاتا ہے کہ دشمن نے خالدؓ کی فوج پر حملہ کردیا ہے۔ اور وہ اپنی محافظت کی خاطر لڑ رہے ہیں۔ آپ ﷺ فوراً انہیں حکم بھجواتے ہیں۔ کہ خون آشامی بند کردو۔ لیکن یہ معرکہ بہت مختصر ثابت ہوتا ہے اور خالدؓ شہر کی فصیل تک پہنچ جاتے ہیں۔

سورج نکلتے نکلتے شہر کے تمام دروازوں پر اسلامی فوج کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ اور وہ اس بات کا اہتمام کرتی ہے کہ امیر العساکر آنحضرت ﷺ بہت شاندار اور پروقار طور پر مکہ میں داخل ہوں۔ آسمان صاف ہے۔ اور بادل کا نام ونشان تک کہیں نظر نہیں آتا۔ سورج نکل رہا ہے۔ اور اس کی کرنیں اس تمام منظر کو نئی قسم کی جلا دینے لگی ہیں۔ دس ہزار نیزے ایسے چمک رہے ہیں جیسے آسمان پر بجلی کی لہریں دوڑتی ہیں۔ جھنڈے ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ سڑکوں پر حیرت زدہ لوگوں کا ہجوم ہے اور بالاخانوں پر ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے ہیں۔ کہیں کہیں نغمے بھی سنائی دیے جاتے ہیں۔ اور کہیں دف اور ڈھول کی آوازیں فاتحین کا خیر مقدم کررہی ہیں۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد حضور ﷺ فاتحانہ طور پر

ایک جلوس کی شکل میں اس طرح داخل ہوتے ہیں کہ آگے بھی مسلح سواروں کا دستہ ہے۔ اور عقب میں بھی اسلامی فوج کے صف شکنوں کی ایک جماعت ہے۔ جس طرح کسی زبردست فاتح کا مفتوحہ علاقہ میں جلوس نکلتا ہے۔ اس شان سے آپ کی سواری مکہ کی سڑکوں سے گزر رہی ہے۔ جو آپ ﷺ کی جائے پیدائش بھی ہے قبیلہ قریش کا مستقر بھی اور دینی مرکز بھی۔ آگے آگے حضرت علیؓ اسلام کا جھنڈا لیے ہوئے چل رہے ہیں۔ دائیں ہاتھ پر آپ کے یار وفادار' غار ثور کے ہمراہی ابوبکرؓ اور بائیں پر عمرؓ اور بالکل پیچھے زیدؓ کے صاحبزادے اُسامہ ہیں۔

جلوس سیدھا کعبہ کا رُخ کرتا ہے۔ انتہائے راہ میں آپ کا ذہن اس دور کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ جب آپ ﷺ کی ان ہزار ہا باشندوں کے درمیان کوئی خاص حیثیت نہ تھی۔ نہ آپ ﷺ کے دوست تھے نہ ہمدم' بدقسمتی محنت شاقہ' عرقریزی' ناکامی اور تعذیب کا وہ زمانہ اب خواب و خیال کی سی ایک کیفیت نظر آ رہا ہے۔ عزت و کامرانی کے اس موقع پر چند ایسی محبوب ہستیوں کی یاد بھی آپ ﷺ کے دل کو تڑپا رہی ہے۔ جن کے درمیان زمانہ نے ایک سنگین دیوار حائل کر دی ہے۔ آج اگر خدیجہؓ زندہ ہوتیں تو کیا کہتیں؟ زیدؓ' جعفرؓ یا اسی طرح دوسرے صحابی اور اعزاء موجود ہوتے تو کس قدر خوش ہوتے۔ حالانکہ انہیں کی تکالیف اور مصائب کے صلہ میں آج یہ فتح حاصل ہو رہی ہے۔

حضور ﷺ جب کعبہ کے صحن میں داخل ہوتے ہیں تو تمام لوگوں کو رک جانے کا حکم فرماتے ہیں۔ اور ساتھ ہی آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر باآواز بلند بسم اللہ پڑھتے اور سورہ فتح کی تلاوت فرماتے ہیں۔ پھر سورہ توبہ کی آیات سناتے ہیں۔

"بے شک ہم نے تم کو کھلی فتح عطا کی......زمین و آسمان کے تمام لشکر اللہ کے لیے ہیں۔ اور اسے ہر بات کا علم ہے اور وہ علیم و حکیم ہے۔ اللہ نے تم سے بہت سی نعمتوں کا وعدہ کیا ہے جو تم کو حاصل ہوں گی اور بہت سی ایسی بھی ہیں جو ابھی تم کو حاصل نہیں ہوئیں۔ اور اللہ نے تمہارے دشمنوں کا احاطہ کر رکھا ہے اور اسے ہر بات پر قدرت حاصل ہے۔"

آپ ﷺ کعبہ کے دروازے پر اس طرح جلوہ فرما ہیں۔ جس طرح ستاروں کے درمیان بدر کامل ہو۔ سر پر ایک سیاہ صافہ ہے اور اسی رنگ کا ایک چغہ نہایت لاپرواہی سے کاندھوں پر پڑا ہے۔ آپ ﷺ کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہی عرب کے نامور فاتح ہیں۔ آپ ﷺ تو اب بھی ویسے ہی معمولی انسان نظر آتے ہیں جیسے وہ کسی زمانہ میں لوگوں کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے عجیب وغریب وعظ سنایا کرتے تھے۔

آپ ﷺ کا سب سے پہلا فریضہ یہ تھا کہ ان تین سو ساٹھ بتوں کو توڑا جائے جنہوں نے کعبہ میں خدائے وحدہٗ لاشریک کی جگہ کو غصب کر رکھا تھا۔ اور اس مقدس اور برگزیدہ عمارت کو شرک کی گندگی سے پاک کیا جائے۔ چنانچہ آپ ﷺ کعبہ میں داخل ہو کر دیواروں سے عورتوں کی تصادیر اتار پھینکتے ہیں۔ اور ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کے مجسموں کا چورا چورا کر ڈالتے ہیں۔ پھر آپ ﷺ ایک عصاء لے کر بڑے بُت ہُبل کی طرف جاتے ہیں۔ اور نظریں گاڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے شرم سے آنکھیں نیچی کر لی ہیں۔ وہ بھی چند لمحوں میں چکنا چور ہو جاتا ہے۔ آپ ﷺ کے صحابہؓ دوسرے بتوں سے بھی یہی سلوک کرتے ہیں۔ اس کے بعد آپ ﷺ خانہ کعبہ کا طواف فرماتے اور بہت احترام سے حجرِ اسود کو بوسہ دیتے ہیں۔ پھر آپ ﷺ نماز شکرانہ ادا فرماتے اور اپنی اس عظیم کامیابی پر رب العزت کے دربار میں تشکر کا اظہار کرنے کے بعد چاہ زمزم پر پہنچتے ہیں۔ جہاں آپ اور تمام صحابائے کرام خوب سیر ہو کر پانی پیتے ہیں۔

اس کے بعد آپ ﷺ جملہ مسلمانوں سے مخاطب ہوتے اور قرآن مجید کی یہ آیات سناتے ہیں۔

''اللہ ایک اللہ ہے۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔ اور اپنے عبادت گزار بندوں کی مدد کی ہے۔ اسی نے دشمن کو ہراساں کر دیا۔ اور ان کو شکست سے دو چار کیا ہے۔ اسی نے مجھ کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے تاکہ تم کو بت پرستی کی لعنت سے چھٹکارا دلاؤں۔ اب تم ان بے جان پتھر کی مورتوں کی پرستش نہیں کرو گے۔ اب تم باطل مذاہب کے

پابند نہ ہو گے۔"

محاربوں اور ہتھیاروں کے ذریعہ سے جو فتوحات ہوئی ہیں۔ اُن کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ اس کے بعد فاتح کو مفتوح کی جائیدادیں ضبط کرنے اور انہیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لینے یا ان کے سرغنوں کو تہ تیغ کر دینے کا پورا حق حاصل ہوتا ہے۔ قریش نے آپ کے ساتھ جو سختیاں کی تھیں ان کو ذہن میں رکھتے ہوئے ان لوگوں کو آپ سے کسی رعایت کی امید موہوم ہی نظر آتی ہے۔

چنانچہ آپ ﷺ قریش سے دریافت فرماتے ہیں۔ "تمہیں معلوم ہے کہ آج میں تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں"

اس پر وہ سب متفق اللفظ ہو کر جواب دیتے ہیں۔ "آپ ﷺ شریف بھائی اور شریف برادر زادے ہیں۔"

آپ ﷺ ازراہ کرم فرماتے ہیں۔ "اچھا یوں ہی سہی۔ میں تم سے کچھ نہیں کہوں گا جاؤ تم آزاد ہو' خدا تمہیں معاف فرمائے۔"

شام کو حضرت عمرؓ آنحضرت ﷺ سے دریافت کرتے ہیں۔ "آپ ﷺ نے ان سب کے ساتھ اتنی نرمی کا برتاؤ کیوں فرمایا۔ حالانکہ انہوں نے آپ ﷺ کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا۔ اور اسلام کی مخالفت میں تو کوئی کسر ہی نہیں اٹھا رکھی۔"

حضور ﷺ کا جواب تھا۔ کہ "پہلی بات تو یہ ہے کہ انہیں ملامت نہیں کرنی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہم نکتہ یہ ہے کہ وہ خود بھی اسلام لے آئیں گے اور ان کی اولاد در اولاد سب مسلمان ہو گی۔"

آنحضرت ﷺ نے اس قسم کے فراخدلانہ اور فیاضانہ سلوک اتنی مرتبہ فرمائے ہیں کہ ان کو یاد رکھنا یا معرض تحریر میں لانا مشکل ہے۔ لیکن آپ ﷺ کا قریش کو اس طرح بالکل معاف کر دینا اور کسی سے کچھ تعرض نہ کرنا تاریخ انسانی کا ایک یکتا واقعہ ہے۔ اور جب کوئی شخص اس امر پر غور کرنے لگتا ہے کہ اس قبیلہ میں ایسی ناہنجار ہستیاں بھی شامل ہیں' جیسے ابوسفیان کی گھر والی خونخوار ہندہ جس نے حضرت امیر حمزہؓ کا کلیجہ چبا

ڈالا۔ وحشی، جس نے مسلسل حضور ﷺ کے خلاف سازشیں کیں۔ اور فوجیں لے کر چڑھ دوڑا۔ ابو جہل کا بیٹا عکرمہؓ جو غزوہ اُحد میں کفار کا جنرل تھا اور آج ہی صبح خالدؓ پر اس وقت حملہ کر بیٹھا جب وہ مکہ کی طرف پیشقدمی کر رہے تھے۔ عبداللہ کاتب وحی جس نے قرآن شریف کے الفاظ میں تحریف کردی تھی۔ رقاصہ قریبہ جو رقص و سرود کی محفلوں میں حضور ﷺ کی تضحیک کیا کرتی تھی۔ تب اسے صحیح طور پر احساس ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی وسعت قلب کتنی اتھاہ ہے۔

﴿8﴾

مکہ 21 رمضان 9 ہجری بروز جمعہ فتح ہوا۔ جو عیسوی حساب سے 431ء ہوتا ہے۔ آپ ﷺ وہاں کے سیاسی اور مذہبی معاملات کو طے کرنے اور تنظیمی امور کا تصفیہ کرنے کی غرض سے ڈیڑھ مہینہ شہر میں قیام فرمایا۔ اس دوران میں آپ ﷺ نے خانہ کعبہ کی چابیاں پھر عثمانؓ کے حوالہ کردیں۔ جنہوں نے اسلام لانے کے ساتھ ہی کلید برداری کے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ اپنے چچا عباسؓ کے ذمہ سقائی یعنی حج کے دوران حجاج کو آب زمزم پلانے کی خدمت سپرد کردی۔ لیکن خود حضور ﷺ کا معمول یہ ہے کہ آپ ﷺ کوہ صفا پر جا کر اس طور سے تشریف فرما ہوتے ہیں کہ ایسا نظارہ نہ پہلے کبھی کسی انسان نے دیکھا اور نہ آئندہ دیکھے گا۔ اس طرح کے معمولی کپڑے پہنے جو ایک غریب سے غریب آدمی کو بھی میسر آسکتے ہیں۔ آپ ایک سنگلاخ چٹان پر بیٹھے رہتے اور عقیدت مند لوگ چاروں طرف سے آپ کو گھیرے میں لیے رہتے ہیں۔ مؤذن خدا تعالیٰ کی وحدت اور آپ ﷺ کی رسالت کا نعرہ بلند کرتا ہے۔

اشہد ان لا الہ الا اللہ و اشہد ان محمد رسول اللہ

اور سب مسلمان ان الفاظ کو دہراتے ہیں۔

تمام قبائل' گروہ یا افراد جو بیعت کرنے کی غرض سے حضور ﷺ کے پاس آتے ہیں۔ وہی وعدے کرتے ہیں۔ جو یثرب سے آنے والوں نے عقبہ کی پہاڑی پر کیا تھا کہ دیوتاؤں سے دست بردار ہو کر صرف ایک خدا کو مانیں' چوری' زنا کاری' دختر کشی

اور دروغ گوئی سے کنارہ کشی اختیار کرلیں۔

یہ تو آپ کو علم ہوگا کہ خدائے وحدہٗ لاشریک کو تسلیم کرنے کا عقیدہ مکہ میں سب سے پہلے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے لوگوں کو سمجھایا تھا۔ اور خانہ کعبہ کو بطور خانہ خدا کے تعمیر کیا تھا۔ ایک عرصہ تک یہ معبد پاک و صاف رہا۔ لیکن جب آبادی اتنی بڑھ گئی کہ سب لوگوں کا اس کے گرد و نواح میں بودوباش اختیار کرنا ناممکن ہوگیا تو جو لوگ دور دراز علاقوں میں جاکر بسے وہ یادگار کے طور پر اس بیت عتیق کے چند پتھر اپنے ہمراہ لے گئے اور ان کے ذریعہ حضرت اسمٰعیلؑ کی یاد تازہ کرتے' اور ان کے بتائے ہوئے راستہ پر چلتے رہے۔ لیکن زمانہ کے ہاتھوں یہ یادیں دھندلی پڑگئیں۔ اور پھر یہ پتھر ہی مسجود بن گئے۔ اب کسی کو معلوم نہ رہا کہ ان پتھروں کی غرض و غائت اور اصل حیثیت کیا ہے۔ رفتہ رفتہ ان کو انسانی شکلیں دے دی گئیں۔ اور ان کے گرد طرح طرح کے معتقدات جمع ہونے شروع ہوگئے۔ دیوتا اور دیویاں پیدا ہونے لگیں۔ پھر ان کو بھوک پیاس بھی ستانے لگی' اور ان پر نذرانے اور قربانیاں چڑھنے لگیں۔ مجاور بھی پیدا ہوگئے۔ جو مختلف ہتھکنڈوں سے معتقدین کو لوٹنے کھانے لگے۔ نتیجتاً اب کعبہ بجائے خدائے واحد کے ان اصنام کا مرکز بن گیا۔ اس طرح صدیاں گزر گئی ہیں۔ کہ یہ شہر قبائل کے دیوتاؤں کا مستقر ہے۔ اور لوگ یہاں آ آ کر منتیں مانتے۔ نذریں چڑھاتے ہیں۔ اور جب تک محمد ﷺ نے بت پرستی اور شرک کے خلاف آواز نہیں اٹھائی مکہ کی سیادت اور قیادت اسی صورت سے قائم رہی۔

اب جب کہ کعبہ کے بھی تمام اصنام منہدم کردیئے گئے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کچھ لوگوں کو ملک کے گوشہ گوشہ میں اس پیام کے ساتھ بھیجتے ہیں کہ وہ بھی اپنے اپنے مصنوعی خداؤں کے ساتھ یہی عمل کریں۔ لیکن ان سب پر یہ بات واضح کردی گئی ہے کہ آپ ﷺ کا ذمہ صرف سمجھانا اور تلقین کرنا ہے۔ جبر و تشدد سے ہرگز کام نہیں لینا' وہ سب امن و سکون کا پیام لے کر جارہے ہیں۔ یعنی اسلام کا۔ جس کے معنی ہیں' "امن و سلامتی۔" وہ لوگوں کو جن الفاظ سے مخاطب کریں گے یعنی السلام علیکم۔ تم پر سلامتی ہو۔

اس سے ان کے مافی الضمیر کا پتہ چل جائے گا۔

لیکن حضور ﷺ کا ہر پیامبر آپ کی طرح مخالفت اور تمرد کو صبر وسکون سے برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ مثلاً خالد کا دماغ اس سانچہ میں نہیں ڈھلا۔ جب تک وہ دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ ان کو مسلمانوں سے اتنا ہی کد اور تنفر تھا جتنا آج کفار سے عناد ہے۔ ان کی دنیا میں مشرکوں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ اس لیے وہ یمنیوں کو اسلام کی دعوت اس طرح دیتے ہیں۔ کہ ان کے ایک ہاتھ میں تلوار ہے اور دوسرے میں قرآن۔ وہ لوگ اپنے عقائد اور مذہب تبدیل کرنے پر تیار نہیں۔ اس لیے خالد انہیں مخالفت کی صورت میں جنگ کی دعوت دیتے ہیں۔ جس کو وہ منظور کر لیتے ہیں۔ اور فوجیں جمع کر کے لڑنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ خالد بہ آسانی ان پر قابو پا لیتے ہیں۔ بعض کو قتل کرتے اور بعض کو قید کر لیتے ہیں۔ اور ان کا ارادہ ہے کہ ان سب کو بھی تلوار کے گھاٹ اتار دیا جائے لیکن پھر یہ طے پاتا ہے کہ ان کا فیصلہ حضور ﷺ پر چھوڑ دیا جائے' اور اس وقت تک کوئی مزید کارروائی نہ کی جائے۔ حضور ﷺ کو جب ان واقعات کا علم ہوتا ہے تو آپ خالد کو فوراً واپس بلا لیتے ہیں اور حضرت علیؓ کو اس مقصد کے واسطے روانہ کیا جاتا ہے کہ اہل یمن کو خالد کی اس عصبیت اور ان کے جانی نقصانات کا معاوضہ عطا کیا جائے۔ آپ ﷺ کو اس ناخوشگوار واقعہ پر صدمہ ہوتا ہے اور آپ ﷺ خدا تعالیٰ کے حضور میں عرض کرتے ہیں کہ ''یا اللہ! خالد سے جو گناہ سرزد ہوا ہے میں اس سے بالکل بری الذمہ ہوں۔''

﴿9﴾

زمانہ گزرتا جا رہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ لوگ خدائے وحدہٗ لا شریک کے اس پیام پر جو آنحضرت ﷺ کے توسط سے ان تک پہنچا ہے' ایمان لا رہے ہیں۔ مذہب اسلام اب تکمیل تک پہنچتا نظر آنے لگا ہے۔ اس کے مبلغ محمد ﷺ کو اب انتہائی قوت بھی حاصل ہو گئی ہے۔ تمام نظریں انہیں پر لگی رہتی ہیں۔ اور ہر جگہ گفتگو کا مبحث اسلام ہی ہے۔

بہتر ہوگا کہ تاریخ اسلام کے اس اہم سنگ میل پر ہم اس دین اور اس کے پیغمبر پر ایک غائر نظر ڈالتے چلیں اور دیکھیں کہ آیا اسلام واقع بنی نوع انسان کے لیے امن و آشتی کا پیام ہے؟ اس سوال کے جواب میں ہمیں متعدد حقائق اس کی موافقت میں ملتے ہیں۔ مثلاً :- اوّل اسلام اپنی خصوصیات میں یکتا ہے یعنی ایک اچھا مسلمان بننے کے لیے یہ لازم نہیں کہ سابقہ مذاہب کے سچے اصولوں اور خوبیوں کو یک قلم مسترد کردیا جائے۔ قرآن یہ نہیں کہتا کہ اس میں کوئی ایسی نئی باتیں ہیں جو بنی نوع انسان کو پہلے سے معلوم نہ تھیں۔ اس کا مقصد یہ بتانا ہے کہ خدا کی وحدانیت ایک حقیقت ہے اور تمام مخلوقات اس کی شان کریمی کا مظہر ہے۔ یہ ایک کتاب مبین ہے۔ جس میں پچھلی تمام آسمانی کتابوں کی تصدیق کی گئی ہے۔

دوسرے اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے' ناسمجھ بچہ ہو یا انتہائی سمجھدار شخص' دونوں ہی اس کی سادہ ہدایات سے برابر مستفید ہوسکتے ہیں۔ اس میں منطق یا عقل کے خلاف دلائل کی بھرمار نہیں ہے۔ اس میں یہ تاریخ کے دوراز کار نظریات پر بحث ہے نہ ایسے معجزات ہیں جو سائنس یا فہم انسانی کے خلاف ہوں۔ نہ ایسے پیچیدہ راستے ہیں' جن میں دل کسی طرف چلے اور دماغ کوئی دوسرا رخ اختیار کرے۔ مسلمان بغیر اس کے کہ اس کی عقل و ذہانت پر حرف آئے۔ اس پر بخوبی عمل پیرا ہوسکتا ہے۔

اسلام کے موٹے موٹے اصول سورۃ بقرہ میں بیان کردیئے گئے ہیں۔ ان پانچ میں سے تین کا تعلق تو ایمان و اعتقاد سے ہے اور دو کا اعمال سے۔ مسلمان کو خدائے وحدہٗ لاشریک' قرآن اور اس سے ماقبل کے آسمانی صحائف پر ایمان رکھنا لازمی ہے۔ اعمال کے سلسلہ میں حکم ہے کہ نماز پڑھا کرو' اور جو کچھ خدا نے تم کو دیا ہے۔ اس میں سے نیک کاموں میں صرف کرو' صحیح طور پر مسلمان بننے کے لیے عمل بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا عقیدہ' محض اعتقاد کافی نہیں۔ قرآن بار بار ان الفاظ میں دونوں باتوں پر زور دیتا ہے۔ "الذین امنوا وعمل الصلحت." (جو لوگ ایمان لائے اور انہوں

نے نیک عمل بھی کیے۔)

تیسرے' اسلام کی تعلیمات میں مخصوص طبقوں' خدا تعالےٰ کی مقبول قوتوں یا منتخب گروہوں کے تخیل کو کوئی جگہ حاصل نہیں۔ خدا کو واحد سمجھنے کے معنی یہی ہیں کہ اس کی تمام مخلوق بھی ایک ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے۔"ہم نے تم سب کو ایک ماں باپ سے پیدا کیا۔ اور پھر تمہیں قبیلوں اور برادریوں میں تقسیم کر دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان لو۔" "نجات یا رحمت خداوندی کسی ایک مذہب یا ملت کے افراد تک محدود نہیں۔" "مجھے پکارو' میں اس کا جواب دیتا ہوں۔" "میری رحمت ہر شے کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔" "قیامت کے روز ہم میزان عمل قائم کریں گے تاکہ کسی متنفس کو یہ شکایت نہ رہے کہ اس کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے۔" "نہ اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھنا موجب شرف ہے۔ نہ رنگ' نسل یا زبان باعث ذلت۔ سب کے واسطے عظمت و بزرگی کا ایک ہی معیار ہے کہ "حقیقتاً خدا کی نظروں میں سب سے بلند مرتبہ وہی ہے جو اپنے فرائض عبودیت مکمل طور پر ادا کرتا اور متقی ہے۔"" اپنے ایک خطبہ میں آپ ﷺ نے اس نکتہ کو یوں واضح فرمایا ہے۔"اگر کوئی حبشی تم پر امیر مقرر کیا جائے تو اس کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو' آنحضرت ﷺ اور ان کے صحابہ نے جو مثالیں قائم کیں اور حضور ﷺ نے جو کچھ اس سلسلہ میں فرمایا وہ محض نظریات یا زبانی جمع خرچ نہیں بلکہ ہماری زندگی کا جزو لاینفک بننا لازمی ہے۔

چوتھے' اسلام مسلمانوں کے مابین اخوت یا بھائی چارہ قائم کرتا ہے۔ اسی اصول کا اوپر کئی جگہ بیان ہو چکا ہے اور حضور ﷺ کی اس حدیث نے کہ "تم میں سے کوئی شخص حقیقی معنوں میں خدا پر یقین نہیں رکھتا۔ جب تک وہ اپنے بھائی سے اتنی ہی محبت نہ کرے۔ جتنی خود اپنے آپ سے کرتا ہے۔" اخوت کو اسلام کا ایک لازمہ قرار دے دیا ہے۔

پانچویں: اسلام امن و رواداری کا مذہب ہے۔ خود اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی سب سے بڑی خصوصیت صلح جوئی ہے۔ مسلمان وہ ہے جو خدا اور انسان

دونوں سے اتفاق و اتحاد قائم رکھے۔ خدا سے اتفاق و اتحاد کے معنی یہ ہیں کہ مکمل طور پر اس کا تابع فرماں رہا جائے۔ اور تخلیقی قوانین کی پابندی کی جائے۔ انسان سے اتفاق و اتحاد اس امر پر مبنی ہے کہ اپنے ہم جنسوں کے ساتھ بھلائی کرے اور حسن سلوک سے پیش آئے۔ "بے شک جو شخص اللہ کے سامنے سر جھکائے اور دوسروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے اس کو ضرور نیک اجر ملے گا۔"

چھٹے: اسلام محض نظریات کی پوتھی نہیں۔ بلکہ عملی اخلاقیات کا ایک مستقل قانون اور روزمرہ زندگی میں ہمارا رہنما ہے۔ خدا تعالیٰ سے متعلق فرائض کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ مسلمان کے اوپر انسانی حقوق (جس میں وہ خود اس کے ہم جنس اور مستورات سب ہی شریک ہیں) مساوی طور پر عائد ہوتے ہیں۔ زکوٰۃ کی ادائیگی، دین کا عملی تحفظ، معاہدوں کی پابندی، سود، شراب اور نجس خوراک سے مکمل احتراز، عورتوں، غلاموں اور یتیموں سے حسن سلوک، اس کے چند بنیادی احکام ہیں۔ اس ضمن میں بھی وہی حکم خداوندی کارفرما ہے کہ تم میں سب سے افضل وہی ہے جو اپنے فرائض کا خیال رکھتا ہے۔ اس لیے ساتواں اصول یہ ہے کہ اسلام میں اجر کا دارومدار عمل پر ہے نہ کہ محض عقیدے پر۔

آٹھویں: اسلام نے عمرانی نوعیت کی بہت سی ناانصافیوں اور بے اعتدالیوں کی جڑ کاٹ دی ہے۔ مثلاً غلام کے اس حق کو پوری شدومد کے ساتھ تسلیم کیا گیا ہے کہ اس کو آزادی حاصل ہوسکتی ہے اور صرف یہی نہیں وہ آزاد ہوسکتا ہے بلکہ فوج کی کمان بھی سنبھال سکتا ہے۔ سلطنت پر حکمرانی کرسکتا ہے۔ اور اعلیٰ سے اعلیٰ خاندان کی لڑکی سے شادی بھی کرسکتا ہے۔ اسلام میں عورت کو جائیداد اور میراث کے حقوق بھی حاصل ہیں۔ عائلی زندگی میں اسے مناسب اور نمایاں حیثیت دی گئی ہے۔ اسے ناانصافیوں اور تلون مزاجیوں سے تحفظ بھی دیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ بعض صورتوں میں اسے یہ حق بھی حاصل ہے کہ خلع اور طلاق کا مطالبہ کرسکے۔ اسلام میں غرباء کی امداد کا باقاعدہ نظام ہے۔ جس مد میں روپیہ دینا لازمی بھی ہے اور اختیاری بھی۔ لازمی کے واسطے حدود مقرر کردی گئی ہیں۔

جو اتنی ہیں کہ غریب کا اس سے بخوبی گزارہ ہو سکے۔ لیکن مالدار کو اپنی بچت کے تناسب ہی سے حصہ دینا پڑے۔ تاکہ یہ ٹیکس اس کی کمائی اور حصول زر کے جذبہ میں رکاوٹ نہ بن جائے۔

نویں: اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ مثلاً اس اصول کو تسلیم کر لیا گیا ہے کہ انسان سرشت کے لحاظ سے ایک بیوی پر قانع ہونے والی مخلوق نہیں ہے اور میاں بیوی میں ناچاقی و نااتفاقی ہونا ممکن ہے۔ اور ایک اچھا خاوند بننے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ زندگی کی لذات سے کنارہ کش ہو جائے۔ فاقہ کشی اختیار کرے یا کسی عضو کو مسخ کر دے یا پھر ایسی ازدواجی زندگی سے انکار رہے جس میں محبت ناپید ہو چکی ہو۔ یا بھوک اور شہوانی خواہشات کو مستقلاً رد کرتا رہے۔ اسلام میں یہ ضروری نہیں کہ وارثِ ارضی بننے کے لیے انکساری ہی کے طریقے اختیار کیے جائیں یا آسمانی مملکت کے حصول کی خاطر بچہ کی طرح معصوم بننا لازمی ہو۔ آپ کے لیے یہ لازم نہیں کہ آپ کے جسم کا ہر عضو تو انتقام لینے کا متمنی ہو اور آپ اپنا دوسرا گال بھی طمانچہ کھانے کے لیے دشمن کے سامنے پیش کر دیں یا نامنصفانہ قوانین کی پابندی کرتے رہیں۔ اور فرعونوں کو موقع دیتے رہیں کہ وہ اپنے مظالم جاری رکھیں۔

دسویں اور آخری بات یہ ہے کہ اسلام دنیا میں وہ پہلا مذہب ہے جو حصول و ترویجِ علم کو خدا کی عبادت پر بھی ترجیح دیتا ہے۔ اس لیے اسلام کے نزدیک مذہب اور سائنس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ سائنس ترقی پذیر ہے۔ اس لیے اسلام بھی جملہ انسانوں کا مذہب ہے۔ ہر زمانے کے واسطے یکساں مفید اور موزوں ہے آنحضرت ﷺ کی نگاہوں میں جو شخص قدرت کو معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے یا کائنات کے پوشیدہ گوشوں میں جھانک کر نئی شے دریافت کرتا ہے۔ وہ صرف انسانیت ہی کی خدمت نہیں کرتا بلکہ خدا تعالیٰ کی عظمت و جبروت کے مشاہدات میں بھی اضافہ کرتا ہے۔ آپ کا فرمان ہے۔ ’’جو شخص علم کی جستجو میں گھر سے نکلتا ہے وہ خدا کے راستے پر سفر کرتا ہے۔‘‘ اور پھر یہ بھی مشہور حدیث ہے کہ ’’علم کی طلب ہر مسلم مرد اور عورت پر لازم ہے۔‘‘ یا یہ

فرمان کہ "ایک عالم کی روشنائی شہید کے خون سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔" اور آخر میں تو یہاں تک فرمادیا ہے کہ "علم حاصل کرو۔ اس سے تم میں غلط اور صحیح کا امتیاز پیدا ہوگا۔ وہ تمہارے لیے جنت کے راستے کو روشن کردے گا۔ صحرا میں تمہارا دوست ثابت ہوگا۔ تنہائی میں رفیق ہوگا۔ خلوت میں جلوت کا کام دے گا۔ خوشی میں تمہاری رہنمائی کرے گا۔ مصیبت میں دلاسا اور تسکین دے گا۔ دوستوں میں زیور اور دشمنوں کے مقابلے میں زرہ بکتر بن جائے گا۔"

اس لیے قرآن اسلامی دنیا میں نہ صرف ایک ادبی معجزہ بلکہ اخلاقی اور معاشرتی قوانین کا مجموعہ بھی متصور ہوتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کو تو اس کے متعلق صرف یہی دعویٰ ہے کہ وہ ایک الہامی کتاب ہے۔ لیکن دراصل اس کے ذریعہ خدا تعالیٰ نے انسانی زندگی کی کجلاتی ہوئی آگ میں اپنی روح پھونک دی ہے۔

دنیا کو آج تک جتنے بڑے بڑے مفکروں سے سابقہ پڑا ہے۔ ان میں صرف محمد ﷺ ہی وہ منفرد ہستی ہیں جو اس بات کا دعویٰ کرسکتے ہیں کہ انہوں نے نہ صرف یہ کہ نئے نظریات پیش کیے بلکہ خود انہیں عمل کی کسوٹی پر پرکھ کر بھی دیکھ لیا کہ وہ سب کندن ہی ہیں۔ بیچارے یسوع نے معافی اور درگزر اور وسیع النظری کے نہایت نفیس خیالات کا اظہار کیا۔ حتیٰ کہ تعذیب اور مصلوب ہونے پر بھی انہوں نے اپنے دشمنوں کو یہ کہہ کر معاف کردیا کہ "انہیں علم نہیں کہ وہ کیا کررہے ہیں" لیکن وہ کبھی اتنے خوش قسمت ثابت نہیں ہوئے کہ ان کے دشمن ان کے سامنے گھٹنے ٹیک دیں۔ زرتشت اور مہاتما بدھ کا بھی تقریباً یہی حشر ہوا جو مسیح کا ہوا تھا۔ اور ان کی موت تک کسی بڑے گروہ نے ان کی تعلیمات پر توجہ دینے یا ان کے مواعظ پر عمل پیرا ہونے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے برخلاف اسلام کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ حضورؐ کی زندگی ہی میں ایک ذرہ بے مقدار سے ترقی کرکے تکمیل کی حدود تک پہنچ گیا۔ محمد ﷺ دوسرے پیغمبروں کے مقابلے میں زندگی کے تمام مراتب طے کرتے ہوئے ایک یتیم بچے سے ملک کے فرمانروا اور خواب و خیال میں کھوئے رہنے والے الگ تھلگ انسان سے بے پناہ عمل کے پیکر بن

گئے۔ زندگی کے مختلف مراحل میں لوگوں نے آپ کو بیٹا' باپ' شوہر ہمسایہ' تاجر' مبلغ' مہاجر' رفیق' دوست' جنگجو' جنرل' فاتح' منصف' ناظم' مقنن' مدبر اور بالآخر ایک شہنشاہ کی حیثیت سے دیکھا ہے۔ ہمیں صرف اس حد تک ہی محدود نہیں رہنا چاہیے کہ آپ کی تعلیمات بہت اعلیٰ و ارفع اور آپ کے تخیلات بہت بلند اور دور رس تھے بلکہ دیکھنا دراصل یہ ہے کہ آپ ﷺ عملی زندگی میں ان پر کس حد تک پورے اترے۔ اور اسی سے آپ ﷺ کی عظمت کردار کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔

جن لوگوں نے کوہ صفا پر آپ ﷺ کی بیعت کر کے اسلام قبول کیا ان میں سے اکثر کے لیے آپ ﷺ کی حیرت انگیز فتوحات کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ عربوں کو خوب اچھی طرح اندازہ ہے کہ قسمت کے کھیل بڑے ناپائیدار اور تغیر پذیر ہوتے ہیں۔ جو شخص آج فاتح ہے وہ کل مفتوح بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے وہ ترازو کے پلڑوں کی اونچ نیچ کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ البتہ جو بات ان کو متاثر کر رہی ہے وہ اس ذات کا کردار ہے جو ایک معمولی حیثیت کا بدویانہ لباس پہنے ان کے سامنے نہایت سادگی سے بیٹھا ہوا ہے اور جس نے قول و فعل سے ثابت کر دیا ہے کہ اسے اس فتح پر ذرہ برابر بھی غرور نہیں۔ اور جو فتح اور شکست دونوں صورتوں میں اپنے خدا کے سامنے یکساں عجز و انکسار سے سر جھکاتا ہے۔

اہل مکہ اپنے محمد ﷺ کو اس وقت سے جانتے ہیں جب ان کا مقاطعہ کیا گیا تھا اور انہیں طرح طرح کی ایذائیں پہنچائی جاتی تھیں۔ مدینہ میں ان کی جو شان و شوکت تھی۔ اس کا حال انہوں نے صرف زبانی سنا تھا۔ اب جو وہ بہ نفس نفیس ان کے درمیان مقیم ہیں۔ ان کے سامنے وعظ کہتے' امور مملکت کا تصفیہ کرتے ہیں۔ روزمرہ ان سے ملتے ہیں۔ اور عمومی و نجی معاملات طے کرتے ہیں۔ تو ان کو اس بات کا موقع ملا ہے کہ آپ ﷺ کو بالکل قریب سے دیکھ کر معلوم کریں کہ یہ کس نوعیت کی ہستی ہے جس میں شہنشاہی اور پیغمبری دونوں مجتمع ہو گئی ہیں۔

نام و نمود اور شہرت سے گریز کرنے والے پیغمبر ﷺ کے سامنے جب لوگ

آپ کی مدح میں اشعار پڑھتے ہیں تو آپ ﷺ کو عجیب و غریب قسم کی بے چینی محسوس ہوتی ہے۔ معاملات کے اتنے کھرے ہیں کہ جب کوئی چیز خریدتے ہیں تو قیمت نقد ادا فرمادیتے ہیں۔ اور اگر ہاتھ میں پیسہ نہ ہو تو خریداری کرتے ہی نہیں۔ اگر قرض لینے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے تو جب تک وہ ادا نہ ہو جائے چین نہیں آتا۔ خاندانی شرافت یا دولت کا اظہار آپ ﷺ کی طبع نازک پر گراں گزرتا ہے۔ مزدلفہ ایک ایسا مقام ہے جس کو حج کے دوران قریش نے اپنے لیے مخصوص کرلیا تھا۔ اب آپ نے اجازت دے دی ہے کہ کوئی بھی وہاں جا کر قیام کرسکتا ہے۔ جو کوئی بھی وہاں پہلے پہنچ جاتا ہے اس کا حق مقدم ہوجاتا ہے۔ جہاں تک خود اپنی ذات کا تعلق ہے۔ آپ ﷺ کو نہ طاقت پر گھمنڈ ہے' نہ مرتبہ پر ناز۔ آپ آزاد اور غلام کی دعوتیں یکساں طور پر قبول فرمالیتے ہیں۔ ہر بیمار کی عیادت کو جاتے اور جہاں کہیں جنازہ اٹھتے دیکھتے ہیں اس میں فوراً شرکت فرماتے ہیں۔ لوگوں میں عام آدمی کی طرح گھومتے پھرتے ہیں۔ مصیبت زدوں کو تسکین و دلاسا دیتے۔ ضرورتمندوں کی امداد فرماتے اور جہاں مشوروں کی ضرورت ہوتی ہے وہاں مشورہ دیتے ہیں۔ آپ ﷺ کا طرز رہائش خوراک و لباس سب بہت سادہ ہے۔ خود بھی دعوتیں دیتے اور دوسروں کی دعوت میں بھی شرکت فرماتے ہیں۔ گھوڑے کے شہسوار اور اونٹ پر سواری کے شوقین ہیں۔ لیکن پیدل چلنے میں بھی کوئی باک نہیں۔ خواہ مخواہ متین و سنجیدہ بننے کی کوشش نہیں فرماتے' خوش طبعی کو پسند بھی فرماتے ہیں اور اس پر مسکراتے بھی ہیں۔ فرصت کے اوقات میں بچوں کے ساتھ تفریح بھی فرمالیتے ہیں۔ اور دوستوں کے ساتھ دوڑ میں بھی شریک ہوتے ہیں۔ پھولوں سے خوش ہوتے اور خوشبو کو پسند فرماتے ہیں۔ گو سادہ زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی خدا کی کسی نعمت کو اپنے اوپر حرام بھی نہیں کرتے۔ محبت کے بدلے محبت آپ کا شیوہ ہے۔ دوستی میں نہایت مخلص اور گرم جوشی۔ کامیاب شوہر اور بڑے مشفق و مہربان آقا ہیں۔ حکمرانی میں بے مثال اور رحم و کرم کے لحاظ سے بے عدیل ہیں۔ غرباءٔ مساکین پر آپ کی توجہ بالخصوص بہت زیادہ ہے مسیح کی طرح چھوٹے بچوں سے آپ کو بے انتہا محبت و اُنس ہے۔ ہر بات نہایت اطمینان

سے سنتے اور اس پر سیر حاصل گفتگو فرماتے ہیں۔ دوسروں کی خوبیوں کو پسند فرماتے ہیں۔ غلطی یا قصور کو فوراً تسلیم کر لیتے ہیں اور اگر کوئی صحیح اعتراض کرتا ہے' جو خواہ وہ خدا کی طرف سے ہو یا انسان کی جانب سے' اس کا بھی اعتراف فرما لیتے ہیں۔ اور ان سب سے بڑھ کر جو قابل قدر صفت آپ ﷺ کی ما بہ الامتیاز ہے وہ یہ کہ خود اپنی نظروں میں آپ محض ایک انسان ہیں۔

ساتواں باب

"انسان"

قبائل چاروں طرف سے مکہ کی جانب چلے آ رہے ہیں۔ کسی کا مقصد اطاعت قبول کرنا ہے' کسی کا حلیف بننا' اور کسی کا اسلام قبول کرنا۔ لیکن ایک طرف سے یہ بھی خبر موصول ہوتی ہے کہ ہوازن اور ثقیف کے دو قبیلے باہم شیر وشکر ہو گئے ہیں۔ اور پیغمبر ﷺ سے جنگ کرنے کے واسطے فوجیں اکٹھی کر رہے ہیں۔ ان کا منصوبہ یہ ہے کہ اک دم بے خبری میں مکہ پر حملہ کر دیں اور قبل اس کے کہ مسلمان تیار ہوں ان کو جالیں۔

اس کا بہترین جواب یہی ہو سکتا ہے کہ آپ خود ہی پہل کر دیں۔ چنانچہ آپ ﷺ بارہ ہزار کی جمعیت ہمراہ لے کر جن میں دس ہزار تو وہ ہیں جو مدینے سے آپ کے ساتھ آئے تھے اور دو ہزار مقامی طور پر بھرتی کیے گئے ہیں۔ مکہ سے بسرعت روانہ ہو جاتے ہیں۔ آج تک عرب میں کسی ایک سالار کے تحت اتنی فوج کبھی نہیں دیکھی گئی۔ یہ ایک ایسا عظیم الشان نظارہ ہے کہ آپ ﷺ کے ایک صحابی سے ضبط نہیں ہوتا اور وہ کہہ اٹھتے ہیں کہ "اتنی بہادر اور کثیر فوج کو' جو آج ہماری ہے' کوئی شکست نہیں دے سکتا۔" لیکن اس فخر وغرور پر حضور ﷺ انہیں فوراً ٹوکتے اور تنبیہہ فرماتے ہیں۔

حضور ﷺ وادی حنین میں جو مکہ سے ایک دن کی مسافت پر واقع ہے قیام فرماتے اور فوجوں کو ترتیب دیتے ہیں۔ اس کے دونوں جانب پہاڑ ہیں۔ جن کی چوٹیاں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ آگے اوطاس ہے جہاں اگلی صبح آپ ﷺ دشمن پر حملہ کرنے کا ارادہ فرما رہے ہیں۔ لیکن رات آپ کے منصوبہ میں مزاحم ہو جاتی ہے۔ ہوازن

کا سردار مالک شب کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر آدھی فوج سے گھاٹی کا ایک راستہ بند کردیتا اور بقیہ نصف کو دوسری جانب تعینات کردیتا ہے۔ اور جب صبح ہوتی ہے تو مسلمان یہ دیکھ کر حیرت زدہ ہو جاتے ہیں کہ وہ تو شکنجہ کے دو جبڑوں میں گھر گئے ہیں۔ اس صورت حال سے نومسلم خاص طور پر پریشان ہوکر اِدھر اُدھر بھاگتے اور پہاڑیوں میں پناہ لینے لگتے ہیں۔ باقی لڑتے تو ہیں لیکن نہایت بددلی اور سراسیمگی سے' حضورﷺ کو اس وقت اپنی عمر میں سب سے زیادہ خطرہ کا سامنا ہے اور بظاہر ایسا نظر آتا ہے۔ کہ آج کے دن گذشتہ بیس سال کے کیے دھرے پر پھر جائے گا۔

مسلمانوں کی فوج کو دو محاذوں پر لڑنا پڑ رہا ہے۔ جنگ طول کھینچ رہی ہے اور خطرناک صورت اختیار کرتی جاتی ہے۔ پلڑا کبھی ایک طرف جھکتا ہے۔ کبھی دوسری جانب' کبھی کفار کا غلبہ ہوتا ہے۔ کبھی مسلمان غالب آتے نظر آتے ہیں۔ آخر شام کے قریب اہل اسلام اپنی صفیں دوبارہ درست کرتے اور دشمنوں کو شکست دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ آنحضرتﷺ شکست خوردہ مالک کے تعاقب میں روانہ ہوتے ہیں اور طائف پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں ہوازن پناہ گیر ہیں۔ مسلمانوں کی فوجیں شہر کا محاصرہ کرلیتی ہیں۔ یہاں سخت لڑائی ہوتی ہے۔ لیکن بالآخر فتح ہو جاتی ہے اور طائف پر اہل اسلام کا قبضہ ہوجاتا ہے۔ اس جنگ میں بے شمار مال غنیمت بھی مسلمانوں کے ہاتھ آتا ہے جس میں چالیس ہزار بھیڑ بکریاں' چار ہزار اوقیہ چاندی' چوبیس ہزار اونٹوں کے علاوہ چھ ہزار قیدی بھی شامل ہیں۔ ہوازن بہت جلد اور بڑی نرم شرطوں پر صلح کرلیتے ہیں اور پھر اسلام لاکر مطالبہ کرتے ہیں کہ ان کے قیدی اور مویشی واپس کردیئے جائیں۔

آپ فرماتے ہیں۔ ''میرے سپاہی دونوں شرطوں پر ہرگز راضی نہ ہوں گے۔ ان میں سے صرف ایک منظور ہوسکتی ہے۔'' دس دن غور و خوض کرنے کے بعد ہوازن قیدیوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اور چھ ہزار مرد عورت اور بچے ان کو واپس کردیئے جاتے ہیں۔ اسلام قبول کرنے پر حضورﷺ مالک کو ذاتی طور پر سو اونٹ بطور انعام مرحمت فرماتے ہیں۔ اور اس کی ساری جائیداد دوبارہ اسی کے قبضہ میں دے دی جاتی ہے۔ قبیلہ

ہوازن کو یہ رعایت دی جاتی ہے کہ مال غنیمت کا پانچواں حصہ جو سلطنت کی ملکیت ہوتا ہے اور غریبوں پر صرف ہوتا ہے انہیں لوٹا دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد آپ ﷺ مالک کو گورنر مقرر کر کے نماز شکرانہ ادا کرنے مکہ معظمہ تشریف لے جاتے ہیں۔

اس غزوہ سے جو مال غنیمت حاصل ہوا تھا اس سلسلے میں ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔

تقسیم کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ اہل مدینہ کے سابق مسلمانوں کے مقابلے میں مکہ کے نومسلموں کو زیادہ مال مل گیا ہے۔ جس کے نتیجہ میں مدینہ کی افواج اور مکی سپاہ کے درمیان شکر رنجی پیدا ہوجاتی ہے۔ جب حضور ﷺ کو اس کا علم ہوتا ہے تو آپ فوراً سب کو جمع فرماتے اور اس طرح مخاطب کرتے ہیں۔ "یا انصار! مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ ﷺ لوگ مال غنیمت کی تقسیم سے مطمئن نہیں ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں جب آپ لوگوں میں پہنچا ہوں تو آپ کی حالت یہ تھی جیسے کوئی اندھیرے میں راستہ تلاش کررہا ہو۔ اللہ نے آپ کو سیدھی راہ دکھائی۔ آپ مصیبتوں میں مبتلا تھے۔ اس نے آپ کو راحت دی۔ آپ میں باہمی دشمنی اور عداوت تھی اس نے آپ کے دلوں کو محبت و خلوص سے بھر دیا۔ کیا ایسا نہیں ہوا؟"

انصار کے سردار سب کی طرف سے جواب دیتے ہیں۔ "یارسول اللہ! یہی واقعہ ہے" آپ ﷺ پھر فرماتے ہیں۔ "لیکن انصاری بھائیو! بات یہیں ختم نہیں ہوجاتی۔ آپ مجھے یہ بھی جواب دے سکتے ہیں اور جواب بھی بالکل صحیح کہ میں خود چل کر آپ کے پاس آیا تھا۔ جب خود میری قوم نے مجھے جھوٹا کہا تو آپ نے میری تعلیمات پر یقین کیا۔ جب میں بے یارو مددگار تھا تو آپ نے میری مدد کی۔ میں غریب الدیار تھا۔ آپ نے مجھے رہنے کے واسطے جگہ دی۔ میں پریشان تھا آپ نے مجھے دلاسا و تسکین دی۔ اب اے انصار؟ آپ لوگ دنیاوی سازو سامان کے پیچھے اپنے دماغوں کے سکون کو برباد کرنے کے کیوں درپے ہورہے ہیں۔ کیا یہ کافی نہیں کہ میں دوبارہ آپ کے ساتھ مدینہ واپس جارہا ہوں! میں اس مالک حقیقی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آپ کو کبھی نہیں

چھوڑوں گا۔ اگر ساری دنیا ایک طرف ہو اور آپ دوسری طرف تو میں آپ کا ساتھ دوں گا۔

مجمع کے دلوں پر اس خطاب کا بڑا اثر ہوتا ہے اور سب یک زبان بول اٹھتے ہیں۔

"یارسول اللہ! ہم اس پر مطمئن ہیں۔ کہ آپ ﷺ ہمارے ساتھ چلیں۔ اب ہم مال غنیمت کے بارے میں ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالیں گے۔"

ہجرت کا آٹھواں شاندار سال اس طرح ختم ہو جاتا ہے۔ جس میں بڑی نمایاں کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں۔ اس سنہ میں مکہ فتح ہوا۔ یونانیوں کی فوج کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ حنین اور اوطاس میں فتوحات حاصل ہوئیں۔ اور اسلام کی تکمیل ہوئی۔ حضور ﷺ کی خانگی زندگی میں بھی چند خوشگوار واقعات وقوع پزیر ہوئے۔ مصر کے بادشاہ مقوقس نے جس قبطی لڑکی ماریہ (مریم) کو آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اس کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا ہے جس کا نام آپ نے ابراہیمؑ رکھا ہے۔ اس موقع پر ہر طرف بہت خوشی کا اظہار کیا گیا۔ کیونکہ سب کو علم ہے کہ حضور ﷺ کو اولادِ نرینہ کی بڑی تمنا ہے۔ خدیجہؓ کے بعد آپ ﷺ نے کئی شادیاں کیں۔ جس کی وجہ یہ نہ تھی کہ آپ ﷺ کو مزید بیویوں کی ضرورت یا خواہش تھی۔ عائشہؓ اور حفصہؓ دونوں بڑی قبول صورت تھیں۔ بعض شادیاں تو سیاسی نقطہ سے کی گئی تھیں۔ مثلاً یہودیوں سے خوشگوار تعلقات قائم رکھنے کے لیے صفیہؓ سے نکاح' قریش کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے میمونہؓ سے مناکحت اور اسی طرح بنی مصطلق کی تالیفِ قلوب کے لیے جویریہؓ سے رشتہ عقد۔ اس کے علاوہ دوسری شادیاں آپ ﷺ نے بعض بڑے وفادار دوستوں کی بیواؤں سے فرمائیں۔ تاکہ انہیں زندگی میں اچھا سہارا مل سکے۔ ان میں ام حبیبہؓ سودہؓ اور حفصہؓ شامل ہیں۔ ماریہؓ سے آپ کی شادی کا تعلق نہ سیاست سے تھا نہ دلی جذبات سے بلکہ اس کی وجہ انسانی فطرت تھی جو ہمیشہ تمنا کرتی رہتی ہے کہ میرے ایک بیٹا ہو۔ جو بالکل میرا ہمشکل ہو اور اس سے میری نسل قائم رہے۔ اس معاملہ میں بڑے باجبروت بادشاہ اور چھترے گلے فقیر

سب یکساں ہیں۔ اس لیے ابراہیمؑ کی پیدائش سے آپ کو غالباً اتنی ہی خوشی ہوئی ہوگی۔ جتنی فتح مکہ یا بازنطینی افواج کی شکست سے ہوئی۔

﴿2﴾

دسویں سال کی ابتداء میں دُور دراز علاقوں مثلاً یمن' بحرین' شام اور ایران کے سرحدی علاقوں سے وفود مدینہ آنے شروع ہوگئے ہیں۔ بعض اسلام لانے کے خواہشمند ہیں اور بعض دوستانہ تعلقات قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس وقت اسلام کا مہر عالمتاب پورے آب و تاب سے چمک رہا ہے اور اسلامی افق پر کوئی تاریک ابر کسی طرف نظر نہیں آتا۔ رات کی ظلمت اور صبح کی دھند و کہر سب ختم ہو چکی ہے۔ بربریت' خون آشامی' مشرکانہ رسوم اور تواہمانہ عقائد کی جگہ روشن خیالی' علم' حکمت اور انسانیت کا دور شروع ہو چکا ہے۔ اس لیے مدینہ میں شمال' جنوب اور مشرق سے سفراء چلے آرہے ہیں۔ تاکہ اسلام اور اس کے پیغمبر ﷺ کو اپنا نذرانہ عقیدت پیش کریں۔

بعض ایسی دستاویزیں لے کر واپس جا رہے ہیں جن میں بہ حیثیت سلطنت اسلامی کا حلیف ہونے کے ان کے حقوق و فرائض کا اندراج ہوتا ہے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جن کے ساتھ چند صحابہ کو بہ حیثیت معلم دین بھیجا جا رہا ہے۔ لیکن بہت بڑی تعداد ان لوگوں کی ہوتی ہے جو اپنے سفر کا لباس تبدیل کرنے کے ساتھ ساتھ پرانے مذہب کو بھی بدل دیتے ہیں۔ اور جس کے لیے نئی پوشاک اور روح کے لیے نئے عقائد لے کر رخصت ہوتے ہیں۔

انہیں وفود میں بنو ثقیف کے سفیر بھی شامل ہیں جو پیغمبر ﷺ کو یہ اطلاع دیتے ہیں کہ وہ اس صورت میں اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہیں کہ انہیں نماز سے مستثنیٰ کر دیا جائے۔ اور ان کے دیوتا لات کو تین سال کی مہلت دی جائے کہ اس دوران میں وہ اپنی پرستش کراتا رہے۔

آہنی اصولوں کے پابند حضرت عمرؓ بھی اس گفتگو میں شامل ہیں اور اپنے غصے کو ضبط نہیں کر سکتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ حضور ﷺ کے جذبۂ ترحم و رعایت سے ناجائز

فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ اس لیے ان کے منہ سے نکل جاتا ہے کہ "تم سب جہنم رسید ہو جاؤ۔"

ثقیف کا نمائندہ بڑے خشک لہجہ میں جواب دیتا ہے۔ "ہم محمد ﷺ سے بات کر رہے ہیں نہ کہ تم سے۔"

حضور ﷺ فرماتے ہیں۔ "میں تمہاری بات نہیں سنتا۔ سوال ایک ہی ہے۔ اسلام قبول کرو یا لات کو مانو۔"

ثقیف ششدرہ جاتے ہیں اور کہتے ہیں۔ "اچھا لات کو صرف چھ ماہ کی ہی مہلت دے دیجئے۔"

"ہرگز نہیں۔"

"خیر جانے دیجئے' صرف ایک مہینے کی اجازت مرحمت فرما دیجئے۔"

"نہیں ایک ساعت کی بھی نہیں نہیں۔"

آخر میں یہ لوگ اس طرح واپس جاتے ہیں کہ مسلمان سپاہیوں کی ایک جماعت ان کے ہمراہ ہے جو وہاں پہنچ کر لات کو چورا چورا کر دیتے ہیں۔

ایک طرف اسلام کا پیام دُور دُور تک پھیل رہا ہے اور دوسری جانب حضور ﷺ نے حکم دے رکھا ہے کہ قرآن کی سورتیں مدون کی جائیں۔ اکثر لوگ ایسے ہیں جنہوں نے تمام کی تمام سورتوں کو اپنے اذہان میں محفوظ کر لیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ چاہے متن کے اوپر کوئی حادثہ بھی گذر جائے' قرآن کبھی ضائع نہ ہو سکے گا۔ ان دونوں باتوں کے نتیجے میں قرآن ایک ایسی مستحکم کتاب بن گئی ہے جو قیامت تک مِن وعَن برقرار رہے گی۔ اس کی ایک آیت تو کیا' ایک ایک لفظ' ایک ایک شوشہ تک اتنا محفوظ ہے کہ اس میں ترمیم و تنسیخ تحریف تک کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ دراصل حضور ﷺ نے ابتداء سے ہی یہ اہتمام کر لیا ہے کہ وحی کو فوراً لکھ لیا جائے۔ چنانچہ جو آیات بھی نازل ہوتی ہیں انہیں آپ ﷺ فوراً معرض تحریر میں لے آتے ہیں۔ شروع شروع میں یہ کام زیدؓ بن ثابت کے سپرد تھا۔ لیکن ان کی شہادت کے بعد مختلف لوگوں کو یہ فرض سونپا گیا۔ جن میں

حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ حضرت علیؓ عبداللہ بن سعدؓ زبیرؓ اور خالدؓ کو یہ سعادت نصیب ہوئی ان لوگوں کو بڑی سخت ہدایت تھی کہ وہ قرآنی الفاظ کے ساتھ آپ ﷺ کا کوئی ایک لفظ بھی تحریر نہ کریں تاکہ وحی اور حدیث خلط ملط نہ ہو جائے۔

اور اس طرح اسلامی قانون میں شریعت کی بنیاد پڑگئی۔ جو انسانی قوانین کے مقابلہ میں اس لحاظ سے وسیع تر ہے کہ اس میں انسانی زندگی سے متعلق جملہ امور کا احاطہ کرلیا گیا ہے۔ مثلاً خدا کے متعلق کیا فرائض عائد ہوتے ہیں۔ پڑوسیوں سے کس طرح کا سلوک کرنا ہے اور خود اپنی ذات کے بارے میں کیا رویہ اختیار کرنا ہے۔ اس طرح شریعت درحقیقت اخلاقی' مذہبی اور قانونی فرائض کا مجموعہ ہے۔ اس میں نہ صرف مسلمان کی نجی زندگی کا خیال رکھا گیا ہے۔ بلکہ وراثت' شادی' طلاق اور عام قوانین کی بھی ضروری دفعات شامل ہیں۔ اسلامی قانون کی اساس' جس میں عقیدہ' اور عمل دونوں شامل ہیں۔ خدائے تعالیٰ کے وہ فرمان ہیں جو وحی کے ذریعہ وقتاً فوقتاً نازل ہوتے رہے ہیں۔ اور قرآن مجید کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ دوسرے نمبر پر حدیث یعنی آنحضرت ﷺ کے اقوال اور زندگی میں آپ ﷺ کا طرز عمل ہے۔ جسے اسلامی فقہ میں سنت کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک اس کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک آپ کے تمام اقوال و افعال خدا تعالیٰ کی طرف سے الہام اور وجدان کے ماتحت ہوتے ہیں۔ اور ان کو ایک طور پر قرآن کی تشریح و تفسیر سمجھا جاتا ہے۔

جہاں آپ ﷺ موجود ہوتے ہیں وہاں نماز میں امامت خود ہی فرماتے ہیں۔ آپ ﷺ ہی منصف بھی ہیں اور اپیل کی آخری عدالت بھی' فوج کی کمان اور عوامی نظم و نسق بھی آپ ﷺ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اس لیے اسلامی قانون کی نشوونما اس طرح ہوتی ہے کہ آپ بہ نفس نفیس مدینہ میں مقدمات کا فیصلہ فرماتے ہیں۔ اوّل تو آپ ﷺ قرآن کے مطابق انصاف فرماتے ہیں۔ لیکن اگر کسی معاملہ میں صحیفہ مقدس خاموش ہو تو اپنی صوابدید کے بموجب فیصلہ صادر کرتے ہیں۔ آپ کے نائبین کو بھی' جنہیں عدالتی اور انتظامی فرائض سپرد کیے گئے ہیں یہی ہدایت ہے کہ سب سے پہلے قرآن مجید سے ہدایت

حاصل کریں۔ پھر اگر انہیں حضور ﷺ کے فیصلے کی کوئی نظیر اس تصفیہ طلب مقدمہ کے سلسلے میں مل جائے تو اس کے مطابق عمل کریں۔ لیکن اگر یہ بھی ممکن نہ ہو سکے تو آخر میں خود اپنی لیاقت اور ذہانت سے کام لے کر حتی الامکان دیانتداری سے فیصلہ کریں۔ اس صورت حال کو خود حضور ﷺ نے بالتصریح منظور فرمایا ہے۔ چنانچہ جب حضرت معاذؓ بن جبل کو یمن کا گورنر مقرر کر کے بھیجا جا رہا تھا تو آپ ﷺ نے ان سے دریافت فرمایا کہ وہ کس طرح لوگوں کے درمیان عدل قائم کریں گے۔

انہوں نے جواب میں عرض کیا۔ ''قرآن کے مطابق۔''

''لیکن اگر ایک خاص مقدمہ کے متعلق قرآن میں کوئی ہدایت نہ مل سکے' تب؟''

''تو پھر حضور ﷺ والا کی سنت پر عمل کروں گا۔''

لیکن اگر سنت میں بھی کوئی نظیر نہ مل سکے تو؟

''اس صورت میں خود اپنی سمجھ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔''

حضور ﷺ نے یہ سن کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور فرمایا۔ ''الحمدللہ' خدا تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کے نائب کو صحیح ہدایت عطا فرمائے۔''

یہ واقعہ خود قرآن کی تعلیمات سے کلی مطابقت رکھتا ہے۔ جس میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ جہاں فہم وفراست کو بہت سراہا گیا ہے۔ اور یہی فی الحقیقت اسلام کے نظامِ قانون کی بنیادی روح ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اسلامی قانون میں استثنا کا کوئی ذکر نہیں۔ اس کا اطلاق ہر مسلمان پر یکساں ہوتا ہے۔ خواہ وہ ادنیٰ حیثیت کا ہو یا کوئی اعلیٰ ترین شخصیت ہو۔

جیسے جیسے اسلامی مملکت کی حدود بڑھتی جا رہی ہیں' حضور ﷺ کے لیے تمام معاملات کا بہ نفس نفیس دیکھنا اور تصفیہ کرنا ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔ اس لیے بعض فرائض اپنے نامزد کردہ اصحاب کو سونپنا ناگزیر ہو گیا ہے۔ اس زمانہ میں بھی جب کہ اسلامی حکومت مدینہ کی چار دیواری تک محدود تھی۔ آپ ﷺ نے معرکہ بدر یا یہودیوں کے

خلاف جنگ خیبر کے موقع پر شہر کا نظم ونسق اپنے نائبوں کے سپرد فرمادیا تھا۔ اب کہ اسلامی سلطنت دور دراز تک پھیل گئی ہے۔ اور فاصلے وسیع ہوگئے ہیں۔ یہ دیکھنے میں آرہا ہے کہ دیوان یا گورنری کا عہدہ ارتقائی شکل اختیار کرتا جارہا ہے تاکہ سلطنت کے محاصل کی وصولی کا باقاعدہ نظام قائم ہوجائے۔ آمدنی کے ذرائع میں سب سے اہم زکوۃ یعنی بچت پر چالیسواں حصہ مقرر ہے۔ جو ہر مسلمان کو رفاہِ عامہ کے کاموں کے لیے حکومت کو لازماً ادا کرنا ہوتا ہے۔ دوسرے نمبر پر جزیہ یعنی محصول استثنا' تیسرے خراج یعنی غیر مسلموں پر زمین کا محصول اور چوتھے خمس یعنی مال غنیمت کا پانچواں حصہ ہے۔

وسعت سلطنت اس امر کا بھی موجب بن گئی ہے کہ اب تک جو فرائض حضور ﷺ خود ادا فرمایا کرتے تھے وہ دوسروں کے سپرد کیے جائیں۔ مثلاً جب مسجدیں زیادہ ہوگئیں اور آپ ﷺ کا ہر جگہ امامت فرمانا ناممکن ہوگیا تو مساجد کے واسطے امام مقرر کردیئے گئے۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ایک شخص کو جو قرآن کا زیادہ عالم ہے۔ دوسروں کے مقابلے میں سبقت حاصل نہ ہو۔

امام کا کام صرف نماز پڑھا دینا ہی نہیں بلکہ اس کے فرائض میں خطبہ دینا بھی شامل ہے۔ جس کو احادیث کی رو سے عام فہم ہونا چاہیے۔ پھر اتنا طویل بھی نہیں ہونا چاہیے کہ لوگ سنتے سنتے تھک جائیں۔

عدالتوں کا انتظام ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں دیا گیا ہے۔ جنہوں نے قانون شرع کا وسیع مطالعہ کیا ہے۔ اور جن کی قوت فیصلہ اور دیانتداری پر مکمل اعتماد کیا جاسکے' ان کو قاضی کہا گیا ہے۔ اور ان کے فرائض میں یتیموں کی املاک پر نگرانی' اوقاف کا انتظام اور وصیت ناموں پر عملدرآمد بھی شامل ہے۔ ان کو اس بات کا بھی حق حاصل ہے کہ ارتداد کے جرائم' مذہبی فرائض سے تجاہل' محاصل کی عدم ادائیگی' سرقہ' زنا' ڈکیتی اور قتل کے مقدمات کا بھی فیصلہ کریں۔ وہ مقررہ حدود شرعی بھی جاری کرسکتے ہیں۔ اور جرم کی نوعیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے عادلانہ طور پر دوسری سزائیں بھی دے سکتے ہیں۔

﴿3﴾

آپ کی عمر کے ساتھ ساتھ جانشینی کا سوال بھی بڑی اہمیت کا حامل بنتا جارہا ہے۔ پیغمبر ﷺ نے اسلامی سلطنت اپنے یا اپنے خاندان کے لیے نہیں بنائی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ دنیوی مملکت تو تاریخ کا ایک اتفاقی واقعہ ہے۔ آپ ﷺ کی زندگی میں تو نبوت اور سلطنت ایک فرد واحد یعنی خود حضور ﷺ کی ذات میں مجتمع ہوگئی ہیں۔ آپ ﷺ کے وصال پر ایک خلیفہ یا جانشین کا تقرر لازمی ہو جائے گا جو امیر المؤمنین یعنی مسلمانوں کا سربراہ ہوگا۔ لیکن یہ بات واضح نہیں کہ اس کو کون مقرر کرے گا۔ اللہ تعالیٰ خود یا نبی ﷺ یا امت۔ عام خیال یہ ہے کہ گو اسے وہی اختیارات حاصل ہوں گے جو اس وقت حضور ﷺ کو ہے۔ لیکن اس کا انتخاب ملت خود کرے گی۔ یہ بھی تقریباً طے شدہ مسئلہ ہے کہ وہ قبیلہ قریش ہی کا ایک فرد ہوگا۔ جس سے خود حضور ﷺ کا تعلق ہے۔

عرب میں تو اس وقت ہر جگہ امن و امان ہے۔ زیادہ تر قبائل مسلمان ہوگئے ہیں یا انہوں نے اہل اسلام سے اتحاد کرلیا ہے۔ لیکن دوسرے اُفق پر ایک بہت بڑا اور اہم خطرہ منڈھلا رہا ہے۔ ہرقل ایرانیوں کو شکست دے کر فتح کے نشہ میں مخمور واپس آ گیا ہے۔ اور عرب کو فتح کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ جس طرح آگسٹس کے زمانہ میں اہل روما نے دیکھے تھے۔ اور بازنطینی سلطنت کے باجگذار عفریتوں کی طرح شام کی سرحد پر اپنی فوجیں جمع کررہے ہیں۔

ان زبردست تیاریوں کی اطلاع حضور ﷺ تک پہنچتی ہے۔ آپ ﷺ امن و سکون کے کتنے ہی متمنی کیوں نہ ہوں۔ لیکن جب خطرہ دروازے پر موجود ہو تو اس سے آنکھیں بند کرلینا عقلمندی کا شیوہ نہیں کہا جاسکتا۔ عظیم خطرہ کے لیے عظیم تیاریاں اور کوششیں لازم ہوتی ہیں۔ اور اس کے لیے صرف سربراہ مملکت یا اس کے اعیان ہی نہیں بلکہ تمام مسلمانوں کے متحد طور پر آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔ یہ بات تو مسلم ہے کہ عرب قبائل کے خلاف جو طریق جنگ اختیار کیا گیا تھا وہ تربیت یافتہ افواج کے مقابلہ میں کچھ کام نہ دے گا۔ وہاں پھرتی اور چابکدستی سے زیادہ فوج کی گنتی اور سامان حرب

کی افزونی فیصلہ کن عناصر ثابت ہوں گے' جنگ وسیع پیمانہ پر ہوگی۔ اس لیے آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ نے کوشش کرنی شروع کردی ہے۔ کہ زیادہ سے زیادہ فوج میدان میں اتاری جائے۔ تاکہ یونانیوں کے لشکر جرار کا پامردی سے مقابلہ کیا جاسکے۔

رجب کے مہینے میں فوجیں جمع ہونی شروع ہوئی ہیں۔ موسم گرما کا وسط ہے جب کہ عرب کی زمین تمازت آفتاب سے جھلسنے لگتی ہے۔ فوجی نقل و حرکت کے لیے زیادہ خراب ہے۔ بہت سے لوگ مذبذب ہیں اور بہت سے گھر بیٹھ رہے ہیں۔ جو لوگ گرمی کی شکایت کرتے' ان کو حضور ﷺ کا جواب یہ ہوتا ہے کہ "دوزخ کی گرمی اس سے کہیں زیادہ شدید ہے۔" لیکن بہ حیثیت مجموعی آپ کی دعوت پر بہت کافی لوگ جمع ہوگئے ہیں۔ اور جہاں تک روپیہ پیسہ کا تعلق ہے۔ اکثر لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنا سب کچھ لاکر حضور ﷺ کے قدموں میں ڈھیر کردیا ہے۔ کچھ اصحاب کا خیال ہے کہ آپ ﷺ کو اس جنگ میں بڑی شاندار کامیابی اور سرخروئی حاصل ہوگی اور ان کے حوصلے بہت بلند ہیں۔

جب تیاریاں مکمل ہو جاتی ہیں تو حضور ﷺ مدینہ کی گورنری حضرت علیؓ کو سُپرد فرماتے اور بیس ہزار پیادہ اور چھ ہزار سواروں کی معیت میں سرحد شام کی طرف کوچ کرتے ہیں۔ تمازت آفتاب سے جھلستے ہوئے' گرم ریت میں بھنتے ہوئے' پیاس سے تشنہ لب۔ سینکڑوں مسلمان راستے ہی میں ختم ہوجاتے ہیں۔ لیکن ان کے سپہ سالار اعظم کی یہ مثال کہ وہ بغیر کسی شکوہ و شکایت کے ان تمام مصائب کو جھیلتا' سختیوں کو برداشت کرتا آگے بڑھتا چلا جارہا ہے۔ ان کے واسطے شمع راہ بنی ہوئی ہے۔ اور ان کی ہمتوں کو دوبالا اور عزائم کو راسخ کررہی ہے۔ مدینہ اور دمشق کے درمیان تبوک ایک ایسا مقام ہے جہاں کھجوروں کے سرسبز درخت اور ٹھنڈے پانی کے چشمے ہیں۔ یہاں اسلامی فوج ستانے کے واسطے ٹھہر جاتی ہے۔ اس جگہ پہنچ کر آپ ﷺ کو علم ہوتا ہے کہ یونانی فوج آپ ﷺ سے نبرد آزمائی پر تیار نہیں۔ کم از کم فی الوقت تو ان کا عرب پر حملہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ حضور ﷺ کے پاس اتنی فوجیں ہیں کہ اگر چاہیں تو دمشق یا شام کے

ایک حصہ کو فتح کر کے اسلامی مملکت میں شامل کر سکتے ہیں۔ لیکن آپ قیصرانہ یا سکندرانہ قسم کی فتوحات کے خواہاں نہیں ہیں۔ پہلے کے مقابلے میں آپ ﷺ کچھ ضعیف اور معمر بھی ہو گئے ہیں۔ خیبر میں جو زہر آپ ﷺ کو دیا گیا تھا۔ اس نے آپ ﷺ کے خون میں فساد پیدا کر دیا ہے۔ زندگی میں آپ کا کام بظاہر ختم ہو چکا ہے۔ آپ ﷺ نے جس کام کا بیڑا اٹھایا تھا وہ تکمیل تک پہنچ چکا ہے۔ تمام عمر جنگ کرتے گزر گئی۔ اب آپ کو آرام دہ سکون کی ضرورت ہے۔ اس لیے حضور ﷺ کو یہ معلوم کر کے' کہ دشمن مقابلے پر نہیں آ رہا اور جلد واپسی میں کوئی امر مانع نہیں' بڑا سکون حاصل ہوتا ہے۔

لیکن مدینہ لوٹنے سے قبل آپ سرحدی علاقوں پر آباد قبائل کا حلف اطاعت قبول کرنے کے واسطے رک جاتے ہیں۔ انہیں میں شام کا ایک عیسائی شہزادہ بھی شامل ہے۔ یہ وہ شخص ہے کہ جب اس نے حضور ﷺ کے تبوک پہنچنے کی خبر سنی تو قلعہ بند ہو گیا۔ اور مسلمانوں کو دعوت مبارزت دی کہ آئیں اور اس پر حملہ کر کے دیکھ لیں۔ حضور ﷺ نے خالدؓ کو چار ہزار جانبازوں کے ساتھ بھیج کر اس کے چیلنج کو منظور فرمالیا۔ شہزادہ کو جلد ہی اپنی غلطی کا علم ہو گیا۔ کیونکہ اسلام کے اس بہادر جنرل نے اُسے چاروں طرف سے گھیر کر تمام راستے بند کر دیئے اور اسے عاجز ہو کر قلعہ مسلمانوں کے حوالہ کردینا پڑا۔ چنانچہ خالدؓ بے شمار مال غنیمت لے کر' جس میں ایک ہزار اونٹ' آٹھ سو گھوڑے اور چار ہزار قیدی تھے' تبوک واپس آ گئے۔ لیکن باوجود اپنی گستاخی اور مخالفت کے جب وہ حضور ﷺ سے معافی کا خواستگار ہوا تو آپ نے حسب معمول اس کو بھی ازراہ کرم نہ صرف معاف فرمادیا بلکہ اس کا قلعہ بھی دوبارہ اس کے حوالہ کر دیا گیا۔ البتہ صرف اتنی شرط عائد کی گئی کہ آئندہ سرکشی نہ کرے گا اور خراج باقاعدہ ادا کرتا رہے گا۔

﴿4﴾

مدینہ واپس آنے کے بعد سورۃ البراۃ کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس کا کچھ حصہ تبوک سے پہلے 9 ہجری میں نازل ہو چکا تھا۔ اب پوری سورۃ کا اعلان کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اسلام کی تاریخ میں وہ ایک اہم ترین سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ [illegible] نے

مسلمانوں اور ان لوگوں کے درمیان جنہوں نے بار بار معاہدوں کی خلاف ورزی اور مواعید سے روگردانی کی ہے۔ ایک حد فاصل قائم کردی ہے۔ اور قرآن کی صرف یہی منفرد سورۃ ہے جو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع نہیں ہوتی۔

پہلی ہی آیۃ میں سورۃ کا مضمون واضح ہو جاتا ہے۔ "اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان برأت ہے۔ ان مشرکوں کو جن سے تم نے معاہدے کیے ہیں۔" آپ کو یاد ہوگا کہ صلح اور اتحاد کے باہمی معاہدوں کی کس طرح بار بار دھجیاں اڑائی گئی ہیں۔ قرآن نے اب تک یہی ہدایت دی ہے کہ اگر غیر مسلم پے در پے عہد شکنی کرکے معافی مانگ لیں۔ تب بھی ان سے آشتی کا ہی برتاؤ کرو۔ لیکن کیا یہ نرمی اور درگذر ہمیشہ قائم رہ سکتا ہے۔ البرائت اب اس معاملہ میں اہل اسلام کو بالکل صاف اور واضح طور پر ہدایت دیتی ہے کہ "حرمت کے چار مہینے انتظار کرو، اور پھر اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان ہے کہ اس کے بعد مشرکین کے واسطے کوئی رعایت نہ ہوگی (کہہ دیجیے) اگر تم توبہ کرلو تو تمہارے ہی لیے بہتر ہوگا۔ اور جو منہ پھیرتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ تم اللہ کو مجبور کرنے والے نہیں ہو۔ اور کفار کو سخت عذاب کی خبر دو۔ پس جب حرمت کے مہینے گذر جائیں تو مشرکین کو جہاں پاؤ قتل کردو، انہیں پکڑلو، ان کی بستیوں کو گھیر لو اور ہر گھات میں ان کی خبر لینے کے لیے بیٹھ جاؤ۔ ان مشرکوں کے لیے اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک کوئی عہد آخر کس طرح ہوسکتا ہے۔ جب کہ ان کا یہ حال ہے کہ اگر تم پر قابو پاجائیں تو نہ کسی قرابت کا پاس کریں۔ نہ کسی معاہدہ کی ذمہ داری کا۔ وہ اپنی باتوں سے آپ کو راضی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر ان کے دل انکار کرتے ہیں تو ان کفر کے علمبرداروں سے جنگ کرو۔ اللہ تمہارے ہاتھوں سے ان کو سزا دلوائے گا اور انہیں ذلیل و خوار کرے گا اور تمہیں ان کے مقابلے میں فتح نصیب کرے گا۔"

اس سورت میں یہ بات بالکل واضح کردی گئی ہے کہ مشرکوں سے جنگ صرف اس صورت میں لازم ہوگی جب انہوں نے معاہدوں کی پابندی سے گریز کیا ہو یا ان کی خلاف ورزی کی ہو، اسی میں غیر مسلموں کی عبادت گاہوں میں داخل ہونے کی بھی

ممانعت کردی گئی ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام کے خلاف یہود و انصاریٰ کی تمام کوششیں رائیگاں جائیں گی۔ اسی میں ان کے راہبوں کی دنیا داری کا پردہ فاش کیا گیا ہے۔ جن لوگوں نے غزوہ تبوک میں شرکت سے کوتاہی برتی یا درمیان ہی سے لوگ آئے ان کو بھی تنبیہہ و سرزنش کی گئی ہے۔ جو لوگ خدا اور رسول کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن ہیں۔ ان کے لیے اجر عظیم کا ان الفاظ میں وعدہ کیا گیا ہے۔ ''ان کا رب انہیں اپنی رحمت اور خوشنودی کے ساتھ ایسی جنتوں کی بشارت دیتا ہے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ کی خوشنودی ان کو حاصل ہوگی۔'' سورۃ کے آخر میں امت مسلمہ کے ہر فرد کو حکم دیا گیا ہے کہ حق (سچائی) کے قائم کرنے میں پوری کوشش کرے جو فی الحقیقت اسلام کی تعلیمات کا لب لباب ہے۔

جب حضرت علیؓ اسلام کا یہ اعلان جنگ لے کر سرکش اور متمرد قبائل میں پہنچتے ہیں تو وہ لوگ اس کے جواب میں جو طرز عمل اختیار کرتے ہیں اس کا اندازہ ان کے اس جواب سے ہوتا ہے۔

''اے علیؓ اپنے بھائی (یعنی رسول اللہ ﷺ) کو سمجھا دو کہ ہم نے اپنے معاہدوں کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ اب تم اور ہم میں کوئی صلحنامہ نہیں ہے۔ اب تو ہم اپنے معاملات تیروں کی نوکوں اور تلواروں کی ڈھالوں سے طے کریں گے۔''

لیکن ان کی یہ اکڑفوں کچھ کام نہ آ سکی۔ کیونکہ حنین اور اوطاس کی جنگوں نے کفار کی کمر توڑ دی ہے اور ان کی طاقت ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکی ہے۔

............﴿5﴾............

آنحضرت ﷺ اب زندگی کی تریسٹھویں منزل طے فرما رہے ہیں۔ ہجری حساب سے 10ھ ختم ہو رہا ہے۔ آپ ﷺ کا خیال ہے کہ جس اعلیٰ مقصد کے واسطے آپ ﷺ کو معبوث کیا گیا تھا وہ پورا ہو چکا ہے۔ خدا تعالیٰ نے اپنے وعدوں کے مطابق یہ آپ ﷺ کو بھی کامیابی عطا فرمائی اور دین کو بھی آپ کے توسط سے سرفرازی حاصل

ہوئی آپ کی عمر اور جسمانی طاقت دونوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ حیات کی آخری منزل زیادہ دُور نہیں' آفتاب عالمتاب مغربی افق تک جا پہنچا ہے۔ اور غروب ہونے کا وقت نزدیک آرہا ہے۔ شفق پر شام کے رنگ پھوٹ رہے ہیں۔ ارغوانی' سنہری اور گلابی۔ جن سے آپ کی فتحیابی' عروج اور وسعت سلطنت کا اندازہ ہوتا ہے۔

آپ لوگوں کو ہر چہار جانب اسلام ہی کے متعلق بات چیت کرتے دیکھتے ہیں۔ بادشاہ ہوں یا فوجی' شاعر ہوں یا پیشہ ور' افراد ہوں یا قبائل' سب خدائے واحد کی حمد وثناء میں مصروف ہیں۔ اور علانیہ وہی وعدے کر رہے ہیں جو کسی وقت اہل یثرب نے پوشیدہ طور پر آپ سے کیے تھے۔ دنیا کے کسی پیغمبر کو اپنے زمانہ میں لوگوں کی اتنی جماعت یا اطاعت کبھی حاصل نہیں ہوئی تھی جتنی کہ آپ کو اب تک ہوگئی ہے۔ ابتدائی سالوں میں جو کچھ مصائب آپ کو جھیلنے پڑے۔ جن مخالفتوں کا آپ کو سامنا کرنا پڑا اور جن مایوسیوں اور ناکامیوں سے دو چار ہونا پڑا۔ ان کی تلافی ان دس برس کی کامیابیوں اور فتوحات نے بخوبی کردی ہے۔

لیکن جس زمانہ میں آپ ان امور پر خدا کا شکر ادا فرمارہے ہیں آپ کو ایک سخت صدمہ سے دو چار ہونا پڑتا ہے خورد سال ابراہیم یوم پیدائش ہی سے آپ کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور ہے۔ اس سے آپ کی نسل کا سلسلہ قائم رہے گا۔ یہ بچہ کسی گھر میں بھی ہوتا ہر دلعزیز ہی رہتا۔ صورت وشکل میں پیارا' کھلتا ہوا رنگ' گھونگر یالے بال' خوبصورت اور متناسب اعضاء' ہنس مکھ' جو کوئی دیکھتا ہے دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ ماریہؓ کے لیے تو وہ صرف لختِ جگر ہی نہیں' راحتِ جان بھی ہے۔ کیونکہ اس میں ان کو باپ کی شبیہ نظر آتی ہے جن سے انہیں بے انتہا الفت ہے۔ ابراہیمؑ تمام مسلمانوں کو بھی بے انتہا عزیز ہیں۔ جو اسے تحسینی نظروں سے دیکھا کرتے ہیں۔ اور عورتوں کو تو یہ خواب ہی نظر آتے رہتے ہیں کہ ہمیں بھی خدا ایسا ہی فرزند عطا کرے۔

لیکن موت اسے شفیق والدین اور محبت کرنے والے لوگوں سے چھین لیتی ہے ماریہ کا تو کچھیے کہ دل ہی ٹوٹ جاتا ہے۔ حضور ﷺ بھی اپنے غم کو ضبط نہیں کرسکتے آپ

اس کی میت کو اپنے ہاتھوں میں قبرستان لے جاتے۔ اور ایک سرسبز کھجور کے سایہ میں دفن فرمادیتے ہیں۔ اس تمام دوران آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری رہتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ "ان کے بہہ جانے سے آدمی کے دل کو سکون حاصل ہو جاتا ہے۔ زندوں کو تو اس سے طمانیت قلب حاصل ہو جاتی ہے۔ لیکن مُردوں کو اس سے نہ کوئی فائدہ پہنچتا ہے' نہ نقصان ہوتا ہے۔"

ابراہیم کے انتقال سے آپ کو اس زندگی میں اگر کوئی دلچسپی تھی بھی تو وہ باقی نہیں رہتی۔ آپ دیکھتے ہیں کہ میری صحت بڑی سرعت سے گرتی جارہی ہے۔ شام کے دھندلکے چھانے لگے ہیں۔ اور قبل اس کے کہ رات کی ابتداء ہو اور دائمی خواب کا زمانہ شروع ہو۔ آپ کی خواہش ہے کہ آخری مرتبہ حج کی سعادت سے بہرہ اندوز ہو جائیں۔ اور اس موقع پر ملت کو اپنا آخری پیام سنادیں۔ اس خبر نے تمام عرب میں ایک سنسنی پیدا کردی ہے۔ مکہ میں ایک عظیم الشان اجتماع ہورہا ہے۔ مؤرخین اس سال زائرین کعبہ کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار بیان کرتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ ذی الحجہ کی چوتھی تاریخ کو مکہ پہنچتے ہیں۔ اور مقررہ ارکان حج ادا فرماتے ہیں۔ حجاج میں سردار' فوجی' عالم' شاعر' معلم' تجار' نوربان' خانگی ملازم غرض ہر طبقہ اور پیشے کے لوگ شامل ہیں۔ کسی میں کوئی امتیاز نہیں۔ یہ تو ملک کے ہر حصہ سے آنے والی ایک ہی جماعت ہے۔ یہاں سب بھائی بھائی ہیں۔ اور سب کے دلوں میں محبت' خلوص اور اخوت کی وہ شمع فروزاں ہے جسے اسلام نے روشن کیا ہے۔

حج کے اختتام پر حضور ﷺ ایک ناقہ پر سوار ہوتے اور لوگوں کے سامنے خطبہ دیتے ہیں۔ یہ تاریخ اسلام کا ایک یادگار واقعہ ہے اور جو لوگ اس موقع پر موجود ہیں ان کے دلوں میں منیٰ کے اس روز کی یاد عرصہ تک تازہ رہے گی۔ ہر طرف بے پناہ اژدحام ہے۔ مرد' عورتیں' بچے' بوڑھے سب ہی جمع ہیں۔ اکثر کے چہرے دھوپ کی شدت سے گندمی ہوگئے ہیں۔ بہت سے قبول صورت اور تروتازہ نظر آرہے ہیں۔ ہر شخص کان لگائے' پوری توجہ سے ایک ایک لفظ سننے اور سمجھنے کی کوشش کررہا ہے۔ آنحضرت ﷺ

بہت صاف لہجہ میں آہستہ آہستہ خطبہ فرما رہے ہیں۔ جب آپ ایک جملہ ختم کر لیتے ہیں تو مجمع کے مختلف حصوں میں اُسے باآواز بلند دُہرایا جاتا ہے۔ اور اس طرح آپ کا ایک ایک لفظ ہر کان تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ ایک بڑا اہم پیغام ہے جو آپ اپنے سامعین تک پہنچانا چاہتے ہیں تاکہ لوگ اسے ہمیشہ یاد رکھیں اور آگے چل کر یہ مسلمانوں کے درمیان ایک ناقابل فراموش حدیث کی شکل اختیار کر لے۔ اس میں رواداری کی روح سمو دی گئی ہے۔ انسانوں کے درمیان انصاف اور معاملات کو صاف رکھنے کی ایسی تعلیم دی گئی ہے جس پر بآسانی عملدرآمد ہو سکتا ہے۔ اس کے ذریعہ مسلمانوں کے درمیان' خواہ وہ کسی خطۂ ارضی سے تعلق رکھتے ہوں۔ ایک عام اخوت قائم کر دی گئی ہے اور ایک ایسے معاشرتی نظام کو آخری شکل دی گئی ہے جو ناانصافی اور استحصال کے خطرات کا مطلقاً خاتمہ کر دیتا ہے اور جس کی مثال دنیا آج تک پیش نہیں کر سکی۔

آپ ﷺ فرماتے ہیں۔ ''لوگو! میری باتوں کو غور سے سنو۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ اب ہم پھر کبھی اکٹھے نہیں ہوں گے۔ لوگو! تمہارے خون' تمہارے مال اور تمہاری عزتیں ایک دوسرے کے اوپر ہمیشہ کے لیے حرام ہیں۔

خدا تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ہر شخص کو اس کی میراث کا حق حاصل ہے اور کوئی ایسی وصیت جس میں حقدار کو محروم رکھا گیا ہو' ناجائز ہوگی۔

لوگو! تمہیں اپنی بیویوں پر ایسا ہی حق حاصل ہے جیسا انہیں تم پر ہے۔ ان کے ذمہ واجب ہے کہ وہ تمہارے بستر پر کسی غیر کو نہ آنے دیں۔ لیکن اگر وہ ایسا کریں تو انہیں ایسی مار لگاؤ جو نمودار نہ ہو' اگر وہ پاکدامن اور تمہاری وفادار ہیں تو انہیں اچھا کھانا کھلاؤ اور عمدہ پوشاک پہناؤ' وہ تمہارے ہاتھ میں خدا تعالیٰ کی ایک امانت ہیں۔

''اور اپنے غلاموں کو بھی وہی کھانا کھلاؤ جو خود کھاتے ہو اور اسی کپڑے کا لباس پہناؤ جس کا تم خود پہنتے ہو۔ اگر ان سے کوئی ایسا قصور سرزد ہو جسے تم معاف نہ کر سکو تو انہیں دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دو' کیونکہ وہ سب خدا ہی کے بندے ہیں۔ اور انہیں اذیت نہ دینی چاہیے۔''

''لوگو! سنو! جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے غور سے سنو اور یہ بات اپنے دلوں میں اچھی طرح سمجھ لو کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ تم سب برابر ہو سب کے برابر حقوق و فرائض ہیں۔ تم سب اسلامی اخوت کے فرد ہو اس لیے تمہارے بھائی کا مال تمہارے اوپر حرام ہے۔ بجز اس صورت کے وہ خود اپنی خوشی سے تم کو کچھ دے دے۔''

اس کے بعد آپ قدرے بلند آواز سے فرماتے ہیں۔ ''یا اللہ! میں نے تیرا پیام لوگوں تک پہنچادیا ہے۔'' تمام وادی میں ایک زبردست گونج کی لہر دوڑ جاتی ہے' ایک لاکھ سے زیادہ زبانیں جواب میں یہ فقرہ دہراتی ہیں۔ ''ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ نے اللہ کے احکام ہم تک پہنچادیئے ہیں۔''

اس کے بعد تمام حجاج پیغمبر صحرا محمد ﷺ کا یہ آخری پیام اپنے دلوں کی گہرائیوں میں لیے ہوئے اپنے اپنے علاقوں کو واپس چلے جاتے ہیں۔

............﴿6﴾............

صفر سن 11 ہجری کا مہینہ قریب الاختتام ہے۔ حضور ﷺ کو تکمیلِ اسلام کی اطلاع اس آیۂ مبارکہ میں مل چکی ہے۔ ''آج کے دن ہم نے تمہارے دن کی تکمیل کردی اور اپنی نعمت تم پر تمام کردی اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے تسلیم کرلیا ہے۔''

قیام مکہ کے دوران آپ کو وحی کے ذریعہ ہدایت کی گئی تھی۔

'' جب اللہ کی مدد آپہنچے اور آپ کو فتح حاصل ہو جائے اور آپ لوگوں کو جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہوتے دیکھیں تو اپنے رب کی حمد و ثناء فرمائیں۔ اور اس سے مغفرت طلب کریں بے شک وہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔''

حضور ﷺ علیل ہوگئے ہیں۔ اور آپ کو علم ہے کہ یہ مرض الموت ہی ہے آپ کی خواہش ہے کہ اس وقت تک زندہ رہیں کہ جو فوج اسامہ بن زیدؓ کی ماتحتی میں شام کو بھیجی جارہی ہے اس کا انجام معلوم ہو جائے۔ یونانیوں نے مسلمانوں کے سفیر کو قتل

کردیا ہے۔ اب نہ صرف اس کا قصاص لازمی ہوگیا ہے بلکہ دولت اسلامیہ کی جواہانت ہوئی ہے اس کا اقتضا بھی یہی ہے کہ ان کے خلاف سخت کارروائی کی جائے۔ چنانچہ اس مہم کا اہتمام کیا جارہا ہے۔

آنحضرت ﷺ کی علالت شروع تو حضرت زینبؓ کے مکان سے ہوئی تھی لیکن جب مرض نے شدت اختیار کرلی تو آپ حضرت عائشہؓ کے ہاں منتقل ہوگئے۔ جہاں بخار نے اور بھی زور پکڑلیا۔

حضرت عائشہؓ کے زانو پر سر رکھے ہوئے آپ فرماتے ہیں کہ یہ سب کچھ اس زہر کا اثر ہے جو خیبر کے مقام پر ایک عورت نے کھلادیا تھا۔

جب تک ممکن ہوسکا۔ آپ ﷺ مسجد میں جاکر باجماعت نمازیں ادافرماتے رہے ہیں۔ لیکن اب کہ آپ میں چلنے پھرنے کی سکت نہیں رہی۔ آپ حضرت ابوبکرؓ کو حکم دیتے ہیں۔ کہ جماعت میں امامت کے فرائض انجام دیں۔ آخری دن جب آپ مسجد میں تشریف لاتے ہیں تو نمازیوں کو بتاتے ہیں کہ بیماری کس حد کو پہنچ چکی ہے۔ اور لوگ غالباً آئندہ آپ کو نہ دیکھ سکیں گے۔ پھر آپ فرماتے ہیں کہا اگر کسی کی کوئی رقم میرے ذمہ واجب الادا ہو تو بتادے۔ ایک یہودی کہتا ہے کہ میرے تین درہم آپ کو دینے ہیں۔ اور آپ اسی وقت اس کی ادائیگی فرمادیتے ہیں۔

بیماری تیزی سے بڑھ رہی ہے' مدینہ کے ایک ایک فرد کو آپ کی طرف سے انتہائی تشویش لاحق ہے۔ حضرت فاطمہؓ آپ کے پاس بیٹھی زاروقطار رورہی ہیں۔ آپ ان کو نہایت شفقت ومحبت سے تسلی وتشفی دیتے' صبر کی تلقین فرماتے اور آنسو پونچھنے کو کہتے ہیں۔ وہ آنکھیں پونچھتی اور باپ کو خوش کرنے کے لیے مسکرانے کی کوشش کرتی ہیں۔ لیکن سکون قلب کے لیے جو الفاظ کہے جاتے ہیں۔ ان کا الٹا اثر ہوتا ہے۔ اور ان سے آپ کے رنج والم میں کچھ اضافہ ہی ہوجاتا ہے۔

آپ صحابہ سے بھی یکے بعد دیگرے ملاقات فرماتے اور اپنا حال بیان فرماتے ہیں۔ آپ کو علم ہے کہ زندگی کی لہریں آپ کو موت کے بحر ذخار کی طرف لے جارہی

ہیں۔ لیکن آپ کو اس کا کوئی خوف ہے نہ صدمہ۔ آپؐ اہل بیت سے اپنے جنازے کے متعلق تفصیلی گفتگو فرماتے رہتے ہیں۔

اکثر صحابہ جن کو آپ بہت عزیز رکھتے ہیں بستر کے گرد جمع ہیں۔ آپؐ جب انہیں بچوں کی طرح روتا اور سسکیاں لیتا دیکھتے ہیں' تو خود آپؐ کی آنکھیں بھی ان کی وجہ سے پرنم ہو جاتی ہیں۔ ایک صحابی دریافت فرماتے ہیں۔ "یارسول اللہؐ اگر ہماری بدقسمتی سے آپؐ واصل حق ہو جائیں تو آپؐ کی نماز جنازہ کون پڑھائیگا۔

"میں ابھی تمہیں یہی بتانے جارہا تھا۔ تم جب مجھے غسل دے کر نیا کفن پہنا دو اور میرے جسم کو اسی تختہ پر رکھو تو چند لمحوں کے واسطے انتظار کرنا جو شخص سب سے پہلے داخل ہو اسی کے ذمہ یہ فرض عاید ہوگا۔ لیکن تم یا میرے اہل بیت میں سے کوئی باآواز بلند نوحہ یا ماتم نہ کرے۔ ورنہ میری روح کو صدمہ ہوگا۔

آنحضرتﷺ اس طرح آخر وقت تک نبوت کے وہ فرائض انجام دیتے رہے ہیں' جو تئیس برس قبل خدا تعالی نے آپ کو تفویض فرمائے تھے۔ جس بے جگری اور تندہی سے آپؐ نے ان کو سرانجام دیا اسی بے خوفی سے آپؐ ملک الموت کے منتظر ہیں۔ ایک عام انسان موت کے ڈر سے جن کمزوریوں کا اظہار کرنے لگتا ہے۔ ان کا یہاں شائبہ تک نہیں۔ کردار کے ساتھ قوت ارادی کی مضبوطی' جو تمام عمر آپؐ کا طرہ امتیاز رہی ہے' اس وقت بھی اسی طرح جلوہ نما ہے۔ اور اس میں مطلق کسی طرح کی کمی واقع نہیں ہوئی۔ آخری وقت میں بھی آپؐ کا شمار کرۂ ارضی کی ان تمام ہستیوں میں ہوتا ہے جو دنیا کی تقدیریں بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ اور بنی نوع انسان کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔

حضورﷺ بستر پر لیٹے ہوئے ہیں۔ حضرت عائشہؓ تیمارداری میں مصروف ہیں۔ زندگی کے گذرے ہوئے لمحوں کی یادیں تصاویر کی شکل میں آنکھوں کے سامنے سے گذرتی چلی جارہی ہیں۔ پہلے آپؐ خود کو ایک یتیم بچے کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ جو اپنے دادا عبدالمطلب کی گود میں کھیل رہا ہے۔ پھر وہی بچہ اپنے چچا ابوطالب کے کاندھوں پر سوار ہے۔ جو اسے کعبہ کی طرف لیے جارہے ہیں۔ جہاں ان کو بتوں پر نذر چڑھاتے

ہیں۔ پھر وہاں ایک تاجر کی حیثیت سے دولتمند خاتون خدیجہؓ کے اونٹوں کی مہار پکڑے ریگستانی علاقوں میں سفر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ سماں نظروں کے سامنے پھر جاتا ہے جب ان سے آپؐ کی شادی ہوئی ہے۔ پھر آپؐ دیکھتے ہیں کہ بچے گھر میں اِدھر اُدھر دوڑتے پھرتے ہیں۔ اور آپؐ ان کے ساتھ کھیل میں مشغول ہیں۔ اب وہ وقت سامنے آتا ہے کہ آپؐ غور و فکر میں ڈوبے ہوئے یونانیوں کے عقائد' یہودیوں کے افتخار' عیسائی پادریوں کے تعصب کو ناقدانہ نظروں سے پرکھتے ہوئے' ویران مقامات پر گھومتے پھر رہے ہیں۔ پندرہ برس بڑی سرعت سے گذر جاتے ہیں۔اس کے بعد عرب کا اس زمانہ میں جو نقشہ تھا وہ بڑی بھیانک صورت میں سامنے آتا ہے۔ جس کے فوراً بعد پہلی وحی کے نزول کا منظر' آپؐ کا حیران و سراسیمہ گھر آنا' خاتون خدیجہؓ کا آپ کو تسکین و دلاسا دینا' صغیر سن حضرت علیؓ کا قبول اسلام' اور اس کے بعد حضرت عمرؓ کی نئے دین میں شمولیت' قریش میں اس جدید تحریک سے خوف و ہراس' ان کی پیش کش' تعذیب و مقاطعہ' پھر ترک وطن' یکے بعد دیگرے تمام منظر آنکھوں کے سامنے آتے اور دھندلا جاتے ہیں۔ پھر چھ آدمیوں کا مدینہ سے آ کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونا اور آپؐ کو دعوت دینا' ہجرت کے واقعات بدر کی جنگ' اس وقت مسلمانوں کی نازک حالت' اُحد میں تیر اندازوں کا اپنی جگہ سے ہٹ جانا' احزاب کی حیرت انگیز فتح' صلح حدیبیہ اور اس پر حضرت عمرؓ کے مشتعل جذبات' یہودیوں کی غداریاں اور بنو قریظہ کا قتل عام' حضرت حفصہؓ اور صفیہؓ سے شادی' پھر یکایک اسلام کا عروج' مختلف قبائل اور نامور ہستیوں کا قبول اسلام' مکہ کی فتح' اور اسلامی سلطنت کا کل جزیرہ نمائے عرب میں پھیل جانا' ہرقل اور مقوقش کو دعوت دین' ماریہؓ کا بطور سوغات آنا' اور ازواج مطہرات کے زمرہ میں داخل ہونا۔ ابراہیم کی پیدائش' اور آخر میں منیٰ کا میدان' جس میں آپؐ خطبہ دے رہے ہیں۔ اور لاکھوں مسلمان گوش برآواز ہیں۔ نظروں کے سامنے پھر جاتے ہیں۔

حجرے کے اندر تو حضور ﷺ کو اپنے آخری لمحات میں گذشتہ زندگی کے لیے واقعات دکھائی دے رہے ہیں۔ لیکن باہر جو مسلمان جمع ہیں۔ وہ بھی بہ حیثیت پیغمبر اسلام

آپؐ کے کارناموں کو یاد کر کے ان پر عش عش کر رہے ہیں۔ ان کو وہ وقت یاد آ رہا ہے جب وہ لوگ نہ معلوم کن کن بتوں کے سامنے سربسجود رہتے تھے۔ آپ ﷺ نے اس کے مقابلے میں ایک بہت بڑی مختصر اور سیدھی سی بات انہیں بتائی جس کو معمولی سوجھ بوجھ کا انسان بھی بخوبی سمجھ لے۔ اور جس پر دوسرے عقائد کے لوگ بھی باسانی متفق ہو سکیں۔ وہ یہ کہ ان سب خود ساختہ معبودوں کو ترک کر کے صرف خدائے واحد کی بندگی کرو' جو تمام کائنات کا خالق و مالک ہے۔ اور جو نیکیوں کا اجر اور برائیوں پر سزا دیتا ہے۔ پھر جو قرآن وحی کے ذریعہ آپ ﷺ تک اور آپ کے ذریعہ بنی نوع انسان تک پہنچا۔ وہ نہ صرف علمیت کے لحاظ سے یکتا ہے۔ بلکہ شیرینی و حلاوت' لہجہ و قرأت کے لحاظ سے بھی بے مثال ہے۔ اس کا اعلیٰ تخیل' بے نظیر تشبیہات و تصورات' فطرت سے ہم آہنگی' مثلاً حیوانوں کی پکار' گریز پا لہروں کی سرسراہٹ' رعد و برق کا طوفانی زور شور' اور ہوا کی گنگناہٹ کا امتزاج' اپنی یکتائی کا دعویدار ہے۔ جس اہانت اور بدگوئی کے مقابلے میں آپؐ عرصہ دراز تک صبر و سکون سے کام لیتے رہے' اس نے عوام کی نظروں میں آپؐ کی قدر و منزلت کو بہت بلند کر دیا ہے۔ اور اس سے آپؐ کی استقامت اور فرض منصبی پر پختہ عقیدہ کا مکمل طور پر اندازہ ہو جاتا ہے۔ جس تحمل و پامردی سے آپؐ نے اپنے مخالفین کا' جن میں قریش' یہودی نصرانی' حتیٰ کہ خود آپؐ کے اہل خاندان والے بھی شامل ہیں مقابلہ کیا۔ اس کے متعلق کسی اختلاف رائے کی جرأت ہی نہیں ہو سکتی۔ آپؐ کے خلاف جو طوفان اٹھائے گئے' جو جو باتیں کہی گئیں۔ اور جس خندہ پیشانی سے آپؐ ان کو برداشت کرتے ہوئے' اپنے راستے پر گامزن رہے اس کا حضور ﷺ کے دشمنوں تک کو اعتراف ہے۔ سینکڑوں رکاوٹیں' بیسیوں مزاحمتیں سدراہ ہوئیں۔ لیکن آپ ﷺ نے اپنی بے نظیر دماغی صلاحیتوں سے کام لے کر ان سب پر قابو حاصل کر لیا۔ تاریخ میں پہلی بار آپؐ نے اخوت اور بھائی چارہ کا ایک ایسا نظام قائم کر دیا جس کے باعث آباؤ اجداد سے چلی آنے والی مخاصمتیں اور دشمنیاں' اتفاق و اتحاد کے مقدس رشتوں میں تبدیل ہو گئیں۔ آپؐ اور آپؐ کی افواج صرف دو ہی متبادل اصولوں پر جنگ کرتی رہی ہیں۔ موت و

شہادت یا فتح و کامرانی۔ اس کے نتیجے میں جو سلطنت آپؐ نے قائم کی وہ محض دنیوی حکومت نہیں ہے بلکہ اس کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بھی چلتا ہے۔ اور یہ بات کہیں زیادہ اہم ہے۔ آپؐ مسلمانوں سے خواہ کسی قسم کی نوعیت کی قربانی کا مطالبہ فرماتے اور یہ نئے نئے مسلمان آپؐ کی آواز پر لبیک کہہ کر اپنا سب کچھ خدا اور رسول کی نذر کر دیتے ہیں۔ انسانی فطرت پر آپؐ کی نظر اتنی گہری پڑتی ہے کہ آپؐ اپنے دشمنوں میں سے ہر قسم کے جوہر قابل کو شناخت کر لیتے اور پھر انہیں گردیدہ بنا کر دائرہ اسلام میں لے آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چند ہی سال کے عرصہ میں مدینہ کی ایک چھوٹی سی شہری حکومت ایک وسیع اور طاقتور مملکت بن جاتی ہے۔ دور بین نظریں ان واقعات میں آئندہ کی وہ تصاویر دیکھ رہی ہیں۔ جب عرب سے چلنے والی تیز و تند ہوائیں بازنطینی اور ایرانی سلطنتوں کو پرکاہ کی طرح اڑا کر پھینک دیں گی۔ اور اسلام ان تمام علاقوں پر اپنا جھنڈا گاڑ دے گا۔ خالدؓ نے ابھی سے جلتے تپتے ریگستانوں کو عبور کر کے یونانیوں پر ایسی نمایاں فتح حاصل کی ہے کہ تاریخ کے صفحات اس کی معدودے چند ہی مثالیں پیش کر سکیں گے۔ ایسے جنرل بھی موجود ہیں۔ جن کی دلی خواہش ہے کہ اسلام کی فتوحات مصر، ایران اور سپین سے گذر کر کوہ پیرنیز اور دریائے سندھ کے کنارے تک پہنچ جائیں۔ آنحضرت ﷺ کو ان کے ہم قوم جادوگر بھی کہا کرتے تھے۔ لیکن دراصل آپؐ کا جگایا ہوا جادو مسلمانوں کا یہ جوش اور ولولہ ہے جس نے دنیا کو حیرانی میں مبتلا کر رکھا ہے۔

لیکن اب آپؐ کے سفر کی آخری منزل آ پہنچی ہے۔ آپؐ اس وقت بھی درد وکرب میں مبتلا ہیں۔ لیکن اس میں قدرے افاقہ نظر آتا ہے۔ آپؐ کا سر مبارک حضرت عائشہؓ کی گود میں ہے۔ آپؐ پر کچھ غفلت اور بے ہوشی سی طاری ہے۔ لیکن یکایک آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ اور آپؐ دروازے کی طرف غور سے دیکھتے ہیں۔ ملک الموت دہلیز پر کھڑے ہیں۔ کچھ تذبذب ہوتا ہے۔ لیکن آپؐ فوراً ہی انہیں اشارہ سے اندر بلا لیتے ہیں۔ حضور ﷺ اپنے رب سے واصل ہونے کے واسطے بالکل تیار ہیں اور آہستہ سے فرماتے ہیں۔ ''الحمدللہ''

سیرت ﷺ پر بہترین کتب

☆ سیرۃ النبی ﷺ	شبلی نعمانی
☆ سیرۃ النبی ﷺ	علامہ عبدالرحمن ابن خلدون
☆ محسن انسانیت ﷺ	نعیم صدیقی
☆ سید انسانیت ﷺ	نعیم صدیقی
☆ انسان کامل ﷺ	ڈاکٹر خالد علوی
☆ حیات محمد ﷺ	محمد حسین ہیکل
☆ حیات سرور کائنات ﷺ	مارٹن لنگس
☆ طب نبوی ﷺ اور جدید سائنس (۶ جلد)	ڈاکٹر خالد غزنوی
☆ سیرت قرآنیہ سیدنا رسول عربیؐ	پروفیسر محمد اجمل خان
☆ النبی الخاتم ﷺ	مولانا مناظر احسن گیلانی
☆ نبی اکرم ﷺ بطور ماہر نفسیات	سعیدہ سعدیہ غزنوی
☆ اسوہ حسنہ اور علم نفسیات	سعیدہ سعدیہ غزنوی
☆ سیرت النبی ﷺ کا انسائیکلو پیڈیا	محمد مسعود عبدہ
☆ گفتار رسول ﷺ	محمد سلیمان قاسمی
☆ رسول کریم ﷺ کی جنگی اسکیم	عبدالباری ایم اے
☆ معراج اور سائنس	آغا اشرف
☆ ناموس رسول ﷺ اور قانون توہین رسالت	محمد اسماعیل قریشی

ISBN 969-503-231-1
9 789695 032312

الفیصل
ناشران و تاجران کتب
اردو بازار لاہور